جلد ۲۵ اکتوبر ۴۵ء نمبر ۴

(۵)

اُرْدُو

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:۔ عبدُالحق

شائع کردہ

اُردو

۱ ۔ یہ انجمن ترقئ اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے ۔

۲ ۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے ۔ حجم آج کل تقریباً سوا سو صفحات، جب کہ قوانین کنٹرول کے سبب کاغذ نپا تلا ملتا ہے ۔

۳ ۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے ۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ۔

۴ ۔ مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقئ اردو (ہند)، ۱۰، دریا گنج ۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقئ اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے ۔

المشتہر

انجمن ترقئ اردو (ہند)، دہلی

نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنے پورا ایک صفحہ	۱۶ روپے	۶۰ روپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۹ روپے	۳۲ روپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۵ روپے	۱۸ روپے

اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے ۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے ۔ غیرمہذب اشتہارات شائع نہیں کیے جائیں گے ۔

المشتہر

انجمن ترقئ اردو (ہند)، دہلی

جلد ۲۵ اکتوبر سنہ ۴۵ء نمبر ۴

اُردُوْ

انجمنِ ترقّیِ اُردُوْ (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:- عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقّیِ اُردُوْ (ہند) دہلی

اُردو

جلد ۲۵ اکتوبر سنہ ۴۵ ۶ نمبر ۴

فہرستِ مضامین

سیّد اخلاق دہلوی نے جیّد پریس بلّی ماراں دہلی میں چھپواکر
دفتر انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

انشا کے کچھ نئے حالات اور غیر مطبوعہ کلام

(جناب عبدالباری صاحب آسی لکھنوی)

اوائل ۱۹۴۵ء میں اتفاق سے مجھے کلیات انشا کے بالاستیعاب دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس وقت کئی قلمی نسخے بھی جمع ہو گئے۔ جن کے دیکھنے سے پتا چلا کہ انشا کا بعض جزوِ کلام چھپنے سے باقی رہ گیا اور اس میں اس قسم کی ضروری چیزیں بھی ہیں جن کو ضرور چھپنا چاہیے تھا۔ بڑی کاوش اور محنت سے میں نے اُس کو جمع کیا اسی دوران میں مرزا فرحت بیگ صاحب کی ایک کتاب ''انشا'' بھی ایک کتب فروش کے یہاں دیکھی اور اس اشتیاق میں کہ انشا کے سوانح حیات کے متعلق اس میں جدید تحقیقات سے کچھ اضافہ کیا ہوگا فوراً قیمت دے کر خرید لی۔ مگر کیا کہوں کتنی مایوسی ہوئی اُس وقت جب یہ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے آزاد مرحوم کے بیان سے ایک قدم بھی باہر نہیں رکھا۔ اور پھر لطف یہ کہ تذکرۂ گلِ رعنا سے مدد لے کر ساتھ ہی ساتھ آزاد کے بیان پر اعتراضات بھی کرتے گئے ہیں۔ بہرحال اس کتاب کے دیکھنے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور پہنچ گیا کہ پہلے یہ ارادہ تھا کہ انشا کا غیر مطبوعہ کلام ہی ''اردو'' میں بھیج کر شائع کرا دیا جائے اور کچھ حالات نہ لکھے جائیں۔ اب اب یہ خیال ہوا کہ انشا کے بارے میں مولانا آزاد وغیرہ کی تحقیق کے ماورا جو اضافہ ہوا ہے اس کو بھی اسی میں شامل کر دیا جائے۔ اور یقین ہے کہ اس وقت تک یہ معلومات منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں اور شاید یہ پہلی نظر ہوگی جو ''آبِ حیات'' کے راستے سے علاحدہ جا رہی ہے۔

انشا کے دادا کسی تذکرہ نویس نے یہ نہیں لکھا کہ انشا کے بزرگ نجفِ اشرف یا کشمیر سے آئے تو کب آئے؟ انشا کے بزرگوں ہی کو لیا جائے تو خود ان کے والد پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر اب یہ ابہام باقی نہیں ہے۔ بلکہ معلوم ہو گیا کہ انشا کے دادا شاہ نور اللہ ہندستان ہی میں پیدا ہوئے جو جعفری النسب تھے۔ یہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے، اور حصولِ دنیا کے لیے سعی و کوشش کرنا اپنے آئین کے خلاف سمجھتے تھے پھر جب تذکرۂ مخزن الغرائب[1] کی روایت یہ ہے تو از روے درایت یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کے پردادا بھی کچھ نہ کچھ زمانے

[1] تذکرۂ مخزن الغرائب شیخ احمد علی، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے اور کتب خانۂ رام پور میں موجود ہے جس کا اقتباس دستور الفصاحت مرتبہ عرشی صاحب مہتمم کتب خانہ میں دیا گیا ہے۔

تک ہندستان میں رہے ہوں گے اور عجب نہیں ہو کہ اِن کے دادا کی ہندُستان ہی کے کسی خاندان میں شادی بھی ہوئی ہو۔

اِنشا کے والد اور ان کی خصوصیات

اِنشا کے والدِ بزرگ وار کا نام حکیم میر ماشاءاللہ خاں بتایا گیا ہو اور کہا گیا ہو کہ وہ شاعر تھے، مصدر ان کا تخلص تھا، دو ایک شعر بھی اُن کے نام سے تذکروں میں ملتے ہیں۔ مگر ان کے متعلق یہ بیان سراسر تشنہ اور ناکافی ہو۔ وہ بہت بڑے حاذق طبیبوں میں تھے۔ اور مخبر الدولہ ان کا خطاب تھا۔ علومِ متعارفہ میں اُن کو بہت کافی دست گاہ تھی۔ طالب علم، نہایت خوش مزاج تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر بااین ہمہ نہایت دلیر، عالی حوصلہ، بلند ہمت اور مردِ میدان تھے۔ اور اتنے معرکوں میں شریک ہوے تھے کہ اِن کے تمام بدن پر زخموں کے نشان تھے۔ جاں دہی اور جاں ستانی ان کی نظروں میں ایک کھیل تھی۔

سخی اور باذل ایسے تھے کہ 'تذکرۂ مخزن الغرائب' کا مصنف لکھتا ہو کہ حاتم کا نام اُن کے مقابلے پر نہیں لیا جاسکتا۔

عابد اور شب بیدار ایسے تھے کہ ہمیشہ زمین پر سوتے تھے اور بوریاے عبادت پر کروٹیں لیتے لیتے صبح کردیتے تھے۔ قناعت اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ مُرغ پلاؤ اور نانِ جویں کا اُن کی نگاہوں میں ایک درجہ تھا۔

وہ شاعر تھے اور شاعر بھی ایسے ویسے نہیں۔ ماہرِ فن اور کامل۔ سخن گوئی کے ساتھ سخن سنجی میں بھی یگانۂ آفاق تھے۔ بدیہہ گوئی کا بڑا ذوق تھا۔ میر حسن نے لکھا ہو «ہر کہ پیش ایشان کلام خود بہ خواند درجواب آں بدیہہ گوئی را آمادہ می شوند»۔

مولانا آزاد نے لکھا ہو کہ میر ماشاءاللہ خاں دربارِ شاہی میں طبیب تھے اور زمرۂ امرا میں داخل تھے۔ ہم کو اس روایت کے صحیح ماننے میں یوں تامل ہو کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہو کہ وہ سلطنتِ چغتائیہ کے ضعف کی وجہ سے مرشدآباد گئے۔ اس لیے کہ سلطنت کا حقیقی ضعف غلام قادر کی دست درازی اور بنگال کے تینوں صوبوں کے نکلنے اور صوبہ الہ آباد کے منیر الدولہ کو تفویض کرنے اور اُن کے انتقال کے بعد شجاع الدولہ کے الہ آباد پر قابض ہونے سے شروع ہوا اور یہ سب باتیں بعد میں واقع ہوئیں۔ آزاد نے تو یہی کہا

تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنی کسی خاص تحقیقات کی بنا پر ۹ رجمادی الاوّل ۱۱۶۹ھ سے ۱۰ رشوال ۱۱۷۰ھ تک درباریوں میں منسلک ہونے کی تاریخ بھی مقرر کردی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ مرشد آباد گئے۔ انشا وہیں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ صدرا تک عربی پڑھی اور پھر علمِ طب حاصل کیا۔ جس میں کامل مہارت بہم پہنچائی اور ماہر طبیب بن گئے۔ مگر اپنے پیشے کی طرف اُن کی توجہ نہ ہوئی بلکہ طبیعت کے جوش کا سیلاب شاعری کی طرف بہ نکلا اور اپنے والد کو کلام دکھلانے لگے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ میر سوز کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یہ اُستاد سے بگڑ بیٹھے یہ صحیح نہیں۔ اُن کو شاید میر حسن کے اس فقرے سے دھوکہ ہوا ہے جو انشا کے کلام کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ اُن کی شاعری میر سوز کے رنگ سے ملتی ہے اس کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح نساخ کا یہ فقرہ بھی قابلِ اعتبار نہیں کہ مشہور ہے کچھ روز دن میاں مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہوکے ہجو لکھی تھی۔ کیوں کہ اُنھوں نے صرف ایک سُنی سُنائی مشہور بات لکھ دی ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اس خیال کی سب سے زبردست تردید اس بات سے ہوتی ہے کہ انشا تقریباً ۱۶ برس کی عمر تک مرشد آباد میں رہے اور وہاں سے جب یہ اپنے والد کے ساتھ واپس ہوئے تو ان کا دیوان تیار ہو چکا تھا۔ پھر وہاں مصحفی اور میر سوز کا کہاں وجود تھا۔ دُوسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ کچھ بھی صحیح ہوتا تو مصحفی تو کم از کم اس کا کہیں اشارہ کرتے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر ہم لکھیں گے۔ سرِدست یہ کہ کر خاموش ہوتے ہیں کہ یہ صرف اپنے والد ہی کے شاگرد تھے اور کسی کو شاعری میں انھوں نے اپنا اُستاد اور مشیر نہیں بنایا۔

قصہ مختصر حکیم میر ماشاء اللہ خاں اپنی پوری شان و شوکت اور کافی امارت کے ساتھ مدتوں مرشد آباد میں رہے اور بہ قول صاحبِ مخزن الغرائب' نواب قاسم علی خاں کے زمانے میں ان کو مرشد آباد چھوڑنا پڑا جس کے بعد وہ نواب شجاع الدّولہ کے یہاں آکر ملازم ہوئے۔ اور انشا بھی اُن کے ساتھ تھے۔ جن کا حال مفصل لکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا کہنا ہے کہ حکیم صاحب موصوف نواب شجاع الدّولہ کی حین حیات تک فیض آباد میں دربار وزیر المالک شجاع الدّولہ میں منسلک رہے۔ اُس کے بعد نواب آصف الدّولہ کا زمانہ آیا جو ابتدا میں نہایت ہی خراب رہا اور حکیم صاحب نے اس اشراف گردی کو کبھی پسند نہ کیا یہاں تک کہ وہ ترکِ فیض آباد کرکے پہلے امیر الامرا ذوالفقار نجف خاں کے لشکر میں رہے اور پھر انھی کے ساتھ بندیل کھنڈ وغیرہ ہوتے ہوئے [illegible] اور یہاں مرزا محمد بیگ

ہمدانی کے ساتھ رہے اور سیکڑوں مردانہ اور دلیرانہ کام کیے۔ اور غالباً اُسی وقت شاہی دربار میں بہ حیثیت طبیب عزت و احترام کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ مگر دہلی میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی سلطنت چراغِ سحری کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نادر شاہ کی لوٹ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کو دلی والے ابھی بھولے نہیں تھے کہ شاہ عالم کی رہی سہی وقعت کو غلام قادر نے برباد کر دیا۔ اور دلی کا بادشاہ واقعی ایک تکیے دار بن کے رہ گیا۔ حکیم صاحب کا ایسا دم گھبرایا کہ انھوں نے پھر دہلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد چلے گئے۔ اِن کا تموّل مرشد آباد کی واپسی ہی پر رو بہ زوال ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی دہلی آئے تو اتنی سقیم حالت نہ تھی۔ مرشد آباد کی حالت کو دیکھتے ہوئے دلی میں فقیرانہ زندگی تھی اور دلی کے مقابلے میں فرخ آباد کے قیام کا زمانہ اور بھی قابلِ افسوس تھا، جہاں یہ نواب منظفر جنگ کی سرکار سے وابستہ تھے یہاں اُن کو شاید کوئی بڑی آمدنی نہ تھی۔ غرض کہ حکیم ماشاءاللہ خاں آخر وقت پھر مرشد آباد ہی میں رہے اور یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ اور بہ قولِ صاحبِ مخزن الغرائبؔ یہیں اُن کا مزار ہے۔

سید انشا کے حالات اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشا کی ولادت مرشد آباد میں ہوئی اور وہیں یہ سولہ برس کی عمر تک رہے۔ مگر ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر ان کی ظرافت ان کی ہزالی اور مسخرگی ہی پر لکھا گیا ہے باقی خیریت۔ مگر جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہم ان لوگوں کو شہادت میں پیش کرتے ہوئے اِن کے عادات و اخلاق وغیرہ پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

وہ نہایت حسین اور خوب صورت تھے۔ میر حسن نے "از خوبانِ جہاں و از خوش فکرانِ زماں" لکھ کر ان کی خوب صورتی کو خوش گوئی پر مقدم کیا ہے۔ خود انشا نے بھی مرزا مظہر جان جاں کی ملاقات کو جاتے ہوئے الفاظ میں اپنی تصویر کھینچی ہے جو ان کے حُسنِ خداداد کے مناسب حال ہے۔ لکھتے ہیں کہ "خط راتراش دادہ و جامۂ مل مل ڈھاکہ پوشیدہ دستارِ شربتی بطرز ملفوف بر سر گزاشتم۔ و دیگر لباس ہم ازیں قبیل۔ و از سلاح کٹار بسیار خوبے بہ کمر زدہ بودم" اس کے علاوہ کسی اور نے بھی اِن کا یہ شعر سُن کر کہ ؎

گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ میری طرف کو دیکھیے میں نازنیں سہی

کہا تھا کہ دریں چہ شک

رنگ گورا، قد درمیانہ۔ اکثر صافہ باندھتے تھے اور شملے کو گلے میں لپیٹ لیتے تھے۔ یہ وضع یہ بانک پن اور جوانی کا عالم۔ آخر کس کو اچھا نہ معلوم ہوتا ہوگا۔ میر علاء الدولہ نے اپنے "تذکرۃ الشعرا" (غیر مطبوعہ) میں لکھا ہو "جوان وجیہہ بہ دل نزدیک تراست۔ با مولّف تذکرہ نقیر اشرف علی خاں اشناست"۔

ظریف مزاج بھی ایسے کہ بہ قول شوقؔ رام پوری مصنّف و مولف "تذکرہ تکملۃ الشعرا" چار ابرو تک کا صفایا کراتے تھے اور آزاد فقیروں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ہنسوڑ اتنے کہ راہ چلتوں کو چھیڑتے اگر وہ کچھ کہتا تو یہ اور چھیڑتے اور اُسے غصّہ دِلا دِلا کر جی بھر کر گالیاں کھاتے۔ چناں چہ مخزن الغرائب شیخ احمد علی کی یہ عبارت اس کی گواہ ہو:

"بندہ نیازے در خدمتش دارم۔ اونیز شفقت بہ حالِ من از روز ملاقات تا امروز مبذول می دارد۔ در عالم آشنا پرستی بے نظیر زمانہ و در شعر ہندی موجدِ طرزِ تازہ دیگانہ است۔ آدمی کہ در صحبت او رود غم ہاے زمانہ فراموش می کند۔ نقل ہاے عجیب و قصّہ ہاے غریب یاد دارد و از پیشِ طبیعت خود نیز می تراشد۔ لطیفہ ہاے او اگر سمار کردہ آید کتابے جداگانہ مرتب می تواں کرد۔ در بزم خود را کم تر از یک طفل نامرد حساب مے کند۔ برائے ہر کس نوائے بر می آورد اگر گاہے بہ خاطرش می گزرد با آدم راہ رو بیگانہ صورتِ ظرافت سر می دہد دریں صورت اگر طرفِ ثانی سکوت کرد خیر و اگر شروع دشنام نمود می خندد و اورا برسرِ غضب می آرد۔ با آدم کم مرتبہ ایں معاملہ دارد۔"

جب یہ حالت ظرافت اور شگفتہ مزاجی کی تھی تو پھر کیا امید کی جاسکتی ہو کہ ایسا آدمی دلیر اور شجاع بھی ہو۔ مگر نہیں وہ بڑے زبردست شہ سوار تھے۔ تیر اندازی اور شمشیر زنی کے ماہر تھے۔ کبھی کسی سے دبتے نہ تھے۔ اور ہفت ہزاری سے بھی اپنے خلافِ مزاج بات نہیں سُن سکتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب مرزا قاسم علی خاں خلف نواب سالار جنگ سے کسی شعر پر بگڑ گئے اور حضورِ عالی کے سامنے ذلیل کرکے چھوڑا۔ ایک بار جو نگر میں اسمٰعیل بیگ محمد بیگ ہمدانی کے بھتیجے سے ایسے بگڑے کہ کٹار کھینچ کر اس پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ منھ میں آیا کہہ ڈالا۔ حالاں کہ اسمٰعیل بیگ وہ شخص تھا کہ اُس وقت کے بڑے بڑے نام ور دلاور اور مشہور لڑنے والے اس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ خدا نے خیر کی کہ اُس روز ان کی جان بچ گئی ورنہ معاملے نے اتنا طول کھینچا تھا کہ جان جانے میں کوئی کسر نہیں تھی۔

یہ سب کچھ تھا مگر ذرا کینہ پرور اور دل میں بات رکھنے والے اور ابن الوقت ضرور تھے۔ جو عداوت دل میں

بیٹھ جاتی وہ فطری اور خلقی ہو کر رہ جاتی تھی پھر ممکن نہ تھا کہ دل سے نکل جاتی۔ سید انشا نے اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں جب مرشد آباد کو الوداع کہا تو اُسی دربار میں یہ بھی آئے جہاں کہ وہ وارد ہوئے تھے۔ یعنی یہ بھی نواب شجاع الدولہ کے مصاحب ہوئے۔ اس وقت اِن کی عمر سولہ برس کی تھی۔ علومِ رسمیہ سے باخبر تھے اور آدابِ مصاحبت سے کما حقہٗ واقف تھے۔ اُس وقت اِن کا دیوان تمام ہو چکا تھا۔ چناں چہ تذکرہ مخزن الغرائب کی یہ عبارت اس کا ثبوت ہے۔ "چوں بہ شانزدہ سال رسید بہ حضور نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ داخلِ جلسا شد۔ دراں وقت دیوانِ ہندی بہ طورِ خود و بہ طرز نوے بے اسناد ردیف وار تمام نمودہ بود و پارہ از اشعارِ عربی و فارسی ہم بر اوراق ثبت داشت۔"

عام تذکرہ نویس اس بنا پر کہ اُن کے دیوان میں کئی زبانیں پائی جاتی ہیں، کہتے ہیں کہ وہ کئی زبانیں مثلاً عربی، افغانی، فارسی، اُردو، پنجابی، مارواڑی وغیرہ جانتے تھے۔ اور انھی زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ مگر میر ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں لکھا ہے کہ سعادت علی خاں کی مسند نشینیٔ وزارت کے وقت انشا نے چونتیس[۳۴] زبانوں میں قصیدہ کہا۔ جب شجاع الدولہ کا انتقال ہوا تو یہ اپنے والد کے ساتھ دہلی آئے۔ اور شاہ عالم کی مصاحبت میں بسر کرنے لگے۔ جب حکیم میر ماشاء اللہ خاں دربارِ دہلی کا رنگ بگڑتا دیکھ کر فرخ آباد چلے گئے تو غالباً سید انشا دہلی میں رہے اور صرف اپنے والد کی زیارت کے لیے دو چار مرتبہ فرخ آباد گئے۔

دہلی میں شعرا سے جو معرکے پیش آئے اور جو ہنگامے ہوئے اُن کا چوں کہ "آبِ حیات" وغیرہ میں ذکر آچکا ہے اس لیے ہم ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں یہ کہنا ہے کہ جب دلی کی حالت بالکل خراب ہوگئی اور وہاں کے اکابر و شرفا جا بہ جا منتشر ہو گئے تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہاں آکر شہزادہ سلیمان شکوہ کے ہاں ندیموں اور مصاحبوں میں ملازم ہو گئے۔ مگر چند روز اُن کے یہاں رہ کر بہ وجہ اپنی نازک مزاجی کے اُن سے بھی خفا ہو گئے اور پھر میاں الماس علی خاں کے مصاحب ہوئے۔ اس کے بعد سعادت علی خاں کی رفاقت میں آئے یہاں جو واقعات اور مناقشات مصحفی وغیرہ سے ہوئے اُن کا تھوڑے سے تغیر کے ساتھ تذکروں میں ذکر آچکا ہے۔ لیکن "تذکرۂ معرکۂ خوش زیبا" (غیر مطبوعہ) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ہنگامہ خود شاہ زادۂ سلیمان شکوہ کے اشارے سے اٹھا تھا۔ وہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ جب یہ ہنگامہ ہوا تو نواب موصوف شکار کے لیے

گئے ہوئے تھے اسی لیے مصحفی نے اپنے شاگردوں کو منتقمانہ کارروائی سے روک دیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہو کہ جب آصف الدولہ واپس لکھنو ہوئے اور ان کو اس ہنگامے کا علم ہوا تو انھوں نے انشا کو شہر بدر ہونے کا حکم دے دیا۔ چناں چہ حکیم مولوی عبدالحی صاحب نے اپنے "تذکرۂ گلِ رعنا" میں اس واقعے کو یوں لکھا ہو اور انھوں نے یہ قصہ "تذکرۂ خازن الشعرا" میرزا جان الہ آبادی سے اقتباس کیا ہو جس کی عبارت یہ ہو:- "ہنگامے کہ فی مابین میر (انشا) و میاں مصحفی مناقشہ واقع شدہ و نوبت ہجو یک دیگر کشید۔ وزیرالممالک میر (انشا) را رخصت انصراف داد و ایشان بہ حیدرآباد رفتند۔ از اثنائے راہ عریضہ بہ خدمت جدِ امجد (شاہ اجمل) ارسال نمودند و دراں یک بیت ہم بود ؎ یونھی بےشغل ہمارا کوئی دل رہتا ہو ؛ ایک قاتل اُسے ہر حال میں بل رہتا ہو حضرت بہ جوابش تحریر فرمودند ع خوش باش دلت چرا خراشد۔ انشاءاللہ خیر باشد۔ و چیزے از اعمال مجرب حسب طلبِ میر نیز ارسال فرمودند۔ بعد عرصۂ قلیلے نواب وزیر میر را بہ لکھنؤ طلب فرمود۔ میر بہ لکھنؤ رسید و خط شکرگزاری بہ حضرت جدِ مرحوم نوشت۔ ہنگام جمع ایں ترجمہ آں خط باوجود تلاش بسیار بہ دست نیامد۔" یہ روایت کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہو۔ مگر چوں کہ ایک حد تک انشا کے حالات میں اضافہ کرنے والی ہو اس لیے لکھ دی گئی۔

سعادت علی کے ساتھ انشا کی زندگی جن رنگ رلیوں میں گزری، اس کے لیے "آبِ حیات" کا دیکھنا ضروری ہو۔ ہم کو صرف یہ کہنا ہو کہ اپنے جوان بیٹے کے انتقال کے ملال اور سعادت علی خاں کی سخت گیریوں کی وجہ سے انشا آخر میں دیوانے ہوگئے تھے۔ یہی "آبِ حیات" کے مصنف کا خیال ہو مگر ہم کو اس کے اعادے کی ضرورت یوں ہوئی کہ مولفِ "گلِ رعنا" نے ان کی دیوانگی کے قصے کو آزاد کا بنایا ہوا افسانہ سمجھا ہو اور "حیاتِ دبیر" کے مولف مرزا اوج کا یہ فقرہ دیکھ کر کہ سید انشا نہ مجنوں ہوئے نہ مخبوط اُن کو پورا یقین ہوگیا ہو کہ وہ آخر عمر میں مجنوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہو آزاد کی تحقیق صحیح ثابت ہوتی ہو۔ اور اس کا ثبوت یہ ہو کہ احمد علی یکتا نے اپنی کتاب دستور الفصاحت میں انشا کے بیان میں لکھا ہو۔ "آخر آخر مجنوں شدہ چند سال گزشتہ بودند کہ بہماں مرض درگزشت۔"

انشا کی عمر کے متعلق مطبوعہ تذکروں میں کوئی ذکر نہیں آیا۔ مگر احمد علی یکتا نے اس کو بھی صاف کردیا ہو اور بتایا ہو کہ ان کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز تھی کہ دُنیائے فانی کے تمام خرخشوں سے نجات پاگئے۔ سالِ وفات

۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء تھا۔ بسنت سنگھ نشاط نے جو ان کی تاریخ وفات لکھی ہو وہ تعمیے کے طور پر ہی جس سے سنہ ہجری ۱۲۳۳ھ نکلتی ہی۔ بلوم ہارٹ اور صاحبِ طبقات الشعرا، کو دھوکا ہوا ہی کہ انھوں نے تاریخِ وفات ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء لکھ دی ہی۔

انشا کی عادت تھی کہ وہ ہر جگہ اپنی بات کو بالا رکھنا چاہتے تھے اور اپنے علم و کمال کے زعم میں کسی کو اپنا مدِمقابل نہ جانتے تھے۔ اور اس بات کا اُن کی بہت سی چیزوں سے پتا چلتا ہی۔ مگر مولفِ 'مخزن الغرائب' نے یہ لکھ کر مجھ کو سخت حیرت میں ڈال دیا ہی کہ وہ قتیل کو اپنے سے بہتر جانتے تھے اور اُن سے دبتے تھے۔ عاشقی نے 'نشترِ عشق' میں ایک واقعہ بھی قتیل کے ذیل میں ایسا ہی نقل کیا ہی۔ وہ لکھتے ہیں کہ " روزے سعادت یار خاں رنگیں ہنگامِ معاودت از لکھنؤ برائے دیدن راقم تشریف آورد، و عندالاذکار مرزائے موصوف (قتیل)، قسمیہ بیان مے فرمود کہ نوبتے انشاءاللہ خاں مرحوم کہ از یارانِ مرزائے موصوف بود و باخود ہا مزاج و خوش طبعی ہم می شد در دو سہ روز بہ خوض و تامّل بسیار دو سہ فقرۂ نثرِ بے نقط تلاش نمودہ رقعۂ بہ مرزا قتیل نوشت۔ صبح آں چوں باخود ہا ملاقات گردید آں مرحوم از راہِ اختلاط بامرزا گفت کہ دیدی چہ قسم رقعہ نوشتم و چہ فقرہ ہائے معنی یاب بے نقط بہم رسانیدم۔ حالا مقدور تو نیست کہ درجواب آں دم زنی و بہ پاسخ آں بر نگاری ایشاں فی الفور قلم برداشتند و تفسیرِ بے نقط سورہ ہائے قرانی کہ بہ آں مغفور از بر بود و می خواند در عرصۂ یک نیم پاس بہ نہایت روانی و سلاست بہتر از عبارت سواطع الالہام بہ ضبطِ تحریر در آوردند" یہ روایت کتنی ہی معتبر اور راوی کیسا ہی ثقہ سہی۔ مگر مجھے کسی طرح اوّل تو یہی یقین نہیں آتا کہ انشا کسی چیز میں قتیل سے کم تھے۔ اور قتیل کی عربی ایسی تھی کہ وہ سواطع الالہام سے بھی اچھی عبارت لکھ لیتے تھے اور انشا منھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ دوسرے دو واقعے ہیں جن میں انھوں نے قتیل کو وہ کھری کھری سُنائی ہیں جنھیں دیکھ کر یقین آجاتا ہی کہ قتیل کسی صورت میں انشا کے مدِمقابل نہ تھے۔ میرے پاس 'کلیاتِ انشا' کا ایک نسخہ ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا موجود ہی جو لکھنؤ میں لکھا گیا۔ اور اس حساب سے وہ انشا کے انتقال سے سات برس یا زائد از زائد پندرہ برس بعد کا ہی۔ اور اس کو جس شخص نے خریدا تھا اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت پہلے صفحے پر موجود ہی کہ " ایں کتاب بہ قیمت دہ رُپے خریدا شد چرا کہ ہنوز رائج نیست" اُسی دیوان کے دُوسرے ورق پر یہ واقعہ لکھا ہی جو انشا کے بیان پر مبنی ہی؛

یک روز بعد نماز بہ تلاوتِ کلام مجید مشغول بودم۔ دوراں روز مرزا قتیل ہم در خانۂ من مہمان بود چوں کہ تلاوت کردہ بودم لفظِ مَعَنَا (یعنی بہ فتح عین) خواندم مرزا قتیل لفظِ معنا شنیدہ گفت کہ مَعْنَا (یعنی بہ سکونِ عین) باشد خوب باشد کہ در قاعدۂ عربی معناست۔ فوراً کبت گفتم۔ کبت

کہے جو کہ قتیل صحیح ہے وہ کہ وہ کھتری ہے اور گدھے کی ہے دُم
کہے وہ جو خدا مَعَنا سو غلط نہ طریقِ رشاد کو تجیے گُم
مَعَ ہو جو مضاف تو عین کو جزم اجی کیوں کہ بھلا ہو کہو مجھے تُم
تو مثالیں غلط ہوں سب مَعَہٗ مَعَنَا مَعَ مَن مَعَنا مَعَکُمْ

اسی طرح ہائے ہوز اور حائے حُطی کا جھگڑا بھی دیکھیے اور خیال فرمائیے کہ زراسی بات پر مرزا قتیل کو کتنا عاجز کیا ہے۔ یہ ایک منظوم خط ہے جو ہم کو اُسی قلمی کلیات سے دست یاب ہوا جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ؎

امینا مشفقا بندہ نوازا   لِمَ حَرَّرْتَنِی قولا ثقیلا
وہ خط لکھا کہ بس پڑھتے ہی میرا   ہوا غصّے کے مارے رنگ نیلا
کہ یعنی چست اور چالاک ہے تو   نظر آیا ولیکن سخت ڈھیلا
تجھے کہتی تھی دُنیا قاف معنی   تو کیوں کر بن گیا مجنوں کا ٹیلا
وہ چھو منتر تھا تجھ کو یاد جس سے   بہت سے اژدہوں کو تو نے کیلا
مقابل وصل کے تھا ہجر مشہور   جھٹ اس کو علم کے چاکو سے چھیلا
بہت سی اور ڈھب کی پخت و پز کا   دیا تھا جھونک چولھے میں پتیلا ۷۸۹۸
بلا تحقیق لفظِ ہجر میں کل   لیا کیوں حائے حُطی کا وسیلا
جواب اس شبہے کا تو مجھ سے سُن لے   نہ کالا بن نہ نیلا ہو نہ پیلا
وہ مجراؔ ہے جو مجورا کے ہم راہ   سو ہے حُطی ہی ہاں مرزا قتیلا

ولے جو انّ قومی کے ہی آخر وہ مجبوراً ہی ہوز سے حیلا
نہ چٹکی دل میں لے واصبر علیٰ ما یقولون آیہ ہی تیرا دلیلا
زرا تو سورۂ مزمل میں تو دیکھ ہی بالفتح وہاں ھجراجمیلا
یہی تو فتح کا باعث ہوا ہی مجھے کیوں کر کرے گا تو ذلیلا
بھلا آتو سہی میں بھی پڑھوں گا یہی آیت وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلا
جواب اس کا جو کچھ خاطر میں گزرے تو بسم اللہ حاضر کر ابھی لا
پھر او شاخِ نبات آنکھوں سے دیکھ اٹھا دیوانِ حافظ تو ابھی لا
شب وصل است وطے شد نامۂ ہجر پڑھے گا یہاں ہر اک گل سے رنگیلا
سلامٌ هِيَ حتّٰی مطلع الفجر یہی مصراع ہی اس کا سجیلا
ہوالغالب ہی انشاءاللہ انشا ترا کیوں اشک سے دامن ہی گیلا

انشا کو ہمیشہ جدت طرازی کا ذوق رہا۔ یہی سبب ہی کہ ان کا دیوان آج ہم کو دوسرے شعرا کے دیوانوں سے بالکل علاحدہ نظر آتا ہی۔ پھر جس طرح وہ اپنی روش اور اپنے طرزِ کلام میں اختراع اور ایجاد سے کام لیا کرتے تھے اسی طرح نئی نئی بحروں کے نکالنے کی اُن کو ایک دُھن تھی۔ اس کی پروا نہ کرتے تھے کہ وہ قابلِ قبول ہی یا نہیں، دُنیا اس کو پسند کرسکتی ہی یا نہیں۔ اُنھیں اپنے کام سے کام تھا۔ چناں چہ ایک بحر کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

مطلع ایجاد تازہ کہ ہر مصرع سی وشش فعلن دارد۔ در بحرِ طویل ایں است ؎

دِل و دیدہ میں آیا مقام کیا کہ مرا ہی جہاں میں نام کیا
یہ اُنھوں نے تو زور ہی کام کیا مجھے عشق میں شہرۂ عام کیا
مری روح و جسد میں خرام کیا مجھے لائقِ نطق کلام کیا
مجھے قیدیٔ دانہ و دام کیا مجھے روحِ قدس نے سلام کیا
مجھے فوج ملک نے امام کیا

جو شرابِ طہور کی جلوہ گری　　خُمِ لمعۂ نورِ ظہور میں تھی
کہ قصور سرور میں حور نے لی　　ہوئی جس سے کہ کشتِ امید ہری
وہی ساقیٔ بزم حضور نے دی　　بہ علیِ ولیِ وصیِ نبی
مجھے منبع گردشِ جام کیا　　مجھے بانیٔ شربِ مدام کیا
مجھے انشا اب ان نے غلام کیا

اسی طرح ایک اور بحر ایجاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ایں بحریست مُسمّٰی بہ سکران کثیرۃ الارکان کہ پنجاہ و پنج فعلن دارد

بہ شکوہ معقرِ عرشِ بریں　　بہ لوامع قدس و مکان و مکیں
بہ تقرّب قدرتِ روح امیں　　بہ ترفعِ پایۂ سدرہ نشیں
بہ خشوع و خضوعِ گروہ یقیں　　بہ مراتب جملۂ گوشہ گزیں
بہ بروج و کواکب و ماہِ مبیں　　بہ صوامعِ زینت اہلِ زمیں
بہ تلمع صورت مہر جبیں　　بہ تلالؤ خاتم و تاج و نگیں
بہ محمدِ مالک شرع متیں　　بہ علیِ ولی ہزبر عُزیں
بہ طفیل شفیعۂ روزِ جزا
بہ خصالِ حمیدۂ ذاتِ حسن　　بہ حُسینِ شہیدِ غریبِ وطن
بہ رؤسِ فتادہ جدا ز بدن　　بہ جروحِ شگفتہ بہ رنگِ چمن
بہ مُفوضِ خاک بدونِ کفن　　بہ عبادتِ عابدِ پا بہ رسن
بہ تبحّرِ باقرِ سر و علن　　بہ محامدِ صادقِ اہلِ سخن
بہ مودّتِ کاظمِ رنج و محن　　بہ کرامتِ ثامنِ ضامنِ من
بہ تقی و نقی و سمی و حسن　　بہ محمد مہدیٔ فخرِ زمن
ہمہ عقدۂ بندۂ خود بہ کشا

انشا کی چند غیر مطبوعہ غزلیں

اگر نہ مجھ سے تو آکر لپٹ گیا ہوتا — تو رات تجھ سے مراجی ہی پھٹ گیا ہوتا
کہے ہے خندۂ قل قل تبسم گل دیکھ — ہنسی کے مارے مرا دم اُلٹ گیا ہوتا
ہزار حیف بلا چاندنی میں ہم سے وہ ماہ — وگرنہ رات کو سب ڈول پٹ گیا ہوتا
دلِ رمیدہ لگاوٹ نے تیری قہر کیا — جفاے یار سے تو کاش ہٹ گیا ہوتا

بہ شدّت آپ سے انشا خفا ہوا تھا رات
تم اُس کو گر نہ مناتے چپٹ گیا ہوتا

ہو یہ گھر کھوج مٹے چاہ نصیبِ اعدا — کرے اس دُکھڑے کو اللہ نصیبِ اعدا
ایک دل خستہ یہ رستے میں کھڑا کہتا تھا — مرضِ عشق نہ ہو آہ نصیبِ اعدا
حیف تم چاند سا مکھڑا نہ دکھاؤ ہم کو — اور یوں ہو یہ شب ماہ نصیبِ اعدا
میں کہا حق کرے اب تم بھی کسی کو چاہو — لگے فرمانے کہ ای واہ نصیبِ اعدا
دال فے عین ہو رے داو زبر رو ہو ارے — سخت یہ درد ہے جاں کاہ نصیبِ اعدا
خاک منھ میں ترے اس منھ کو لگے آگ مجھے — نہ جھنکاوے یہ خدا راہ نصیبِ اعدا
کوستا ہے مجھے چل دور یہ بدفال نہ بول — میرے بیری مرے بدخواہ نصیبِ اعدا
خوبی خلطے کی ہے دیوانہ نہ ہو منھ کو سنبھال — میں کروں غیر کی پرواہ نصیبِ اعدا

عشق صاحب کو مبارک رہے انشاءاللہ
عشق اور بندۂ درگاہ نصیبِ اعدا

اکڑ کے پنجوں کے بل یہ چلنا نہ کشتہ کیوں کر ہوں اس ادا کا — سجا سجایا کسا کسایا یہ دھج تو دیکھو غضب خدا کا
بروں ہے وہم و قیاس سے بھی کروں جو تعریف اس صنم کی — جوانِ رعنا بہ حسن و خوبی پری کا عالم غرض گدا کا
نگہ یہ ظلم و کرشمہ آفت قیامت اُس پر یہ قامت اُس کی — ملاحت ایسی بلا کہ توبہ یہ عالم اپنے ہے دلِ رُبا کا
بہ رنگِ گُل کے بھلا میں کیوں کر کروں نہ جیبِ شکیب ٹکڑے — کنار میں اس کو تنگ کھینچے ہوا یہ مقدور اب ہوا کا

گھٹا یہ کالی گُلوں کی یہ بُو خروشِ رَعد اور برق ایسا — پِلا نہ بھر بھر کے جام ساقی سمجھ نہ اندازہ تک ہوا کا
شبِ آنکھڑیوں کا تری تصوّر خیال میں مجھ کو اس قدر تھا — کہ بُوئے نرگس سے پُر ہو اب تک کنارِ دامن مری دُعا کا

جو شخص طالب حسینؑ کا ہو تصدق اُس کے نہ کس طرح ہوں
غلام و فدوی ہوں جی سے انشا شہید میدانِ کربلا کا

بُتِ کافر مسیحا دم فرنگی ملّت اور ترسا — نصارا کر تو مجھ مومن کو یا مجھ پاس بے ترس آ
وہ طفلِ اشک کے منھ چڑھ تجھے کہتا ہوں ای ناصح — کہ ہو یہ شوخ ناداں ناقباحت فہم ابتر سا
شعاعِ آفتابِ روزِ محشر سے سکھالیں گے — اگر دامانِ رندانِ سُبوکش کچھ ہوا ترسا
لگا تیرِ نگہ سینے میں ایسا ایک ای قاتل — کہ لوٹے دِل ہمارا نیم بسمل ہو کبوتر سا

تری خاطر حرم سے آہوِ راکبِ کلیسا کا
قسم عیسی ابنِ مریم کی تجھے انشا کو مت ترسا

جونہیں کعبے سے فقیروں نے اٹھایا بسترا — جھٹ درِ بیت الصنم پر جا بچھایا بسترا
کیا تعیّن ہم کو منزل کا کہ ہیں آزاد لوگ — دِن جہاں آخر ہوا بس وہاں بچھایا بسترا
منکا ٹھنکا سیلی تاگا ہو گیا بھسمنت سب — آہ کی دھونی سے سب اپنا جلایا بسترا
بہرِ تعویذ اُس پری رُو کو لگا لایا فقیر — یعنی اس تقریب سے اپنا دکھایا بسترا
بال گو پالوں سے اکثر اپنے بھی ای جبرئیل — سدرہ کے سائے تلے جاکر بچھایا بسترا
مرشد اللہ سب مراقب ہو یہ روئے کل کہ صبح — بالکوں نے دھوپ میں اُن کا سُکھایا بسترا
دشت میں اپنے جو آیا قیس وحشت نے کہا — چل بے بے وحدت پرے کیوں یہاں تو لایا بسترا

اُن قلندر مشربوں کا وقت خوش انشا جنھیں
خاکِ صحرائے قناعت پر خوش آیا بسترا

دِل کے نالوں سے جگر دُکھنے لگا — یاں تلک روئے کہ سر دُکھنے لگا
دُور تھی ازبس کہ راہِ انتظار — تھک کے ہر پائے نظر دُکھنے لگا

روتے روتے چشم کا ہر گوشہ یاں — تجھ بن اے نورِ بصر دُکھنے لگا
درد یہ ہے ہاتھ گر رکھا اُدھر — وھاں سے تب سرکا اِدھر دُکھنے لگا
مت کراہ انشا نہ کر افشائے راز
دل کو دُکھنے دے اگر دُکھنے لگا

اس کے بعد ہم انشا کی مثنوی مُرغ نامہ لکھتے ہیں جس کے صِرف اوّل کے ۴۲ شعر مطبوعہ نول کشور کے نسخے میں پائے جاتے ہیں باقی مثنوی ندارد ہے۔ حالاں کہ انشا کی تمام مثنویوں میں سب سے زیادہ یہی کارآمد ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فن کے متعلق ہے۔ اور خاص کر اُس زمانے میں جب کہ لکھنؤ کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ مرغ بازی کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ اور شریف سے شریف اور وضیع سے وضیع لوگ بھی مُرغ دربغل نظر آتے تھے جس کی بے چارے میر صاحب تاب نہ لا سکے اور مجبوراً ایک مثنوی ہجو میں کہہ ڈالی۔

انشا کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو خود بھی مُرغ بازی کا بڑا شوق تھا۔ لیکن انھوں نے یہ مثنوی مُرغ بازی کے فن پر مرزا قاسم علی برادر وزیر المالک کے حکم اور فرمایش سے لکھی۔ ان کے ہاں ایک شخص خلیفہ بابو تھے وہ بتاتے گئے اور انشا نظم کرتے گئے۔ بابو صاحب اس فن کے ماہرِ کامل تھے۔ لہٰذا یہ قواعد نہایت ہی مستند ہیں۔ چوں کہ شاہ زادہ سلیمان شکوہ اور خود نواب آصف الدولہ کو بھی مُرغ بازی کا شوق تھا اس لیے بہ مصداق النّاس علیٰ دینِ ملوکھم تمام لوگ اس میں مبتلا تھے۔ اور چوں کہ ہزاروں روپے کی بازیاں بدی جاتی تھیں اس واسطے اُس میں بے ایمانی، جھگڑے فساد ہوتے اور قتل تک نوبت پہنچتی تھی اس لیے ضرور تھا کہ اس کے قواعد مقرر ہوں۔ چناں چہ سب سے پہلے انشا نے اس پر قلم اُٹھایا اور یہ مثنوی لکھی:

(مثنوی مرغ نامہ انشا)

حمد ہے فرض اس کی وقتِ سحر — جس نے کاٹے ہیں مرغ روح کے پر
کر دیا ہے اُسے جسد میں بند — کہ وہ یک چند وھاں رہے خورسند
مُرغ زرّینِ آفتابِ فلک — نسرِ طائر سے لے کے تا بہ ملک

اور سکانِ عالمِ لاہوت — یاد میں جس کی ہیں سبھی مبہوت
کُنہ میں جس کی ذہن کا طاؤس — خلق کرتا ہی طائرِ افسوس
کیا کہوں وہ بڑی کھلاڑی ہی — اُس سے غافل ہی وہ اناڑی ہی
کرکے بن مُرغ روح کا ڈھانچا — جس نے ڈھانپا سپہر کا کھانچا
حکم سے جس کے اس زمانے میں — یعنی دُنیا کے مُرغ خانے میں
رات دن ماکیانِ اوجِ سپہر — روز دیتی ہیں ایک بیضۂ مہر
نیند کو چھوڑ صبح ہی نزدیک — بانگ ہوتی ہی جوں صباح الدیک
دیکھ تو کیا سرور کا ہی وقت — طرفہ نور وظہور کا ہی وقت
محوِ ذکرِ خدا ہیں جملہ طیور — آدمی ہوکے تو کرے ہی قصور
سُن نصیحت مری بسمعِ قبول — تو بھی کچھ یادِ حق میں ہو مشغول
وقت سی مُرغ کرکے یہ معلوم — قاف پر بولتا ہی یا قیوم
اُٹھ کہ وقتِ نماز جاتا ہی — وقتِ راز و نیاز جاتا ہی
مُرغ جو جانور ہی دیوے اذان — اور سویا کرے تو اے انسان

نعت

کر ثنائے رسولِ راہ نما — جس کے نعلین کا ہی سایہ ہُما
صلوٰۃ اس پہ بھیجے ہی جاوید — ہی جو اک آسماں پہ مرغِ سفید
گر حمایت کریں نہ اس کی آل — نہ جہیں مرغِ عقل کے پر و بال

مدح شاہ زادہ سلیمان شکوہ

بس کہ شاہِ جہاں قمر تمثال — وہ سلیماں شکوہِ با تمثال
مالکِ ملک وصاحبِ دیہیم — وارثِ تاج وتخت ہفت اقلیم
بادشاہ زادۂ ہمایوں فر — فخرِ تیمور و بابر و اکبر

مدح نواب آصف الدولہ

اور جناب وزیر آصف جاہ — جس کی اختر سے ہو زیادہ سپاہ
آصف الدولہ اعظم الوزرا — جس کے ادنا غلام ہیں امرا
لڑنے بھڑنے کا ذوق رکھتے ہیں — مُرغ بازی کا شوق رکھتے ہیں
کیوں اولوالعزم کو نہ بھاوے رزم — اُس کی تقلیب میں ہو صورتِ عزم

صفتِ مرغ و مُرغ بازی

شغل ہو جن کو ترک تازی کا — کھیل ہو اُن کو مُرغ بازی کا
گوشِ دل سے یہ سُن لے میری بات — اِن میں ہیں چند انبیا کے صفات
صبح خیزی ہو اور شجاعت ہو — اور ہمت ہو اور غیرت ہو
کیوں انھوں کا نہ جنگ پر ہو مزاج — صرف اس قوم کو ہو تاج کی لاج

در حال مرغ بازئ خود

اب مجھے بھی یہ شوق ہو اس کا — کہ سمجھتا ہوں مُرغ کو عنقا
قصد پالی کا جب کہ کرتا ہوں — کیا ہی ڈگ لمبی لمبی دھرتا ہوں
داب اپنی بغل میں اک مُرغا — چلتا رپ رپ قدم ہوں میں ترغا
چمنستاں میں دیکھ تاجِ خروس — چاہتا ہوں کہ لیجے اس کو بھی چوس
مثلِ فولاد مُرغ ہیں اپنے — داد بے داد مُرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہیں انھوں میں صفات — پتنگ آہن گراں ہو اُن کی لات
ہو جو ہٹّا وہ سامنے ہوتا — بیٹا رستم کا زال کا پوتا
بڑھ مُنہا سا جو ایک ہو لاکھا — خونِ مرغاں کرے ہو وہ چاکھا
اور زردا جو ایک ہو پٹھا — اُس کا پالی میں ہو بندھا لٹھا
جو ہو ڈھونکرا وہ ایک ہو آفت — کیا کہوں اس کی جُرأت و قوت

چاہے گر چونچ سے تو وہ سنڈا　　　　توڑ ڈالے سپہر کا انڈا
ہیں غرض خوب خوب عالی مرغ　　　　ہے بجا اُن کو کہیے " سی مرغ

درسبب تالیفِ کتاب

تاکہ اس کھیل بیچ چیند نہ ہو　　　　اس کے لکھتا ہوں میں قواعد کو
ہیں جو اس علم میں بڑے اُستاد　　　　اُن کو اللہ رکھے خرّم و شاد
معدنِ علم و مخزنِ اخلاق　　　　مجھ پہ مخصوص رکھتے ہیں اشفاق
کیوں نہ ہوں روشناس عالم کے　　　　ہیں وہ بھائی وزیر اعظم کے
واقعی اُن کا ہے بلند مقام　　　　مرزا قاسم علی[1] ہے ان کا نام
رہے اُن پر وزیر کا سایا　　　　ہے انھوں نے مجھے یہ فرمایا
مرغ کا کھیل ہو اگر منظور　　　　مُرغ بازی کا سیکھ لے دستور
جنھیں اس فن میں خوب قابو تھا　　　　نام ان کا خلیفہ بابو تھا
مُرغ بازی میں سب سے فائق تھے　　　　یعنی اس فن میں وہ محقق تھے
تھے انھی قبلہ گاہ کے وہ رفیق　　　　اُن سے ہم سیکھتے تھے اس کا طریق
قاعدے جو خلیفۂ مسطور　　　　سامنے اپنے کرتے تھے مذکور
اور جو بات کرتے تھے ظاہر　　　　اُن سے کرتے ہیں ہم تجھے ماہر
الغرض ان سے جو سُنی تقریر　　　　میں نے منظوم اُسے کیا تحریر
اب وہ کہتا ہوں میں قواعد کُل　　　　تا نہ دے بیٹھے کوئی آکر گُل

قاعدہ

مُرغ بازوں کی ہے یہی بانی　　　　مثلاً ہو چکے ہوں دس پانی
گیارھویں پانی اپنا دے رومال　　　　اگلے نے پھر لڑایا ہو فی الحال

---

[1] قاسم علی خاں نواب سالار جنگ کے بیٹے اور بہو بیگم صاحبہ کے برادر زادے تھے۔ ۱۲

اور وہ جو حریف ہو غالب جس کے باقی ہوں پانی اب صاحب
مُرغ کا کانٹا دیکھ لے موٹا[1] تو غرض اُس نے بس اُسے لوٹا
بازی دینی پڑی اُسے لاریب شدّت اگلا کرے تو ہی یہ عیب
جس کے باقی ہوں پانی ای دلدار اُن نے گر کچھ کیا تو پھر مختار
باندھ لے کانٹے ٹانک لیوے پلک ہی یہ جاری سلف سے آج تلک

قاعدہ

جوڑ مرغاں کا تب بندھے ہی اخی جب کہ دونوں طرف کی ہی مرضی
چاہیے یونہیں ڈالنا ڈنکا جس سے راون کی کانپ اُٹھے لنکا
نہیں کوئی کرے جو ڈنکے بعد تو وہاں یونہیں گرجے جیسے رعد
لیجیے بازی اس سے ہو کے حریف اس میں یکساں ہیں سب توی و ضعیف
اور جو دونوں طرف کی مرضی ہو کہ نہیں اب لڑائی جانے دو
تو نہ اس کو خطر نہ اس کو ظفر ترک شدّت ہی اس گھڑی بہتر

قاعدہ

ہی یہی کانٹے باندھنے کا طور اس کو تو اپنے دِل میں کرلے غور
دونوں مرغوں کے کانٹوں کی انیاں کیجے سوہن سے خوب سی یکساں
اور نُہی جو ہوں اکی والے (کذا) اُن کو بس لے کے جھٹ رگڑ ڈالے
ایک کپڑے کی چار پٹی پھاڑ مُرغ بازوں کے کھیل کو لے تاڑ
وہ تو اپنے کے واسطے لے لے وہ اُسی میں سے دُوسرے کو لے
دھجیاں آٹھ آٹھ تہ کرکر باندھ مضبوط کانٹوں کے اوپر
انیاں کانٹوں کے ہوں نہوں کے بیچ کچھ نہ رہ جائے اُن میں اونچ اور نیچ
پر نہ ڈورا انی کے اوپر آئے کہیں ایسا نہ ہو اناڑی کہائے

نہوں؟

[1] محاورہ "پھوٹا" ہی اور قافیہ بھی یہی چاہتا ہی - 'اُردو'

قاعدہ

کل مقرر ہیں اس میں پانی دس — اس کے آگے جو ہو کسی کو ہوس
تو وہ رومال دے کے پانی اک اور — چھوڑ سکتا ہے مُرغ کو فی الفور
یوں لڑانے کو ہے لڑا سکتا — مُرغ کو پھر اُٹھا نہیں سکتا
گر اُٹھا دے تو ہارے پھر بازی — کچھ نہیں کام آتی دم سازی

قاعدہ

لڑنے میں مُرغ کے اگر رومال — کوئی لیوے بھگا تو پھر فی الحال
ایک پانی وہ ہار جاوے وہیں — پر جو دونوں کی ہو خوشی تو نہیں
چپکے سے تر کرے جو وقتِ مصاف — وہ بھی اک پانی ہار جاوے صاف
کرے رومال کو چھپا کے جو تر — اور قسم کھا کے جاوے صاف مُکر
نہیں کچھ چاہیے وہاں تکرار — یہی تدبیر ہے کہ ہو لاچار
دونوں رومالوں کو بلا کے عیاں — سب کے آگے نچوڑ ڈالے وہاں

قاعدہ

طبع کو شر پہ تو نہ کر مرغوب — مرغ پیشہ ہی ہیں لڑاتے خوب
کھینچ تا شر کرے نہ کوئی شریر — آدھی کر کے مفاصلے سے لکیر
ایک اپنی طرف اور ایک اُدھر — خیر سے تاکہ دیکھیں جملہ بشر
کیوں قضایا میں ہاتھ منھ ٹوٹیں — مُرغ دونوں پکڑ لیں پر چھوٹیں

قاعدہ

غیر کے مُرغے کی گئی سو چشم — تو تجھے وھاں نہیں ہے لازم خشم
دوسرے شخص کے نہ دل کو توڑ — ایک کا کی بچا کے مُرغ کو چھوڑ

قاعدہ

ایک کا آدھا بازو آیا ہو گر   دوسرے جانور کی گردن پر
ہے حریف ایک ہاتھ کا مختار   کہ جو چاہے تو لیوے بازو اُتار
اور جو دونوں لگاوے اپنے ہاتھ   ہار پانی کی پھر ہے اُس کے ساتھ

قاعدہ

سارے بازو جو مُرغ کی گردن   ڈھانپ [illegible] وہاں یہ ہے قدغن
کہ نہ چھیڑے کوئی نہ ہاتھ لگائے   اور جو چھیڑے تو ہار پانی جائے

قاعدہ

آگیا ہووے منھ میں مُرغ کے گر   تو الگ کھینچ لیوے چپکے سے پر
شرط ہے احتیاط اس میں ولے   دوسرے مُرغ کو نہ ہاتھ لگے

قاعدہ

گر شرارت سے مُرغ باز نے ہاتھ   مارا ہو مُرغ کو تو اس کے ساتھ
اس کی پالی سے کیجیے باہر   اور کہیے کہ ہار گیدی خر

قاعدہ

مُرغ دونوں جو کرتے جنگ و جدال   حد پہ پالی کی پہنچے ہوں فی الحال
مارتا دست مُرغ کو گر [illegible]   چونچ سے اپنی پکڑے اُس کو ہو
کھیل کی بات ہے یہی لاریب   وہاں اُٹھا لینا کچھ نہیں ہے عیب
نہ اٹھے حد سے تو ہے پالی کی ہار   وقنا ربنا عذاب النار

قاعدہ

ہے وہ مختار جس کے مُرغ کی دُم   لگی پالی کی حد سے [illegible] دم
نہ اُٹھاوے وہ یا کہ لیوے اُٹھا   ہار جیت اس میں کچھ نہیں اصلا

مُرغ جس کا طرف ہو پالی کے   وہ اُٹھاوے تو پانی بس ہارے

پالی باہر سے کوئی شخص جھپٹ   لے اٹھا مُرغ کو تو بس جھٹ پٹ

غیر دو پانی ہارے وہ بے شک   اس میں کرنی عبث کو ہے بک بک

قاعدہ

کب چھڑاتے ہیں چشمِ مرغ سے خاک   عین کرنے میں ہو جنھیں ادراک

اور پر کا نہیں مضائقہ پر   رکھتے جائز ہیں اس کو اہلِ ہُنر

قاعدہ

مرغ کا لڑنے میں جو ٹوٹا خار   ہو گیا ہووے سب تہوں کے پار

آدمی غیر کا جتا دیوے   تہوں کا ٹوٹنا بتا دیوے

کھول کر کانٹے دیکھ لیوے یہ بھید   سب تہوں کے جو وار پار ہوں چھید

تو تو البتہ پانی ہارے دو   ورنہ پھر اُلٹی ہار ہو اس کو

کانٹے کھلوائے غیر سے لیکن   اس میں بہتر ہو رات ہووے کہ دِن

اور اک تہ بھی رہ گیا ہو اگر   تو نہیں ٹوٹا خار اے دِل بر

کانٹے پھر کھول باندھنے یوں نہیں   جس سے اگلے کے دِل کو ہو تسکیں

قاعدہ

گاہ باشد اگر یہ شبہ ہوا   یعنی ٹوٹا ہو کانٹا مرغے کا

دونوں راضی ہوں وھاں تو خلطے کی راہ   کچھ نہیں ہے مضائقہ باللہ

کیوں عبث قصہ مُفت کا باندھے   پھر نئے سر سے کھول کر باندھے

قاعدہ

اور اگر مُرغ کو لگے کاری   اُس کو میداں سے جھٹ بہ طراری

دُوسرا لے اٹھا تو وہیں پھر   پانی ہارے یہ بات ہے ظاہر

جانور حد پہ جا پڑے جو پھڑک ‌ ‌ ‌ تو اُسے جلد چاٹ لے نہ دھڑک
جھٹ بھڑا دیجے اس سے چونچ سے چونچ ‌ ‌ ‌ اور کہیے کہ بھائی تو بھی پونچ
اس میں پالی کی اُس کو ہار نہیں ‌ ‌ ‌ اور تکرار زینہار نہیں
کاری کھائی اگر اٹھا لیوے ‌ ‌ ‌ حد سے پالی کی اور لگا دیوے

قاعدہ

بیٹھ پالی ہی میں کہے جو وہ یوں ‌ ‌ ‌ پھر اُسے پھونک کر لگاتا ہوں
دیجیے اُس کو مہلت آدھ گھڑی ‌ ‌ ‌ کہ مصیبت غریب پر ہی پڑی
ہی وہ مہلت کی قدر کا مختار ‌ ‌ ‌ اس میں شایاں نہیں ہی کچھ تکرار
چاہیے آٹے کی گولیاں توڑے ‌ ‌ ‌ چاہیے مُرغے کو سامنے چھوڑے
اس کے پہلے جو مرغے کو دے چھوڑ ‌ ‌ ‌ تا کہ گولی دے گونڈے آٹے سے توڑ
تو ہی معلوم نزد اہلِ تمیز ‌ ‌ ‌ پالی بے شبہ پھر وہ ہارے عزیز
اس کی بے اطلاع مرغ اگر ‌ ‌ ‌ اگلا لے جائے پالی کے باہر
سُن لے پھر میرے ای رفیق شفیق ‌ ‌ ‌ ہار پالی کی ہی اُسے تحقیق
گیارھویں پالی کر کے دم سازی ‌ ‌ ‌ مُرغ اپنا چھوڑے سودے بازی

قاعدہ

لڑتے لڑتے جو مُرغ مرجاوے ‌ ‌ ‌ چاہیے دؤسرا نہ گھبراوے
کردے ٹکھٹی پہ اُس کو وہیں کھڑا ‌ ‌ ‌ اور ٹک جی کو اپنے کرلے کڑا
دؤسرا اُن کا والا لات جڑے ‌ ‌ ‌ تو یہ بازی کے دبنے پر نہ اڑے
دھکے اور لات کی نہ ٹھیرے تو ‌ ‌ ‌ پھر برابر رہے وہاں دونو
نہ ہوئی جیت ہار کچھ مطلق ‌ ‌ ‌ مٹ گئی ہم دگر جو تھی نق دق

قاعدہ

چاہیے یہ کہ مُرغ باز سوائے ‌ ‌ ‌ کوئی پالی میں ای عزیز نہ جائے

یا وہ دو مُرغ باز جاویں اوَر　　جو کہ کانٹوں کے دیکھ لیویں طوَر
یا جو پالی کے رنگ کو تاڑیں　　ہم اس طور جنگ کو تاڑیں

قاعدہ

رات ہو جائے اس میں تو مجبوُر　　وہاں ناچار ہے یہ بات ضرُور
مشعلیں گرد و پیش دِکھلاویں　　چار مشعلچی پالی میں جاویں
رکھیں ایسا ہی مشعلوں کو جانچ　　کہ نہ مرغوں کو پہنچے مطلق آنچ
نہ لگے مُرغوں کو کہیں مشعل　　کہ مبادا کچھ اور آوے خلل
یعنی آپس میں ہووے دت دبکھ　　اور برپا ہو مفت کی بک بک
اور ترکیب مجھ کو ہے سوُجھی　　آ کے حاضر ہوں آٹھ مشعلچی
چار تو ہوویں چار کونوں پر　　اور ہوں چار پالی کے اندر
مُرغ لگنے میں اور بھاگنے میں　　سب کو لازم ہے دوُر سے دیکھیں
بیچ پالی کے اُس گھڑی آنا　　عیب رکھتے ہیں جو کہ ہیں دانا
گو بڑا آدمی ہو یا سردار　　چاہیے اُس سے کرنی یہ تکرار
کھیل سے یہ بعید ہے حضرت　　یہ ہوئی آپ سے بُری حرکت
دوُسری بار یوُنہیں ہو تو غرض　　دیں رُپے پانچ پھر وہ اس کی عوض
کوئی اس بات سے جو ہو باہر　　کھیل کا اُس سے ترک ہے بہتر

قاعدہ

نہ کڑکیے بسانِ رعد و برق　　چاہیے رکھیے مرتبے کا فرق
با ادب بات کھیل کی کہیے　　اور آتی نہ ہو تو چُپ رہیے
بولنا مُرغ باز کا بے جا　　کسی سردار سے نہیں اچھا
اور بولے تو جس کا ہے نوکر　　اُس کو لازم ہے ہو خفا اُس پر

چاہیے اُس کو دیوے ایسی سزا — کہ وہ اس بات کا اُٹھاوے مزا
اُس کا آقا کرے نہ گر تنبیہ — تو نہایت ہو کھیل میں یہ کریہ
چاہیے حاضروں کی صف کی صف — ہو سب اس مردِ آدمی کی طرف
تاک اُس کے مزاج کا گھر گھاٹ — کھیل سے اُس کے لیجے دل کو اُچاٹ

قاعدہ

اور لازم ہو اک جُدا ہو مکاں — مُرغ آ کر کے سینکے جاویں جہاں
چونچ جبڑے جہاں کہ باندھ سکیں — چاہیے سو مُرغ باز اپنی بکیں
رکھیں گودی میں اپنے مرغوں کو ڈھانک — تاکہ پلکوں کو لیویں اُن کی ٹانک
یا دوا میں کچھ اُن کو دیویں کھلا — مطلق ان چیزوں کا نہیں ہو گلا
بلکہ سُرمہ دیں اُس کی آنکھوں میں ڈال — جس طرح اپنی لیویں سنبھال
لیک کانوں کی کچھ دوا ملنا — ہو قیامت ہی یہ نکل چلنا
اس میں ہوتی کڈھب ہو گفت و شنید — کھیل کی راہ ہو یہ بات بعید
مُرغ کا بازو ٹوٹ جاوے تو — کیا خلل ہو سمیٹ لے اس کو
ہو لہو مُرغ کا اگر جاری — تو دوا ملیے ہو کے ناچاری
کچھ نہیں ہو مضائقہ اس کا — پر جو چاہے کہ ڈورا یا کپڑا
لا کے باندھے یہ بات ہو ممنوع — عذر ہرگز نہیں ہو وہاں مسموع

قاعدہ

جوڑ اگر ایک ہووے یا دو ہوں — تین ہوں چار پانچ ہوں جو ہوں
تا بہ حدّے کہ ہوں بندھے چھ جوڑ — تو ہی پالی میں ہرتے پھرتے چھوڑ
بلکہ پانی تک ایک ایک کے بعد — آیا جایا کریں یہ ساعت سعد
فرق دو دو گھڑی ہو پانی کا — مقتضا ہو یہ قدر دانی کا

ہر کھلاڑی کو طور یہ بھاتا — ایک آتا ہو ایک ہو جاتا
چھٹے پانی سے تین تین گھڑی — چاہیے دیر کیوں کہ پھر ہو کھڑی

قاعدہ

یہی اُستاد نے کہی ہو بات — جب گھڑی پانچ رہ گئی ہو رات
دونوں مُرغوں کو صاحبِ تیمار — ہیں پھر اُس آن فاعلِ مختار
شوق سے مُرغوں کو سُلا رکھیں — دو گھڑی دن تلک جُدا رکھیں
اس سے آگے جو اور بھی ہو دیر — تو وہ عائد ہو ہار پانی کی پھیر
اور اگر ہو اجازتِ طرفین — تو گھڑی چار پانچ کیجیے چین
یہی دستور ہو یہی معلول — دونوں راضی ہوں جو کہیں سو قبول
ہم دگر کی نہ ہو رضامندی — جس میں وہ بات ہو خبر خندی

قاعدہ

ڈنکا جب پڑ چکا ہو مُرغے پر — دوسرا چاہے ٹوٹے باندھے پر
چھیلنے بیٹھے اپنے مُرغ کے خار — تو پھر البتہ کیجیے تکرار
شرط کر لی ہو پہلے سے تو سند — نامناسب ہو آگے جد و کد

قاعدہ

ہووے جو کوئی مُرغ بازی پر — اُس پہ لازم ہو باندھنی یہ کمر
دو رُپے سے بدے نہ بازی زیاد — اس میں گو وہ خفا ہو یا کہ ہو شاد
ہو نہایت رُپے وہ تین بدے — فائدہ (کیا) کہ ملکِ چین بدے
اس سے آگے بدے تو ہو تفضیح — نہیں رکھتے اسی کی بازی صحیح
جتنے کا مُرغ باز ہو نوکر — دھیان رکھے وہ اپنی آمد پر
یا کہ اُس کا نہیں اگر چاہا — بد دیا اُس نے آدھا درماہا

اور اس سے زیادہ جھوٹ ہو بات — آٹھویں روز کی ہو گئی لات
بازی جب تک نہ آوے آٹھواں دن — پھر لڑائی حرام ہو اس بن

قاعدہ

ہو گنہ‌گار تو سہی انصاف — کیجیے ایک بار جُرم معاف
پھر جو تقصیر ہووے بارِ دگر — کرے غصّہ وہ جس کا ہو نوکر
اور سردار اُس کا دیوے جو ٹال — سب کو لازم ہو دیویں اس کو نکال
کریں باہر اُسے حویلی سے — کہ وہ بدتر ہو بیجے تیلی سے

قاعدہ

پھلے کانٹوں بھی مُرغ لڑتے ہیں — لاتیں کھا کھا بہم بپھرتے ہیں
وصیتوں کا نہیں ہو کچھ مذکور — اور سب کچھ ہو ویسا ہی دستور
اُس کی بھی ہو اسی طرح کی ریت — ہو اسی ڈھب کی ہار ویسی ہی جیت
چاہیے جتنی لیجے بازی بد — ہو جُوا منھ کا بات ہو یہ سَند

ہم کو یہ مثنوی اسی قدر دست یاب ہوئی۔ مگر شُبہ ہوتا ہو کہ پھر بھی شاید خلتے کے کچھ شعر رہ گئے ہوں۔ بہرصورت یہ ایک نایاب چیز تھی جو نذرِ ناظرین کر دی گئی۔

سیّد انشا کی بابت تمام تذکرہ نویسوں کا خیال ہو کہ وہ سخت ہاجی تھے۔ زراسی بات پر اپنے حریف کے ایسا پیچھے پڑتے تھے کہ اُس غریب کو اپنی جان چھڑانا بھاری ہوجاتی تھی۔ یہی اُن کے دیوان سے بھی ثبوت ملتا ہو مگر ہم اس وقت ایک نئی ہجو پیش کرتے ہیں جس کے نو بند ہیں مگر چوں کہ کئی بند نامہذّب ہیں اس لیے ایسے بند ~~جو دائرۂ تہذیب~~ میں ہیں ان کو انتخاب کیا جاتا ہو۔ افسوس ہو کہ اب یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ کس پر برس پڑے ہیں اور کس بے چارے کو ہدفِ ملامت بنایا ہو بظاہر کوئی گویّا معلوم ہوتا ہو ؎

خصوصاً جس کی ماں سارنگی اور بابا تنبورا ہو
وہ جھنڈو کیوں نہ پھر جس بات میں دیکھو ادھورا ہو — غنیمت ہو تناری ری ہی میں اپنی جو پورا ہو

بھلا کیا آدمیت جانے مجہول النسب ایسا
مٹھو سا پن یہ ہو جس میں نسب ایسا حسب ایسا
یہ بھونڈاپن نہ جس پہ آنکھ ہرگز خوک و سگ ڈالے   یہ کاٹھی جوں مسافر کے گلے میں پھانسی ٹھگ ڈالے
تو ارہ یہ بڑے ساکھو سے ہوویں جوں الگ ڈالے   تندیٔا یہ کہ اک فیروز شہ کی لاٹ ہگ ڈالے
عجب گوبر گنیش اُس کی وہ شکلِ پُر کدورت ہی
معاذ اللہ اک ماہی مراتب کی سی صورت ہی
نجیب ایسا نہ ہو دُنیا کے کیوں کر کارخانے میں   مکرر ہوگیا ہی جمع[۱] اجتیں اس گھرانے میں
ہوئی ہی صرف سب اوقات وھاں گلے بجانے میں   غرض کچھ ذات اس کی مغتنم ہی اس زمانے میں
سلیقہ بات کا یہ کچھ زباں جب اپنی کھولے ہی
تو اپنے والدِ مرحوم کو محروم بولے ہی
گھمنڈاں دومڑوں کا یہ نہایت مجھ کو بھاتا ہی   جو کہتے ہیں کہ ہم کو بادشاہوں ساتھ ناتا ہی
جب اس کو دیکھتا ہوں کیا کہوں کیا یاد آتا ہی   اصالت دیکھیو اس کی کہ اک پردے میں گاتا ہی
نہ سرگم گانے پر لازم ہو اس کو شرط کیوں بدنی
کہا ہی اس کو بھوپت خاں نے سارے گلے کی بدنی
مگر سا سر شکم کچھ سوس سے بھی اور بدتر ہی   شرائیں مار آسا ہر عضب مانند اژدر ہی
پتھورا کے محل چوتڑ ۔ ۔ ۔ نفاخ صرصر ہی   وہ جھجی[۲] جیسی کچھوی ناک مینڈک منہ چھچھندر ہی
تو لد پائے بڑکنی[۳] سے دل بادل جھاوا
تو اس کو بھی نہ کہہ سکیے کہ ہی اس شخص کا بادا

---

[۱] یہ مصرع صحیح نہیں معلوم ہوتا اسی لیے سمجھ میں نہیں آیا۔ ۱۲   [۲] جھجھی
[۳] بڑکنی ایک ہتھنی کا نام مر دل بادل ایک ہاتھی کا نام تھا جو زمانۂ آصف الدولہ میں تھے۔ صحیح مصرع غالباً یوں ہی ع
تو لد پائے بڑکنی سے گر دل بادلا جھاوا

تراشا ہو یہ بھینسا سُر عجائب صنع آذر نے　　بجا ہو اُس کے دروازے کا گینڈے آ کے دیں دھرنے
لگے ہو دو قدم چلنے میں اُلٹے سانس یوں بھرنے　　پڑے گرمی کے مارے ہنپہپاتے جیسے ہوں ارنے
قیامت نوعِ انسانی میں اُلٹا قسم ہو اس کا
بی ارزم مساق بلیغ[1] اسم ہو اس کا

کبھی ہاروت بیٹھا ہو کبھی ماروت کی صورت　　نہ لگّا کھاوے اُس سے دیو کی اور بھوت کی صورت
عرق سے اُس کے ٹپکے ہو سُور کی موت کی صورت　　عیاں ہو اُس کی اس بک بک سے برجِ حوت کی صورت
کہا جن نے اُسے ہو یہ ملک لندھور کا بیٹا
خدا بخشے گنہ اُس کے غرض ہو وہ بہت اچھا

کوئی اور شخص ہو اور اس سے یہ غلطی ہوئی ہو کہ اُس نے سید انشا کے متعلق کہیں کچھ کہ دیا ہو۔ انشا سخت برہم ہوئے ہیں اور ایک ہجو کہ ڈالی ہو۔ اُس کو بھی پورا نقل نہیں کیا جاسکتا چند بند پیش کیے جا سکتے ہیں ؎

می نہد گوش کسے بر سخنِ غیبت گو　　ہست ابلیس نہاں در بدنِ غیبت گو
منبعِ خبث بود جملہ تنِ غیبت گو　　باید انداخت . . . در دہنِ غیبت گو
پف روہ . . . من و . . . زنِ غیبت گو

ناسزا گفتمش از حد حساب افزون است　　جملہ آفاق بہ عندیہ او ما بون است
ایں چہ تخمے است نہ دانم کہ حقیقت چوں ست　　زاں جماعت کہ قلوب ہمہ شاں زد خون است
ہمہ آمادہ بہ گردن زدنِ غیبت گو

تا شباں گاہ برآید بہ سبویش شاشم　　گام اہستہ زنم بر سر و ریش شاشم
وا کنم ہر دو لبش را و بہ مویش شاشم　　آں چناں گرم بہاں ریش و گلویش شاشم
کہ چکد شاشہ فرد از دہنِ غیبت گو

---

[1] یہ مصرع صاف نہیں پڑھا گیا اصل کے مطابق لکھا گیا ہو۔ ۱۲۔
ہمارے خیال میں مصرع شاید یوں ہو۔ "بی اُ ارزم مساق بلیع اسم ہو اس کا" جس کے اُلٹنے سے ابنِ مرزا قاسم علی نام مکمل آتا ہو۔ (اُردو)

مُردہ شوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست	قبح جوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست
یادہ گوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست	زشت روئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست
دیدۂ آں گلہ و پیرہنِ غیبت گو

اژدہائے است کہ آتش بہ زند عالم را	بلع سازد ز دمِ خویش بنی آدم را
می کشد تشنہ شدہ جملۂ آبِ یم را	نہ گزارد بہ جہاں شائبۂ شبنم را
ظاہر است ایں ہمہ اژدم زدنِ غیبت گو

ہمہ گویند پر افسردۂ ای قرمِ ساق	بہرہ از مسخرگی بردۂ ای قرمِ ساق
مالِ دریوزہ گری خوردۂ ای قرمِ ساق	نام جد و پدر آوردۂ ای قرمِ ساق
لعنت اللہ بریں زیستنِ غیبت گو

دشمنِ دینِ محمدؐ بود آں نا انصاف	سخن معجزہ می گوید و می خندد صاف
در شریعت نگرد از نظر استخفاف	طعنہ بر سبع مثانی زند و سورۂ قاف
ایں خیالات بود بیخ کنِ غیبت گو

با حسینؓ ابنِ علیؓ بغض و عداوت دارد	صد دلائل پئے انکار شہادت دارد
بنگر ایں کس چہ قدر ہا کہ شقاوت دارد	طعن و تشنیع بر اولادِ رسالت دارد
کردۂ غور بہ چشمک زدنِ غیبت گو

عرق آلودہ چو با بخت نگوں می آید	از زبانش ہمہ خوف ... و... ل می آید
آں سیہ رو چہ بہ گوئم کہ چوں می آید	مادہ خوکے است کہ از آب بروں می آید
ایں چنیں است بلے آمدنِ غیبت گو

دوسری ہجو

بہ تحقیق یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ہجو کس کی لکھی گئی اور سید انشا معمول سے زیادہ کس پر مہربان ہوگئے ہیں مگر نظم میں ضیا کا نام آیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس کی ہجو لکھی ہے وہ شخص مذہب امامیہ ہی رکھتا تھا اس لیے

خیال ہوتا ہو کہ یہ شاید میر ضیا ہوں گے۔ یہ دہلوی الاصل تھے مگر عظیم آباد میں جا رہے تھے۔ ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے بعض کے نزدیک ۱۱۹۴ھ میں انتقال کیا۔ بہر حال یہ ایک خیال ہو اور مجھے اس پر کوئی وثوق نہیں ہو۔ مگر ہجو کے بعض بند لکھتا ہوں۔ ؎

ملعوں دروغ بلع کند تا ہمین رید
شکلش چناں ترش کہ ہمہ صاف کین رید
گر انگبیں خورد ہمہ سر کنگبین رید
زانساں کہ از ممرمری ایں لعین رید
کے شپرک ز راہ دہن ایں چنین رید

خفاش ہرچہ بد برش آید بہ دام او
سرگشتہ کور موش برائے سلام او
چلپاسہ چوں کنیزک و حر با غلام او
تعفین مُردگان نرود از مشام او
نکہت اگرچہ صد چمنِ یاسمین رید

خوش می کند شراب عداوت سبو سبو
ذوالاحترام را نہ کند ہیچ آبرو
نامش برند ہم چو معاویہ کو بہ کو
از خرقہ تشیع پوچش حذر کہ او
شمر و سنان ابنِ انس را سنین رید

تذلیلِ اوست جملہٗ امراض را علاج
پیداست بہر لاعنِ او سور و ابتہاج
قوتِ ہمی فزاید و خشنیتِ مزاج
خاقاں چو لعن کردن او را دہد رواج
صد مشک نافہ آہوے صحرائے چین رید

بابا چگونہ می سزدش کرد انحراف
باید بہ ایں جریمہ دو صد عجز و اعتراف
ہاں اے ضیا بہ کوش بہ خود ایں قدر ملاف
طبع بلند ماست بلے ہم چو کوہ قاف
سی مُرغ کلکِ ما ہمہ تاج و نگین رید

زیں نعرہ می رسد بہ فلک صدمہٗ عظیم
مُخ دماغِ چرخ برآید ز خوف و بیم
سازیم از لکد کرہٗ خاک را دو نیم
آلودہ با بلاغم احشا و خون و ریم
آں ہر دو شاخ سرزدہ گاو زمین رید

در رودہ اش سحاب تواند بہ سر برد　　　　برقِ جہاں بہ دام ز گورش شرر برد
بوے عفونتش نفسِ خوک و خر بَرد　　　　انشا ثواب گلشن ہجوش اگر برد
گاؤ نسیمِ صبح گر عنبریں رید

انشا کو طلسمات اور شعبدوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ اُن کے دیوان میں یہ چیزیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں لہٰذا ایک طلسمِ غیر مطبوعہ نقل کر کے ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

وہ گھڑا جو کہ ہو مجھولا سا　　　　آٹھ دس سیر جس میں پانی ہو
اُس کو چھلکا کے آب خورہ ایک　　　　رکھ دو اور گرد اس کے لیوا دو
تو گھڑا بھی وہ پھر اُٹھ آئے گا　　　　جو اُٹھا لیجے آب خورے کو
ہے یہ حاضر طلسم انشا پاس
جب اسے چاہو آپ کر دیکھو

———◦(◦※◦)◦———

بمبئی کی اُردو صحافت!

(از جناب رئیس احمد صاحب جعفری، ایڈیٹر روزنامہ انقلاب بمبئی)

بمبئی کی اُردو صحافت ۱۸۹۹ء تک [1]

اُردو صحافت کا اگر نگاہِ غور سے مطالعہ کیا جائے، تو اس عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ گو صوبۂ بمبئی کو یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ وہ اُردو داں حلقوں میں شمار ہو، پھر بھی، اُردو صحافت کی تعمیر اور تشکیل میں اس کا نمایاں حصّہ ہے۔

شمالی ہند اُردو کا وطن ہے، کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج اُردو کی تربیت گاہ ہے، بنگال اور بہار میں ربط ہے، بہار اور صوبے جات متحدہ میں وابستگی ہے، صوبے جات متحدہ اور دلّی میں مماثلت ہے، دلّی اور پنجاب ایک ہیں، پھر اگر ان سب مقامات میں اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا تو مایۂ حیرت نہیں، حیرت اگر ہوسکتی ہے تو اس پر کہ بمبئی جیسے دُور دراز مقام پر، جہاں پہلے سے گجراتی کا سکّہ چل رہا تھا، اور مرہٹی کی عمل داری تھی اور انگریزی کی سُلطانی قائم ہوچکی تھی ——— اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں کی اُردو صحافت بالعموم شمالی ہند کے ادیبوں اور اخبار نویسوں کے ہاتھوں پھلی پھولی، پروان چڑھی۔ لیکن کیا اس امر واقعہ سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ بمبئی کے عوام میں، اور خواص میں، اُردو زبان کو اپنانے اور مقبول بنانے کا جذبہ پہلے سے موجود تھا؟ اگر یہ نہ ہوتا تو یہاں سے اُردو اخبارات کیوں کر نکلتے؟ کس طرح کام یابی حاصل کرتے؟ اب سے ۷۰، ۸۰ سال پہلے کی صحافت کا آج کی صحافت سے، اس

[1] بمبئی میں پہلی اُردو کانفرنس ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵ فروری ۱۹۴۵ء کو بابائے اُردو مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی یہ مقالہ اسی کانفرنس کے لیے لکھا گیا۔

زمانے کی دشواریوں کا آج کی سہولتوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج معمولی سے معمولی اخبار بھی سرکاری نیم سرکاری، تجارتی اور فلمی اشتہارات گراں تر نرخوں پر حاصل کر سکتا، اور کرتا ہے۔ اُس زمانے کے اخبارات، اشتہارات سے بالکل محروم تھے، ان کا مدارِ حیات تمام تر خریداروں پر تھا اور ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بنیاد آج کی بنیاد سے زیادہ مضبوط تھی۔

پون صدی پہلے کے اخبارات

سرِدست یہ کہنا مشکل ہے کہ بمبئی میں سب سے پہلا اُردو اخبار کون تھا؟ لیکن سنہ ۱۸۶۷ء سے باقاعدہ سلسلہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ جب حکومتِ ہند نے رجسٹری کتب و اخبارات کا قانون نافذ کیا تھا، اس سال بمبئی سے اُردو کے تین اخبار نکلتے تھے۔

(۱) 'کشف الاخبار'

(۲) 'برقِ خاطف'

(۳) 'لطیف الاخبار'

سنہ ۱۸۸۰ء میں 'عندلیبِ ہند' ایک اخبار جاری ہوا یہ پہلے ہفتہ وار تھا، پھر ہفتے میں تین بار ہوگیا، اسی سال ایک اور اخبار 'جہاں نما' جاری ہوا، یہ اُردو اور فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں دو اخبارات جاری ہوئے۔

(۱) 'ارمغان'

(۲) 'خیرخواہِ اسلام'

سنہ ۱۸۸۳ء میں حسبِ ذیل اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) 'الطاف'

(۲) 'منظہر'

(۳) 'شوکتِ اسلام'

(۴) 'دیدۂ اسلام'

(۵) ' خادمِ ہند '

(۶) ' ملیٹری انسٹریکٹر '

۱۸۸۵ء میں اخبار ' ارمغانِ ہند ' کا اضافہ ہوا، ۱۸۸۶ء میں ایک نیا اخبار ' شوکتِ ہند ' اشاعت پزیر ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں ' جوہر ' جاری ہوا ، ۱۸۹۱ء میں ' مخبر ' اور ۱۸۹۳ء میں حسب ذیل اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) روزنامہ ' وکیلِ اسلام '

(۲) ' انڈیا گزٹ ' ہفتہ وار

(۳) ' عالم افروز ' ہفتہ وار

۱۸۹۴ء میں کچھ اور نئے اخبارات جاری ہوئے :۔

(۱) ' معین الملک '

(۲) ' زبان '

(۳) ' مسلم ہیرالڈ '

۱۸۹۵ء میں یہ نئے اخبارات نکلے :۔

(۱) ' بشیر الملک ' ہفتہ وار

(۲) ' آئینۂ ہند ' ماہ وار

(۳) ' مرآۃ الاخبار '

۱۸۹۶ء میں دو نئے اخبارات نکلے :۔

(۱) ' ممبئی پنچ بہادر '

(۲) ' سفیر '

۱۸۹۷ء میں کئی نئے اخبارات جاری ہوئے :۔

(۱) ' ابوالپنچ ' ہفتہ وار

(۲) ' نیرِ اسلام ' "

(۳) 'آزاد پنچ' ہفتہ وار

(۴) 'دجنٹلمن آف دی پیس' ہفتہ وار

(۵) 'مقبولِ عالم' ہفتہ وار

(۶) 'منصفِ دکن' "

(۷) 'سلطان الاخبار' روزنامہ

کچھ اور پُرانے اخبارات!

مَیں عرض کرچکا ہوں، بمبئی کی اُردو صحافت کے آغاز کی صحیح تاریخ فی الوقت نہیں بیان کی جاسکتی۔ اس سلسلے میں گراں قدر معلومات حاصل ہوسکتے ہیں، آیندہ مزید تحقیق و تفتیش کی جائے، تو پوری جامعیت کے ساتھ ایک مکمل تاریخ بھی مرتب ہوسکتی ہے۔

اوپر کی سطروں میں اخبارات کی جو فہرست مَیں نے پیش کی ہے، یہ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ۱۸۶۷ء میں حکومتِ ہند نے رجسٹری کتب و اخبارات کا قانون نافذ کیا تھا، مذکورہ فہرست حکومتِ بمبئی کے محکمۂ تراجمِ مشرقیہ کے شعبۂ اُردو کے انچارج مسٹر برنی کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے، لیکن بمبئی کی اُردو صحافت کا یہ نقطۂ آغاز نہیں ہے۔ مزید تحقیق اور تجسّس کے بعد اس سے پہلے کے بھی کچھ اجزا دستیاب ہوسکتے ہیں۔ اب مَیں انھیں پیش کرتا ہوں۔

مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو گارساں دتاسی کی کتاب "ہندستانی ادب از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء" کا ترجمہ انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کی طرف سے شائع ہوچکا ہے۔

گارساں دتاسی اگرچہ پکا عیسائی تھا، اور اسے ہندستانی لٹریچر سے بالعموم اور ہندستانی یا اُردو زبان سے بالخصوص بہت دل چسپی تھی۔ کیوں کہ ہندستان میں تبلیغِ عیسائیت کی رفتار پر وہ باقاعدہ نظر رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ دل چسپی مورخانہ حیثیت سے آج ہمارے لیے بڑے کام کی چیز ثابت ہو رہی ہے۔

گارساں دتاسی نے اپنے پانچویں خطبے میں جو ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء کو پڑھا گیا، اُردو پریس کی تدریجی ترقی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ بمبئی کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے:-

”بمبئی میں تین یا چار ہندستانی اخبار ہیں! ان چار میں سے صرف دو کے نام معلوم ہوسکے :۔

(۱) ’بمبئی کا ہرکارہ‘

(۲) ’تازہ بہار‘

۱۸۵۹ء کے خطبے میں گارساں دتاسی نے بمبئی کے دو اخبارات کا ذکر کیا ہے :۔

(۱) ’راست گفتار‘

(۲) ’بامداد‘ (یہ عیسائیوں کا مذہبی پرچہ تھا)

۱۸۶۸ء کے خطبے میں اس نے صرف ایک اخبار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

”سورت میں جہاں سے کبھی کوئی اردو کا اخبار شائع نہیں ہوا تھا، مئی ۱۸۶۷ء سے باقاعدہ ایک اردو ہفتہ وار جاری ہوا ہے، اس کی زبان نہایت فصیح ہے اس اخبار کا نام منظور الاخبار ہے!“

’کشف الاخبار‘ کے متعلق میں عرض کر آیا ہوں کہ حکومتِ ہند کے قانون کے بموجب اس کی رجسٹری ۱۸۶۸ء میں ہوئی تھی، اب گارساں دتاسی کے ایک خطبے سے اس کی تاریخِ آغاز بھی معلوم ہوگئی۔

۱۸۶۲ء کے خطبے میں گارساں دتاسی ’کشف الاخبار‘ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :۔

”بمبئی سے کشف الاخبار ۱۸۶۱ء سے نکلنا شروع ہوا ہے یہ ہفتہ وار ہے، اور ہر بدھ کو شائع ہوتا ہے، اور چھوٹی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھنؤ کے منشی امان علی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ ہر نمبر کے شروع میں ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے جس میں اس نمبر کا پورا پروگرام لکھا ہوتا ہے!“

چند اور نام

گارساں دتاسی کے خطبات اور حکومتِ بمبئی کے محکمۂ تراجم مشرقیہ کی فہرست سے اخبارات کے ناموں کا ایک خاکہ پچھلے صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے، بااین ہمہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فہرست بھی مکمل ہے۔ خوش قسمتی سے مذکورہ فہرست میں سے متعدد اخبارات کے فائل مجھے دستیاب ہوگئے۔ ان فائلوں کے مطالعے سے، معاصرانہ نوک جھونک، آپس کی چھیڑ چھاڑ یا تنقید و تبصرے کے ضمن میں بھی بعض اخبارات کے نام معلوم ہوئے، ان کی مختصر فہرست یہ ہے :۔

(۱) 'تحفہ' غالباً ۱۸۹۴ء
(۲) 'درافشاں' " ۱۸۹۴ء
(۳) 'نجم الاخبار' " ۱۸۹۴ء
(۴) 'آئینۂ ہند' " ۱۸۹۵ء
(۵) 'قاسم الاخبار' " ۱۸۹۶ء
(۶) 'مسلم' " ۱۸۹۶ء
(۷) 'گل زارِ سخن' " ۱۸۹۳ء

مذکورہ اخبارات کی اشاعت اور حیثیت

اُوپر کی سطروں میں جن اخبارات کا ذکر ہوا، ان میں سے چند پر مختصر تبصرہ مع نمونہ تحریر میں آگے چل کر پیش کروں گا، لیکن عام تعارف کی غرض سے یہاں اتنا لکھنا مناسب ہو کہ یہ اخبارات بالعموم کتابی سائز پر نکلتے تھے، خواہ روزانہ ہوں یا ہفتہ دار، زیادہ سے زیادہ ضخامت ۱۶ صفحات پر ہوتی تھی اور کم سے کم ۴ صفحات۔ اشاعت بالعموم ایک سو سے لے کر پانچ سو تک محدود ہوتی تھی۔ کتابت ناقص، کاغذ خراب، چھپائی باصرہ شکن۔

خبریں بہت کم ہوتی تھیں، اور جو کچھ ہوتی تھیں وہ احوال اور اخبار سے زیادہ عجائب و غرائب پر مشتمل ہوتی تھیں، یا ذاتی نوک جھونک ہوتی تھی، اندازِ کلام بسا اوقات سوقیانہ ہوتا تھا، معاشرتی اور سماجی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ سیاسی خبروں پر بالخصوص ان کی تفصیلی نوعیت پر بہت کم لکھا جاتا تھا۔

خلیفۃ المسلمین سے والہانہ عقیدت، رُوس سے للٰہی دشمنی، برطانیہ کی مداخلت، یونان کی سرکشی، اور سرتابی، ریاست ہائے بلقان کی شورش، ترکوں کی بہادری اور شجاعت، ایران اور رُوس کی مخاصمت۔ ان مسائل پر، حمیتِ دینی اور غیرتِ مذہبی، اور جوشِ ملّی کا نہایت دلیری سے یہ اخبارات مظاہرہ کرتے تھے، لیکن سیاسیاتِ ہند پر، مسلمانانِ ہند کی کس مپرسی پر، حکومتِ انگلشیہ کی داخلی پالیسی پر گفتگو کرنے سے دامن بچاتے تھے۔

روزانہ اخبارات میں بھی خبریں بہت کم ہوتی تھیں، مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ مضامین کے لیے یہ ضروری نہیں تھا، کہ وہ سیاسی ہوں، علمی، اقتصادی، روحانی، طبّی، مذہبی، سماجی، معاشرتی، غرض ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے۔ مقامیات پر ذاتی نوک جھونک کے علاوہ بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔

بعض اخبارات پر تبصرے

انجمنِ اسلام اسکول (بمبئی) کی لائبریری میں، بمبئی کے بعض نہایت قدیم اخبارات و رسائل کے کچھ فائل موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے ان کے مطالعے کا موقع مِلا۔ ان میں سے کچھ اخبارات پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں، تاکہ عہدِ ماضی کے اخبارات اور بمبئی کی صحافتِ اُردو کی ایک جھلک آپ کے سامنے آجائے۔

حدیقۃ الاخبار

میرے سامنے اس وقت "حدیقۃ الاخبار" مورخہ یکم اپریل ۱۸۴۷ء کا ایک پرچہ ہے۔ اِسی سال یہ پرچہ اشاعت پذیر ہوا ہے، پہلے صفحے پر بطرزِ مثنوی ایک نظم ہے، دُوسرے پر خبریں ہیں۔

یکساں خبروں کی ایک سُرخی ہے اس ضمن کی دُوسری خبریں " ولہ " کے ماتحت دی گئی ہیں، خبروں میں اظہارِ رائے اور رقّتِ قلب کے نقوش بھی موجود ہیں، انشاپردازی اور عبارت آرائی کا جوہر بھی ہے ایک خبر کا عنوان ہے " مرگِ شوق! " عبارت یہ ہے:۔

" مورخہ ۲۶ ماہِ مارچ ۱۸۴۷ء کی صاحبِ ٹائمس آف انڈیا یہ واردات اپنے صحیفۂ سامی میں رقم کرتے ہیں، کہ ایک پارسی کوٹے میں کوُد کر ہم آغوشِ بحرِ فنا ہوا۔ بعد تحقیقات کے اہالیانِ جیوری نے فتوا دیا کہ متوفی مذکور خود بخود ہم کنارِ قلزم قضا ہوا ولہ شیخ ابراہیم و محمّد تار داؤد ساسوں کی گودی میں کچھ کام میں مشغول تھے۔ قضائے کار ان کو یکایک سخت ضرب لگی، زخمی ہوئے، فوراً ان کو جمشید جی جی جی کے دارالشفا میں لے گئے ــــــــــــــ "

" پاداشِ تقصیر " کے عنوان کے ماتحت متعدد خبریں درج ہیں، تین ملاحظہ ہوں:۔

" صاحبِ ٹائمس آف انڈیا کے ۲۸ مارچ کے صحیفۂ سامی سے واضح ہوا، کہ ایک کم سن لڑکی کھڑکی میں سے گرِگئی، جس سے اس کے سینے میں ضربِ شدید پہنچی۔ حضرت حکیم علی الاطلاق جلد شفا بخشے! " ولہ دو بچے ہندُزاد کم سن قریب دیرے کے ایک لوہے کی پتّی سے بازی کر رہے تھے۔ قضائے کار پتّی ان کے

ہاتھوں سے چھوٹ گئی، اور ان کو بھی ضرب لگی۔ حدیقۃ الاخبار۔ ہم اپنے بھائی ہم وطنوں کو تاکید کرتے ہیں، اس قدر تغافل نہ کریں حتی المقدور غافل نہ رہیں۔ دلہ ماہ مارچ کی ۲۵ تاریخ کو یہ انکشاف ہوا کہ ہرمزجی پسٹن جی پریس میں کچھ کام کر رہا تھا قضائے کار ایک لوہے کا ٹکڑا اس کے پاتو پر گر گیا اور اس سے اس کو نہایت صدمہ پہنچا، اسی دم اوس کو استخواں ساز کے پاس لے گئے۔!"

یہ خبریں بھی ہیں اور ایڈیٹوریل نوٹس بھی، خبر کے ساتھ حکیم علی الاطلاق سے دعا بھی ہے، ہم وطن بھائیوں کو نصیحت بھی ہے۔

اس سلسلے میں چند خاص باتیں قابلِ غور ہیں:۔

(۱) انگریزی اخبارات کو 'حدیقۃ الاخبار' کی اصطلاح میں معاصر کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے نام کے پہلے "صاحب" کا لفظ ایزاد کردیا جاتا ہے۔ مثلاً "صاحبِ ٹائمس آف انڈیا" "صاحبِ پانیر" وغیرہ۔

(۲) کنواں کو، کوا، لکھا گیا ہے۔

(۳) فتویٰ کے بجائے فتوا، املا کی یہ وہ اصلاح ہے، جسے انجمن ترقیِ اردو (ہند) جاری کرنا چاہتی ہے، مثلاً اعلیٰ کے بجائے اعلا۔

(۴) ہسپتال کے لیے دارُ الشفا استعمال ہوا ہے۔

(۵) مندر کو دیر سے یاد کیا ہے۔

(۶) کھیل کود کے بجائے بازی لکھا ہے۔

(۷) "بون سِٹر" (BONE SETTAR) کا بہترین ترجمہ "استخوان ساز" کیا ہے۔

۱۲ مئی ۱۸۷۴ء کے حدیقۃ الاخبار میں، ایک بڑی دلچسپ خبر شائع ہوئی جو درج ذیل ہے:۔

"گوالیار کے مہاراجہ نے زمانۂ پیشین میں ایک عورت ہندو خوب صورت پری رو بطور داشتہ کے رکھی تھی اور اس کے دو لڑکے بھی پیدا ہوے تھے جو فی الحال نوجوانی کو پہنچے ہیں۔ تھوڑے دن کا عرصہ ہوا کہ مہاراجہ اور اس عورت کے درمیان بے اتفاقی واقع ہوئی اور بسبب نااتفاقی کے وہ عورت مہاراجہ کو چھوڑ کے شہر لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئی، اور وہاں مسلمان ہوگے ایک مسلمان کے ساتھ نکاح کیا اتفاقاً ان دنوں میں بطورِ

سیر کے مہاراجہ کا لکھنؤ میں گزر ہوا ، اور وہاں یہ بات اس کی سماعت میں آئی کہ میری داشتہ یہاں آئی ہے اور مسلمان ہو کے کسی مسلمان کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے، مہاراجہ کو ازسرِ نو عشق پیدا ہوا غلبۂ شوق میں دیدار کا تمنا ہوا ، عقلِ سلیم پابہ زنجیر ہوئی ۔ آرزومند زلفِ مشکیں گلوگیر ہوئی ، آتش رخسار شمع رُو نے رشکِ پروانہ بنادیا ، دلِ شیدا کو ، کہ مدت تک اس لیلیٰ عذار کے ساتھ رہا، مانندِ مجنوں کے دیوانہ بنادیا آخر اس کے گھر جانے کا ارادہ کیا ہر چند مصاحب مانع ہوئے کہ جانا آپ کا اس کوچے کی طرف باعثِ درد و خجلت بلکہ موجب ہتکِ عزت ہے، کسی کا کہنا نہ مانا بلکہ کوئے جاناں میں جانے کو جان سے عزیز جانا قصہ کوتاہ چند سپاہی ساتھ لے کر اس گھر کے قریب پہنچے اور عورت کو بہ جبر گھر سے نکال کر اس مقصد میں تھے کہ اپنے گھر لے جاویں ، اہالیانِ پولیس کو خبر ہوئی ، انھوں نے زنِ مذکورہ کو چھڑایا اور مہاراجہ صاحب کو وہاں سے مکان تک پہنچایا جب کمشنر پولیس مسٹر نیویری صاحب کو خبر ہوئی تب صاحب مذکور نے لکھنؤ سے کوچ کرنے کا حکم دیا ، دوسرے دن مہاراجہ صاحب اسپیشل ٹرین میں سوار ہو کر لکھنؤ سے سدھارے ، خلافِ عقل و تدبیر بازی ہارے ——— "

اس عبارت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری خبر میں کوئی نیا پیراگراف استعمال نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خبریں کس طرح فصاحت و بلاغت کے دریا میں غوطہ دے کر شائع کی جاتی تھیں۔

یہ اخبار رائل سائز کے چار صفحوں پر نکلتا تھا ! خبروں کا کام اداریے سے اور اداریے کا کام خبروں سے لیا جاتا تھا ۔

'مخبرِ سرور'

یہ اخبار بھی چار صفحات پر شائع ہوتا تھا ، ملکی خبریں بہت کم ہوتی تھیں ۔ عالمِ اسلام کی بالعموم اور دولتِ عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کی خبریں بہت ہوتی تھیں ۔

۹ر نومبر ۱۸۷۶ء کا پرچہ میرے سامنے ہے نمونۃً اداریہ درج کیا جاتا ہے :۔

"کلکتہ کی رہنے والی ایک ضعیفہ، نیک اطوار نے جب سُنا کہ کلکتہ میں مجروحین و یتیم و بیوگانِ شہدائے عساکرِ سلطانی کے واسطے رُپیہ جمع ہوتا ہے ، اور سلطان خلد اللہ ملکہٗ کی فوج کفار نمک حرام سے برسرِ مقابلہ ہے ، تو فوراً اُٹھی اور اپنے ہاتھ کے کنگن طلائی جو اس نیک ذات نے اپنے کفن کے خرچ کو رکھ چھوڑے تھے لے جا کر انجمنِ عام کلکتہ کے نذر کیے اور بولی کہ یہ رُپیہ مَیں نے راہِ خدا میں عساکرِ سلطان کے مجروحین وغیرہ کو دیا ۔

ازاں جملہ ایک دوسری عورت بھی آئی اور ایک ہزار رُپیہ لاکر اہالیانِ انجمن کو تسلیم کیا۔
آفریں صد آفریں ان نیک بخت عورات کی ہمّتِ مردانہ کو سچی دِل سوزی اسی کا نام ہی، کلکتہ میں بیس ہزار اور بڑودہ میں پانچ ہزار رُپیہ چندے کا جمع ہوا۔"

خبریں اس اخبار میں بھی کم ہوتی تھیں مضامین زیادہ، لیکن اس اخبار کی خبروں اور مضمونوں میں عبارت آرائی کم ہوتی تھی، عموماً زبان صاف اور سادہ استعمال کی جاتی تھی۔

'عندلیبِ ہند'

یہ اخبار ——— 'حدیقۃ الاخبار' اور 'مخبر سرور' کے مقابلے میں زیادہ مکمّل اخبار تھا، ضخامت بارہ صفحات کی تھی، خبریں بھی کافی ہوتی تھیں، تجارتی اشتہارات کی بھی کثرت تھی، واقعات اور مسائل پر ایڈیٹوریل بھی لکھا جاتا تھا، پالیسی مرنجاں مرنج تھی۔

۱۔ اپریل ۱۸۸۱ء کے پرچے میں نئے زارِ روس کی تخت نشینی پر ایک اداریہ لکھا گیا ہی، جس سے اخبار کی پالیسی، اسلوبِ نگارش، اندازِ غور و فکر پر روشنی پڑتی ہی۔ افتتاحیہ یہ ہی:۔

"شاہِ روس ابھی نوجوان بادشاہ ہی جس کے دِل میں مدّتوں سے منصوبے گٹھ رہے ہیں، جن کی تعمیل سے وہ بوجہ مزاحمتِ پدری قاصر تھا اب ضرور انتظامِ باغیاں سے فارغ ہوکر بروئے کار آئیں گے۔ اور بعض سلطنتوں میں کھڑ بھڑ مچائیں گے۔ کس لیے کہ یہ قاعدۂ مستمرہ ہی کہ ہر بادشاہ جب نیا نیا تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوتا ہی تو وہ خواہ مخواہ اپنی نام آوری اور علوہمّتی جتانے کے واسطے کچھ نہ کچھ کارروائی کیا ہی کرتا ہی مثلاً جب شاہ نکلس نے بعد معرکۂ سیاستی پول نقضا کی اور زار مرحوم اپنے باپ کے جانشین ہوئے تو انھوں نے یومِ تخت نشینی سے تا روزِ مرگ کیسے کیسے ہاتھ پانو پھیلائے، اب زارِ حال بھی بقولکہ ؏

ہر چہ پدر نہ تواند پسر تمام کند

اولوالعزمی کے جوہر دکھائیں گے اور جو خیالات کہ پیش نہادِ خاطر ہیں وہ قوت سے فعل میں لائیں گے۔"

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تجارتی، اور موسمی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ عبارت عام فہم اور رواں ہوتی تھی، روس اور ممالکِ اسلامیہ کی آویزش، ترکی اور فرانس کی چپقلش اور دوسرے بین الاقوامی معاملات و مسائل پر نسبتاً آزادی سے یہ اخبار بحث و گفتگو کرتا تھا۔

خیرخواہِ اسلام

یہ اخبار آٹھ صفحات پر شائع ہوتا تھا، اس میں کافی خبریں ہوتی تھیں، لیکن غیر اہم، جتنی غیر اہم اتنی ہی مفصّل بھی۔ بعض دلچسپ خبریں بھی شائع ہوتی تھیں مثلاً ۲۵ر مارچ ۱۸۸۷ء کے پرچے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے:۔

"پورٹ بلیر کا موسم نہایت عمدہ معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ وہاں کے لوگوں کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ جوبلی کے دن جو قیدی رہا ہوئے تھے اُن میں کئی باشندے حیدرآباد کے ہیں، جو قریب سو برس کے گزرے کہ علتِ ڈکیتی میں حبسِ دوام کے لیے قید ہوئے تھے، اور اب وہ رہا ہوئے ہیں۔"

اس خبر کے عجیب پہلو یہ ہیں کہ

(۱) ڈکیتی کے الزام میں اس زمانے میں حبس دوام کی سزا ہوتی تھی۔

(۲) حبسِ دوام کے قیدی سو سو برس تک جیل میں رکھے جاتے تھے۔

(۳) عمریں کم و بیش سوا سو برس کی ہوتی ہوں گی۔

اس اخبار میں اداریہ شاذ و نادر ہوتا تھا۔ مراسلات کی کثرت ہوتی تھی۔ طبّی اور روحانی اور مذہبی مضامین بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔

۸ر جنوری ۱۸۸۸ء کے پرچے میں انجمنِ اسلام احمد آباد کا وہ سپاس نامہ شائع ہوا ہے جو "حضور فیض گنجور نواب گورنر صاحب بہادر بمبئی بہ القابہ ادام اللہ شوکتہٗ" کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔

خاص بات یہ ہے کہ گورنر کو یہ سپاس نامہ فارسی زبان میں دیا گیا تھا۔

'مخبر'

یہ بھی ہفتہ وار شائع ہوتا تھا، اس میں مُلکی اور غیر مُلکی خبریں کم ہوتی تھیں مقامی یعنی بمبئی کی خبریں زیادہ سے زیادہ ہوتی تھیں یہ ضروری نہیں تھا کہ ہر پرچے میں اداریہ ہو، اور جس پرچے میں اداریہ ہو تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کا کوئی عنوان بھی ہو۔

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں مضامینِ خاص، مراسلات، منظومات وغیرہ کی

بھرمار نہیں ہوتی تھی۔

۳۰؍اکتوبر ۱۸۹۱ء کے پرچے میں ایڈیٹر نے لیورپول کی مجوزہ مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں ایک پُرزور افتتاحیہ لکھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ مسٹر عبداللہ کوئیلم کی ضروری امداد کریں، تاکہ یہ مسجد جلد از جلد تعمیر ہو سکے۔

'عالم افروز'

یہ ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا، یہ انجمنِ امامیہ کا آرگن تھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ ریاستی ہند کے واقعات پر بھی تبصرے کرتا تھا۔

اس اخبار میں بھی خبروں سے اداریے کا اور اداریے سے خبروں کا کام لیا جاتا تھا۔

یہ شیعہ اخبار تھا، لیکن "سنی شیعہ" تنازعات کا علم بردار نہیں تھا، مُلکی اور غیر مُلکی سیاسیات میں ایک مسلمان کی حیثیت سے رائے دیتا تھا، البتہ نواب محسن الملک سے بہت خفا تھا ان کے خلاف اس اخبار کی زہر چکانیاں شائستگی اور تہذیب کے حدود سے بھی گزر گئی تھیں۔

اس اخبار میں تجارتی اشتہارات کافی ہوتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت معقول تھی۔

۲۰؍دسمبر ۱۸۹۳ء کا پرچہ میرے سامنے ہے، اس میں والیانِ ریاست کے سفر و سیر اور گل گشتِ فرنگ پر بڑے سخت الفاظ میں لے دے کی ہے یہ اخبار اس کا سخت مخالف تھا کہ والیانِ ملک اپنی رعایا کی گاڑھی کمائی سیرِ فرنگ میں برباد کریں، مہاراجہ بڑودہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"سُنا جاتا ہے کہ اس مرتبہ مہاراجہ صاحب بڑودہ دو برس تک ولایت میں رہیں گے، ۲۵ لاکھ رُپے سالانہ کا تخمینہ ہوا ہے۔ غرض کہ ولایت کی سیر میں ۵۰ لاکھ پہ پانی پھر جائے گا۔"

نواب صاحب رام پور کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"آج کل آپ انگلستان کے دیہات میں مقیم ہیں جہاں آپ شیروں اور خرگوشوں کا شکار کرنے والے ہیں، ہمارے نزدیک اپنے ملک میں اگر یہ شکار کھیلتے تو بہت کم خرچ ہوتا!"

اپنے اداریوں میں بڑی سوجھ بوجھ کی باتیں یہ لکھتا تھا۔ اُس زمانے میں ہندستان کے لوگ بڑے

شوق سے بیرسٹری پاس کرنے انگلستان جایا کرتے تھے، یہ اخبار اس قسم کے مسافروں کو مخاطب کر کے لکھتا ہے :-

" بیرسٹر تو ہمارے ملک میں بہتیرے ہیں، ہندستان کو تو اس وقت ضرورت ایسے لوگوں کی ہے، جو یورپ کی صنعت وحرفت میں کامل دست گاہ رکھتے ہوں!"

اس اخبار میں لطیفے بھی درج ہوا کرتے تھے ایک لطیفہ ملاحظہ ہو :-

"کسی جلسے میں ایک جرمن صاحب شیخی بگھار رہے تھے کہ جرمنی زبان سب سے قدیم اور پاک ہے۔ چناں چہ بہشت میں حضرت آدم بھی یہی بولتے تھے ایک ظریف مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے یہ بات کاٹ کر بولے، جب ہی بہشت سے نکالے گئے تھے!"

ملکہ وکٹوریہ کی بیوگی کے بعد ایک خبر اس اخبار میں شائع ہوئی تھی جو شاید آج بھی دل چسپی سے خالی نہ ہو :-

"حضور ملکہ معظمہ نے اپنے شوہر عالی قدر پرنس البرٹ آں جہانی کے مرقد کے بائیں طرف اپنی آرام گاہ تیار کروا رکھی ہے پرنس البرٹ کا پتلا اس قبر کی داہنی طرف جنگی لباس زیب بر کیے ہوئے قائم کیا گیا ہے اور ایک گوشے میں پر پھیلائے فرشتوں کی تصاویر کندہ ہیں، حضور ممدوحہ نے جو کتبہ اپنی آخری آرام گاہ کے قریب نصب کرایا ہے اس کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔ میرے پیارے خوش رہیے، آپ کی بہبودی ہو آخر کار میں بھی آپ کے جوار محبت میں آسایش دائمی کے لیے آؤں گی اور خداوند عیسیٰ مسیح کے ساتھ جن کا جلال ابدی اور بے زوال ہے، میں اور آپ باہم جا کر ملیں گے!"

"محمڈن ہیرالڈ"

چھوٹے سائز کا آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ ایک صفحہ انگریزی میں شائع ہوتا تھا، خبریں کم ہوتی تھیں، مختلف معاملات و مسائل پر چھوٹے چھوٹے نوٹ ہر ہفتے دیئے جاتے تھے۔

طرز نگارش اور اس زمانے میں بمبئی کی مالی حالت کا سرسری جائزہ لگانے کے لیے ۱۳ر جنوری ۱۸۹۳ء کا یہ اداریہ ملاحظہ ہو :-

"سرکاری رپوٹ سے معلوم ہوا کہ بمبئی پریسیڈنسی کی کل آمدنی سال گزشتہ میں چار لاکھ پانچ ہزار تھی

۲½ لاکھ سے زیادہ رُپیہ سوداگروں سے وصول ہوا، اہلِ پیشہ سے ۴۸۱۸۳ ۴۸ پی، دُکان داروں سے ۴۴۰۵۰۰، کارخانوں سے ۲۵۱۵، مالکانِ جائداد سے ۸۹۴، باربرداری والوں سے ۹۵۴۰، ملازمت پیشہ سے، ۱۱۴۰۳، کمپنیوں سے ۱۸۰۹۲، سودی کاغذ سے ۲۲۶۹ ---!"

آج کی سرکاری آمدنی کو ۱۸۹۳ء کی آمدنی سے کوئی نسبت ہو؟

'مسلم ہیرالڈ'

یہ روزانہ اخبار تھا، کتابی سائز کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا ایک صفحے میں دو کالم ہوتے تھے۔
اس روزانہ اخبار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پہلے صفحے پر "خبروں کا چمن" عنوان کے ماتحت بھانت بھانت کی خبریں غایت درجہ اختصار کے ساتھ یعنی ایک ایک دو دو سطروں میں دی جاتی تھیں، باقی سات صفحے مقالات، ادارات، مراسلات، منقولات، مضامین ناس، تجربات خصوصی، غزلیات نقد و تبصرہ وغیرہ کے لیے وقف تھے۔

۲۷ جولائی ۱۸۹۴ء کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہو:-

"نارتھ ویسٹرن ریلوے کمپنی اپنی اوّل درجے کی تمام گاڑیوں میں وہ آلہ نصب کر رہی ہیں جس کے ذریعے سے مسافر لوگ ٹرین کی چلنے کی حالت میں ریل روکنے کی استدعا کے اس کو روک سکتے ہیں!"

معلوم ہوتا ہو کہ ابھی تک یہ جدّت ان، ڈبلو، آر ہی تک محدود تھی، دوسری ریلوں میں گاڑی روکنے کی زنجیر نہیں لگائی گئی تھی، کیوں کہ چند روز ماقبل کی ایک اشاعت میں اس اخبار نے ریلوے کے مسافروں کے لیے کچھ ہدایتیں شائع کی ہیں، ان میں ایک یہ تھی کہ اگر کسی وجہ سے چلتی ہوئی گاڑی رُکوانی ہو، تو اُس کی ترکیب یہ ہو کہ سُرخ یا سفید رومال گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اس وقت تک ہلاتے رہو جب تک گارڈ نہ دیکھ لے وہ یہ منظر دیکھتے ہی گاڑی روک لے گا۔

اس اخبار میں ایک جدّت یہ بھی ہوتی، کہ پہلے صفحے پر اندر کے تمام مضامین کی فہرست بھی دے دی جاتی تھی۔

'بشیر الملک'

یہ ہفتہ وار اخبار تھا، رائل سائز کے چار صفحوں پر نکلا کرتا تھا ریاستی معاملات پر بھی تنقید کرتا

تھا یہ تنقید کہیں کہیں تخویفِ مجرمانہ کی صورت بھی اختیار کرلیتی تھی۔

خبریں نہ ہونے کے برابر، مضامین بہت طول طویل، اندازِ بیان سلجھا ہوا عبارت نہ مقفا نہ رنگین سادہ، صاف، عام فہم۔

بعض پرچے اداریے کے بغیر شائع ہوتے تھے، کبھی کبھی ایک کالم نقد و تبصرے کا بھی بڑھا دیا جاتا تھا اس اخبار کے چند پرچے (اگست ۱۸۹۴ء) میرے سامنے ہیں

'کشف الحقائق'

یہ سولہ صفحے کا ایک ماہ وار رسالہ تھا، یہ دینِ مسیحی کا مبلغ تھا، زیادہ تر مذہبی مقالات شائع ہوتے تھے، جن میں اسلام کے عقائد پر جرح کرنے کی، اور دینِ مسیحی کو دُنیا کا برحق دین ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مضامین رُوکھے پھیکے ہوتے تھے!

'آئینۂ ہند'

ہفتہ وار اخبار تھا برطانی ہند اور ریاستی ہند کے معاملات اور مسائل پر سیرِ حاصل بحثیں کیا کرتا تھا، اس پرچے میں خبروں کے خلاصے بھی شائع ہوتے تھے یہ اخبار والیانِ ریاست کی معزولی اور ریاستوں کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا مخالف تھا اور اس سلسلے میں برابر حکومت پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔

کاغذ نہایت خراب، کتابت اور طباعت اس سے بدتر، کئی برس تک یہ اخبار جاری رہا ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۷ء تک کے پرچے میری نظر سے گزرے اس سے اندازہ ہوتا ہو کہ اس نے اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا اس میں اس کی کافی قدر تھی۔ ضخامت وہی چار صفحے، کبھی کبھی ضمیمہ مستزاد!

'انڈیا گزٹ'

ہفتے میں ایک بار شائع ہوتا تھا۔ ضخامت ۴ صفحے، ایک صفحہ خبروں کے لیے وقف تھا، باقی تین صفحوں میں مضامین اور مراسلات شائع ہوتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ادارتی نوٹ بھی مختلف معاملات اور مسائل پر شائع ہوتے رہتے تھے۔

اس اخبار میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کبھی کبھی کارٹون بھی شائع ہوتے تھے،

خبروں میں کوئی تنوع نہیں ہوتا تھا، زیادہ تر منقول ہوتی تھیں اور کچھ شخنی سنائی، زبان صاف اور سادہ استعمال کی جاتی تھی۔

ملکی معاملات پر یہ سوچ سمجھ کر اظہار رائے کرتا تھا، کانگریس کا مخالف تھا۔ لیکن کانگریسی رہنماؤں کے باہمی اختلاف (۱۸۹۵ء) نے جب یہ نوبت پہنچادی، کہ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا، اور اینگلو انڈین اخبارات نے کانگریس والوں کا مذاق اُڑانا شروع کیا تو اس سے ضبط نہ ہوسکا، اس نے لکھا:۔

"اینگلو انڈین اخبارات کے ہاں گھی کے چراغ جل رہے ہیں کہ نیشنل کانگرس کے ممبروں میں پھوٹ پڑگئی ہے اور جب یہ نااتفاقی اس درجے تک پہنچ گئی ہے کہ پولیس میں دھوٹا دھاڑی کی نوبت آئی تو مخالفوں کو کیوں نہ خوشی ہو، گو مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اہلِ ہنود کے اغراض میں خلل واقع ہوتا ہوا دیکھ کر انھیں بھی افسوس ہوتا ہے! ——"

اس اخبار کے ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۶ء تک کا فائل میری نظر سے گزرا ہے اس میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ایک کالم "لوکل" کے عنوان سے مقامیات کے لیے مخصوص تھا

'بمبئی پنچ بہادر'

ہفتے وار اخبار تھا، فکاہی اور ظریفانہ مضامین پر مشتمل ہوتا تھا، خبریں بھی ظریفانہ رنگ میں چھپتی تھیں، جن میں ضلع جگت اور رعایتِ لفظی کا خیال خاص طور سے رکھا جاتا تھا پہلے اس کے ایڈیٹر کوئی صاحب عبدالصمد تھے، پھر عبدالحمید فرخ نے اس کی عنانِ ادارت سنبھال لی۔ یہ مرحوم سید جالب ایڈیٹر 'ہمدرد' اور 'ہمدم' کے بھائی تھے۔

۱۳ مئی ۱۸۹۶ء کے پرچے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو:۔

"زارِ روس ہندستان کے سبز باغ دیکھ کر خار کھائے بیٹھا ہے، اس غم میں زار ہوگیا مگر اس کے مزرعۂ دل میں اس گل زار کی کشتِ ہوس ہری بھری ہے سب راستوں سے ہار گیا تو ہرات کی راہ کو منزلِ مقصود کا راستہ سمجھا، چناں چہ زمینی آنتوں (ریلوے لائن) کی لین ڈوری ڈال دی ہے!"

یہ تو خبر کا نمونہ ہوا، اب ذرا اداریے کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سوڈان میں شورش ہو رہی

ہے اور برطانوی حکومت اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے، "سوڈانی گڑبڑ" کے عنوان سے یہ اخبار لکھتا ہے:۔

"سوڈان میں گڑبڑ مچنے والی ہے، اس لیے ٹڈی دل فوج ہندستان سے روانہ کردی گئی ہے۔

ہم کو اس بات کی بڑی ادھیڑبن لگی ہوئی تھی کہ سیہ نصیب کالے آدمیوں کو ہر جگہ سب سے پہلے کیوں بھیجا جاتا ہے؟ مدت مدید کے بعد یہ عقدہ کشا ہوا کہ اگر ناز پروردہ گوروں کو لڑائی میں بھیجا جائے تو وہاں کی سختیوں اور گرمی کی شدت سے ان کا رنگ بھی سیاہ بھونڈا ہوکر چہرے ولایتی بوٹ بن جائیں۔ پھر کالے، گوروں میں تمیز ہی کیا رہے؟ کالی رعایا کو گورمنٹ نے گوروں کا کفارہ سمجھ رکھا ہے، عقبیٰ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ دھڑلے سے جو چاہیں کریں، گویا دین کے تمام مزے اللہ نے انھی کے لیے بنائے ہیں، اب رہا دنیاوی کفارہ، اس کے لیے یہ کالی بھیڑیں (ہندستانی) موجود ہی ہیں۔ مثل ہے گھر کی مرغی دال برابر عجب جاہا گردن مرڈری اور ڈکار نگئے!"

۲ر اگست ۱۸۹۷ء کے پرچے میں کریٹ کی شورش پر ایک اداریہ لکھا گیا:۔

"یہ اور شگوفہ کھلا چوں کہ یہ لوگ بھی عیسائی ہیں اس لیے ہماری گورمنٹ کا بہت بڑا حق ہے کہ بغاوت کرنے میں ان کی مدد کرے مگر ایسا نہ ہو کہ ہماری گورمنٹ انجن چھوڑ گسیٹن میں پڑ جائے کیوں کہ سوڈانیوں کا نمونہ دیکھ ہی لیا کہ ایسی قلیل تعداد وحشیوں کی جماعت نے ہماری طرف کے بڑے بڑے بہادروں کا منھ پھیر دیا۔ خفت مٹانے کے لیے خواہ کچھ ہی مشہور کردیا جائے مگر ع

ای داغ دِل جانتا ہے کسی کا!

پتلونیں ڈھیلی ہوگئیں، بڑے بڑے صاحب بہادر سوچ رہے ہیں کہ کس مصیبت میں آپھنسے کہ دانہ پانی تک بند ہوگیا ہے۔ جب اس ناشایستہ فوج نے ہماری شایستہ فوج کے چھکے چھڑا دیے تو ترک بھائی جنگ شایستگی کے مُتپلے ہیں، لڑائی کے لیے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں، گورمنٹ زرا سوچ سمجھ کے دست اندازی کرے تو بہتر ہے۔"

اس اخبار میں ظریفانہ شاعری کے نمونے بھی شائع ہوتے رہتے تھے بمبئی کی خاص الخاص عوام پسند زبان میں ایک غزل شائع ہوتی ہے۔ ضرور سنیے ؎

چھاکٹ جو ہوکے اوٹے یہ تیرے پڑیلا ہوں
(پڑا)

دو باٹلی سے آج زیادہ پٹیلا ہوں
(بوتل)

مجرا جو مُن کے نوٹ مَیں اس کو دِٹیلا ہوں
دیتا

کس وٹ کے ساتھ ہسے لپٹ کے لٹیلا ہوں
شان

چل چال آج حال مرا پوچھتا ہی کیا

جانی ترے فراق میں مر کر جئیلا ہوں
جیا

آتے نہیں اوالی موالی اٹھانے کو

دارو مَیں آج پی کے گٹر میں پڑیلا ہوں
نالی　پڑا

کبھی تو دیکھ لیں گے وہ باڑی سے جھانک کر
احاطہ

مَیں جھاڑ کی طرح سے سڑک پر گڑیلا ہوں
گڑا ہوا

چندی بزار چار بجے روز شوق سے

کھاتا مَیں خوب ناند سے بھونبلی تلیلا ہوں
مچھلی　تلی ہوئی

بے ڈیرلے کے کام نکلتا ہی اس لیے
کوڑی پیسہ

رانڈاں یہ جانتی ہیں کہ مَیں سرپھریلا ہوں
رنڈیاں　سرپھرا ہوا

جو کام چاہتے ہو وہ لیتے ہو مجھ سے تم

بالا فکٹ کا ہاتھ تمھارے لگیلا ہوں
لڑکا مفت کا　لگا

اردو محاورے کے ہوں کس طرح اپنے شعر

لوفر مَیں مبئی میں تو پیدا ہویلا ہوں
ہوا

پنچیانہ رنگ میں یہ اخبار، دوسرے کی بالعموم اور ہم رنگ معاصرین کی بالخصوص پگڑیاں اُچھالنے میں بڑا دلیر تھا۔ ایسے مواقع پر اندازِ تحریر ضرورت سے زیادہ سوقیانہ اور عامیانہ ہوجایا کرتا تھا۔

'مظلوم دکن'

یہ بھی ہفتے وار اخبار تھا، بمبئی سے شائع ہوتا تھا، اور سیاسیاتِ حیدرآباد دکن کے لیے مخصوص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر صاحب کو ریاست حیدرآباد سے، اس کے عہدے داروں سے، اس کے وزیروں اور امیروں سے، اس کے فرماں روا سے سخت دشمنی تھی۔ ایسے تیز تند، ناشایستہ اور عریاں، توہین آمیز اور اشتعال انگیز مضامین یہ اخبار شائع کرتا تھا کہ حیرت ہوتی ہے یہ زندہ کیوں کر رہا؟ آج کہ آزادیٔ تحریر و تقریر نسبتاً پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ حاصل ہے اس قسم کے مضامین اگر کوئی اخبار شائع کرے تو وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اس اخبار نے بڑی دیدہ دلیری سے حضورِ نظام پر یہ الزام لگایا کہ وہ درپردہ روس سے سازباز کیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ نظامِ دکن کی ذاتی مصروفیات پر بھی سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک پر نہایت مکروہ الزامات عائد کیے۔ ۱۰ اگست ۱۸۹۶ء کے پرچے میں اس نے خاص طور پر حیدرآباد کی حکومت کو ہدفِ مطاعن بنایا ہے۔

اس بے باک گوئی اور آزادنویسی کے باوجود حیرت ہے کہ حکومتِ دکن یا حکومت بمبئی نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس اخبار سے اس سلسلے میں جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ صرف یہ ہے:۔

"دیکھنے والے حیران ہیں کہ قیصرِ ہند اور ایک اخبارچی دونوں برابر خم ٹھونک رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دُنیا میں اس سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہے جو پبلک کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔"

(مظلوم دکن ۱۰ اگست ۱۸۹۶ء)

اس اخبار کی بے باکی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے سرِ ورق پر "ضوابطِ اخبار" کے عنوان سے چند ضابطے درج کیے ہیں، جن میں سے پہلا ضابطہ یہ ہے:۔

"نامہ نگاروں کو عام اجازت ہے کہ جو چاہیں، وہ لکھیں، ذمے دار ہم ہیں!"

اس اخبار کی ضخامت آٹھ صفحات تھی، کاغذ خراب، کتابت طباعت معمولی۔

'سفیر'

یہ اخبار ہفتے میں دو بار نکلتا تھا، کافی عرصے تک جاری رہا۔ دو سال کی جلدیں (۱۸۹۶ء، ۱۸۹۷ء) میری نظر سے گزریں۔ یہ پرچہ بہت سنجیدہ مضامین شائع کرتا تھا۔ ذاتی مناقشات سے اخبار کے پیٹ بھرنے کا عادی نہیں تھا۔ ملکی، ملی، مذہبی معاملات پر نہایت جچی تُلی رائے ظاہر کرتا تھا۔

اس کی ضخامت ۴ صفحات تھی لیکن ان چار صفحات کا نہایت مناسب استعمال کیا جاتا تھا۔ خبریں بھی اس زمانے کے عام معیار کے مطابق اچھی خاصی دی جاتی تھیں، مضامین بھی خاصے ہوتے تھے، اداریے میں اہم معاملات پر نہایت ثقاہت اور سنجیدگی سے اظہارِ رائے کیا جاتا تھا۔

'سلطان الاخبار'

یہ روزانہ اخبار تھا، کتابی سائز پر شائع ہوتا تھا، ایک صفحے میں دو کالم ہوتے تھے ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔

زیادہ سے زیادہ دو کالم خبروں کے لیے وقف تھے، باقی ۷ صفحات مضامینِ خاص، مراسلات، رزمیہ، منظومات اور مقالاتِ ادارت کے لیے وقف تھے۔ ترکی حکومت اور خلیفۃ المسلمین سے اس اخبار کو بھی والہانہ شیفتگی تھی۔

یونان کی سرکوبی کے لیے جب ترکی فوجیں البانیہ اور اناطولیہ سے نکلیں اور کام یاب و کامراں ہوکر آگے بڑھنے لگیں، تو ۶ جولائی ۱۸۹۷ء کے اخبار میں اس نے ایک اداریہ "ترکی فوج" کے عنوان سے لکھا، اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو ؎

یہ ترکانِ طرّار کی فوج ہے　　　کہ شیرانِ خوں خوار کی فوج ہے
بلا ہے قیامت ہے آفت ہے یہ　　　کہ اعمالِ دشمن کی شامت ہے یہ
زمیں اس کے آگے سمٹ جائے گی　　　بلندی پہاڑوں کی گھٹ جائے گی
بھلا اس سے انساں لڑے کیا مجال　　　اگر جن بھی آئیں تو ہوں پایمال

ترکوں کی تلوار صاعقہ بار نے پلک جھپکتے یونانیوں کے خرمنِ ہستی کو خاک سیاہ کرکے ہوا میں اُڑا دیا۔ اٹلی انگلستان کا اور انگلستان حیرت سے فرانس کا منھ تکتا ہے، انگلش پارلیمنٹ کے ممبر گھبرائے ہوئے یونانیوں کی طرح ایک دوسرے کا منھ نوچ رہے ہیں۔

رچرڈ شیردل کے ہم وطنوں میں کسی نے جامِ شہادت نوش نہیں فرمایا، باوجودے کہ انگریزی اخبار کہتے ہیں کہ یہ جواں مرد ہر لڑائی میں سب سے چار قدم آگے رہتے ہیں مگر شجاعانِ انگلستان کو زد سے بچنے کا ایسا ڈھب یاد ہے کہ سینکڑوں بہادروں میں سے صرف چھ نے چرکا کھایا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ڈاکٹر ان خراشوں کا امتحان کرنے لگے، ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ کیوں کہ ترکوں کے لگائے ہوئے گھاؤ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں' ان شیروں کے شمشیروں کے زخم میں ٹانکا نہیں لگتا، چلو یہ کیا تھوڑا ہے کہ ان سینہ زوروں سے پیچھا چھڑا کر صحیح سلامت انگلینڈ میں پہنچ گئے۔ زندگی رہی تو سوڈان کے وحشیوں' یا سرحد کے پٹھانوں یا برہما کے نامرادوں سے لڑ بھڑ کر بیس بیس تمغے لٹکالیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دغابازی اور جعل سازی دوسری بات ہے ورنہ فرنگی اور ترکوں کا مقابلہ لاحول ——— یورپ کی شجاع ترین قوم کے شجاع ترین زمانے کا شجاع ترین جرنیل (نپولین) آج سے سو برس پہلے کہہ گیا ہے کہ ترکوں کی تلوار فرنگیوں کی سنگینوں سے کہیں زیادہ غارت گر ہے! ترک ——— ! محاوراتِ فرنگ میں "تلوریے کو کہتے ہیں

REGULAR TURK ' یورپین شمشیرزن کی انتہائی تعریف ہے!"

اس اداریے سے اس اخبار کی جرأت، حق گوئی اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر بھی عبدالحمید فرخ تھے۔

'جسٹس آف دی پیس'

یہ بھی ہفتے وار اخبار تھا، سائز بڑا تھا، ایک صفحے میں چار کالم ہوتے تھے۔ دو تین کالم خبروں کے لیے وقف تھے، باقی صرف مضامین اور مقالات، ادارت کے لیے۔

یکم نومبر سنہ ۱۸۹۶ء کے پرچے میں مشہور ترک دشمن اور اسلام آزار یورپین مدبر گلیڈ اسٹون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک شذرے میں لکھا ہے:-

"گلیڈ اسٹون کے لیے ہر طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت میں شریک ہوجائے، مگر ایک ایسے بڈھے کو سلطنت کے جنجال میں دھکیلنا بہت بڑا ظلم ہوگا۔ جب یہ سلطنت کے جھمیلوں میں پھنسے گا

تو ہمارے سلطان المعظم کی شان میں نئی گالیاں کون تراشے گا ؟ خدا جانے لوگ اسے سلطنت کے کاروبار میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں ؟ کسی کو لارڈ بیکنس فیلڈ کی یہ پیشین گوئی بھی یاد ہے کہ انگلستان کو جو سب سے بڑا صدمہ پہنچائے گا وہ پیرِ نابالغ یہی بڈھا گلیڈ اسٹون ہے!"

'مقبول عالم'

یہ ہفتے وار اخبار تھا، چھوٹے سائز کے چار صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ حسب معمول خبریں کم ہوتی تھیں مضامین پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ ۱۸۹۷ء کی جلد اس وقت پیشِ نظر ہے، لیکن کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔

'گل زارِ سخن'

بمبئی کے جرائد و صحائف کا ذکر ختم ہوا لیکن یہ باب ختم کرنے سے پہلے میں ایک رسالے کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، اس کا نام 'گل زارِ سخن' تھا، یہ ایک ماہ وار گُل دستہ تھا۔ ہر مہینے ایک طرح دے دی جاتی تھی، اس پر شعرائے ہند طبع آزمائی کرتے تھے، وہی مجموعۂ افکار "گل زارِ سخن" کے نام سے ہر مہینے شائع ہوتا تھا، اس میں صرف غزلیں شائع ہوتی تھیں، مضامین اور مقالات کی اس میں بہت کم گنجایش تھی۔

معلوم ہوتا ہے اس گل دستے نے خاصا ادبی وقار حاصل کرلیا تھا، اس لیے کہ اس کے مشاعروں میں ہندستان کے چوٹی کے شعرا بھی شریک نظر آتے ہیں، مثلاً جلال لکھنوی، داغ دہلوی وغیرہ۔

یہ بیس صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ایک آدھ صفحہ اشتہار وغیرہ کے لیے بھی وقف ہوتا تھا۔ جنوری ۱۸۹۳ء کی طرح تھی ؎

ہمیں دِل سے پسند اپنے خریداروں کی باتیں ہیں

اچھی اچھی غزلیں شائع ہوئی ہیں، بالخصوص جلال اور داغ کی غزلیں تو بے نیازِ ستایش ہیں۔ لیکن اس مشاعرے میں بمبئی کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ گورکھ پور، آگرہ، برہان پور وغیرہ کے شعرا شریکِ بزم ہیں۔

بمبئی کی اُردو صحافت کا نیا اور شاندار دَور

۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۰ء تک بمبئی میں متعدد اُردو اخبارات نکلے، لیکن ان کی فہرست طوالت سے خالی نہیں، ان کے فائل بھی سامنے نہیں ہیں، اس لیے صحت اور جامعیت کے ساتھ رائے زنی نہیں کی جاسکتی۔

لہٰذا اس نئے دَور کا آغاز ۱۹۲۰ء سے کیا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریکِ خلافت شباب پر تھی؛ علی برادران مسلم ہندُستان کے نہ صرف مسلم ہندُستان کے بلکہ سارے ہندُستان کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔ مولانا شوکت علی مرحوم و مغفور نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بمبئی کو بنایا۔ جمعیتِ مرکزیہ خلافت کا صدر دفتر یہیں قائم کیا۔ اس طرح بمبئی مسلمانانِ ہند کی سیاسیات اور عملی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں علمائے کرام آتے تھے اور وعظ کہتے تھے، رہنمایانِ عظام تشریف فرما ہوتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، خطبائے عصر جلوہ افروز ہوتے تھے اور آتش بیانی اور شعلہ مقالی سے دِلوں کو گرماتے تھے، جلوس نکلتے تھے، جلسے ہوتے تھے، کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں۔ تحریکِ خلافت کی اہمیت سے مسلمانانِ بمبئی اور مسلمانانِ ہند کو روشناس کرنے کے لیے جمعیتِ خلافت کو ایک آرگن کی ضرورت تھی، چناں چہ پہلے ہفتے وار "خلافتِ عثمانیہ" اور بعد میں روزنامہ "خلافت" کے نام سے ایک بلند پایہ اخبار کی اشاعت شروع کردی گئی۔ غرض تقریروں سے، جلسوں سے، کانفرنسوں سے اور اخبارِ "خلافت" کے اجرا سے بمبئی میں اُردو کی نشوونما کو غیرارادی طور پر بہت زیادہ مدد مِلی۔

مولانا شوکت علی کی سیاسی خدمات سے قطع نظر، ان کی ایک یہ زبردست خدمت بھی کبھی فراموش نہیں ہوسکتی، کہ صوبۂ بمبئی میں ان کے قیام، جمعیتِ خلافت کے استحکام اور اخبار "خلافت" کے اجرا سے اُردو زبان کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا نادر موقع مِلا۔ اُردو کے خادم مولانا شوکت علی کی اس اہم خدمت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

بمبئی میں "خلافت" سے پہلے کی اُردو صحافت، عالمِ طفلی میں زندگی بسر کررہی تھی، "خلافت" کے اجرا کے بعد بمبئی والوں کو یہ معلوم ہوا، کہ اُردو زبان میں ایک بلند پایہ اخبار بھی نکل سکتا ہے۔ "خلافت" بمبئی کا

سب سے پہلا اُردوٗ اخبار ہی، جس نے نہایت بہترین سیاسی لٹریچر پیش کیا۔ اور مجلسِ خلافت بمبئی کا وہ پہلا ادارہ ہی جس نے بہت سی کتابیں اُردوٗ کی چھاپیں اور شائع کیں۔

اُردوٗ صحافت کے لیے سب سے پہلے 'خلافت' ہی نے میدان ہموار کیا، فضا پیدا کی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اور اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ اب حالت یہ ہی کہ ایک درجن کے قریب روزانہ اور پچاس کے قریب ہفتے وار اخبارات بمبئی سے نکل رہے ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ بمبئی کے اُردوٗ اخبارات نے سب سے پہلے ہندستان کی مسلم اُردوٗ صحافت میں انقلاب انگیز اقدام کیا۔ اب بھی دہلی، لکھنؤ، لاہور وغیرہ کے متعدد مقتدر مسلم روزنامے ایسے ہیں، جو ہر روز مقامی انگریزی اخبارات سے باسی خبریں ترجمہ کرتے ہیں، یا ریڈیو کی سُنی سُنائی خبروں کو اپنے الفاظ میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں کے تقریباً تمام اُردوٗ روزنامے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی مفصّل نیوز سروس لیتے ہیں اور ٹیلی پرنٹر بھی استعمال کرتے ہیں۔ میرا خیال ہی رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کو سارے ہندستان کے مُسلم پریس سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی ہوگی جتنی صرف بمبئی سے ہوتی ہی۔

اس انقلاب انگیز اقدام کا نتیجہ یہ ہی کہ یہاں کے اخبارات خبروں کے اعتبار سے 'ٹائمز آف انڈیا' اور دوٗسرے بلند پایہ انگریزی، مرہٹی اور گجراتی اخبارات سے ہرگز فرومایہ نہیں ہیں۔ اس اقدام کا دوٗسرا نتیجہ یہ ہی کہ اخبارات کی اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا ہی۔ ان کی حیثیت اور عظمت مسلّم ہوگئی ہی۔ چناں چہ مناسب نرخوں پر اُنھیں اشتہارات بھی بہت کافی ملنے لگے ہیں، اور اس طرح ان کی مالی حالت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوگئی ہی۔

اس وقت بمبئی سے حسبِ ذیل روزنامے نکلتے ہیں:-

(۱) روزنامۂ 'خلافت'
(۲) روزنامۂ 'انقلاب'
(۳) روزنامۂ 'اقبال'
(۴) " 'ہلال'
(۵) روزنامۂ 'اجمل'
(۶) " 'ہندستان'
(۷) " 'مسلم'
(۸) " 'الہلال'

(۹) روزنامہ 'معاشرت' (۱۱) روزنامہ 'بیدار'
(۱۰) " 'الکمال'

ان میں سے آخر الذکر چار اخبارات کے علاوہ سب رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی سروس لیتے ہیں۔

ہفتے وار اخبارات کم و بیش ۵۰ نکلتے ہیں۔ جس طرح یہاں کے روزنامے، شمالی ہند کے روزناموں کا مقابلہ اپنی خوبیٔ تحریر، فراہمیٔ اخبار اور معیارِ صحافت کے اعتبار سے کر سکتے ہیں۔ یہاں کے ہفتے وار اخبارات شمالی ہند کے ہفتہ واروں کے مقابلے میں نسبتاً پست ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبارات ضرورت سے زیادہ نکل رہے ہیں۔

ان اخبارات میں سب سے پہلا درجہ 'قومی جنگ' کا ہے۔ یہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا اُردو ترجمان ہے۔ یہ اخبار اپنے مقالات، ترتیب، زبان و بیان اور معیار کے لحاظ سے ہندستان کے بہترین اخبارات کا ہم پلہ ہے۔

دوسرے ہفتے وار اخبارات زیادہ تر ادبی یا فلمی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں

(۱) 'صداقت' (۶) 'جمہور'
(۲) 'مصوّر' (۷) 'سروش'
(۳) 'نظام' (۸) 'ظفر'
(۴) 'اجمل ویکلی' (۹) 'حشر'
(۵) 'ہندستان ویکلی' (۱۰) 'ناخدا'

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ اخبارات کے مالک یا مدیر بیرونِ بمبئی کے ہیں۔ 'ناخدا' کے مالک و مدیر خاص بمبئی کے ہیں، یہ اخبار کوکنی قوم کا آرگن ہے۔ اسی طرح 'اجمل' ڈیلی کے مالک و مدیر حارث صاحب بھی کوکنی ہیں۔ ان کا اخبار بھی اُردو کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔

بمبئی سے کئی ماہ نامے بھی شائع ہوتے ہیں:۔

(۱) 'صبحِ امید' (۲) 'تنویر'

(۳) ' تمثیل '

(۴) ' ہندستان '

(۵) ' ایشیا '

ان میں سے ' تمثیل ' تو خالص فلمی پرچہ ہے۔ باقی پرچے علمی ادبی ہیں، اور بلند معیار کے حامل ہیں۔ ' صبحِ امید ' کے مالک و مدیر مسٹر عبدالحمید بوبیرے بھی کوکنی ہیں۔ انھوں نے یہ رسالہ نکال کر اپنی قوم میں اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ ' تنویر ' کی مدیرہ ایک خاتون، محترمہ اصغری بیگم ہیں۔ یہ پرچہ بھی بلند معیار کا حامل ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری جیسے شاعر و ادیب اس کے قلمی معاونین میں شامل ہیں۔ ' ایشیا '، مشہور شاعر ساغرؔ نظامی کا پرچہ ہے۔ پہلے میرٹھ سے نکلتا تھا، پھر پونہ سے اس کی اشاعت شروع ہوئی؛ اب بمبئی سے نکل رہا ہے۔

غرض ماضی کی روشنی میں اگر حال کا اندازہ لگایا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بمبئی کی اُردو صحافت اس وقت پنجاب اور یوپی کی اُردو صحافت سے ہرگز پیچھے نہیں ہے، ممکن ہے دو قدم آگے ہو۔ یہاں اُردو زبان جڑ پکڑ چکی ہے اور اگر اسی رفتار سے یہاں اُردو کی خدمت کا سلسلہ جاری رہا، تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ دہلی، لاہور، لکھنؤ کی طرح بمبئی بھی اُردو زبان کا مرکز تسلیم کرلیا جائے گا۔ بنگال اور مدراس میں اُردو اب تک اجنبی ہے، لیکن بمبئی نے اسے اپنا لیا۔

بمبئی میں اُردو صحافت کے عہد بہ عہد کے عروج و ارتقا پر اگر ایک نظر ڈالی جائے، اس کے ماضی سے حال کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں اُردو صحافت کا مستقبل نہایت خوش گوار اور خوش آیند ہے۔

اس وقت جنگ کی دشواریوں کے باعث اخبارات کے اجرا اور اشاعت پر گوناگوں پابندیاں عائد ہیں۔ لیکن جب یہ جنگ ختم ہوگی، اور یہ پابندیاں دور ہوں گی، تو یقیناً ایک نئے اور شان دار دور کا آغاز ہوگا، جس کی ہلکی سی جھلک موجودہ اُردو صحافت کی ترقیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یقیناً وہ دور جلد آئے گا، جب یہاں کے اخبارات کا معیار اور زیادہ بلند ہو جائے گا، جب یہاں کے رسائل کی خدمت کا دائرہ کچھ اور زیادہ وسیع ہو جائے گا، خدا کرے وہ دور جلد شروع ہو!

-:(o):-

مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ بہ حیثیت شاعر

(جناب خلیق احمد صاحب نظامی ام' اے)

مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ اٹھارویں صدی کے نہایت عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ علم وفضل میں یکتائے عصر تھے۔ زہد و اتقا کا دور دور شہرہ تھا۔ بریلی میں اُن کی خانقاہ تھی۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے دور دور سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ غلام سرور کا بیان ہے:-

"خلق بے شمار بہ حلقۂ ارادت وی درآمد و مردماں از اقالیم دور و دراز یعنی از کابل و قندھار و شیراز و بدخشاں بہ خدمتِ بابرکت وی حاضر آمدہ مستفید و مستفیض شدند"

خود شاہ صاحبؒ کا عالم یہ تھا کہ عشقِ حقیقی کے نشے میں چور رہتے تھے۔ دردِ عشق ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ یہ آگ ہر وقت اُن کے سینے میں سلگتی تھی۔ کبھی کبھی اُس کے شرارے شعر کی صورت میں نمودار ہوتے تھے۔ وہ شعر بہت کم کہتے تھے لیکن جب کبھی کہتے تھے، اپنا دِل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ اس کے لفظ لفظ سے اثر ٹپکتا تھا۔ اُن کا شعر اعماقِ روح سے نکلتا اور سُننے والے کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا کلام اس زمانے کے صوفیا میں بہت مقبول ہوا۔ صاحبِ 'خزینۃ الاصفیا' نے لکھا ہے:-

"حضرت شاہ دِل آگاہ بہ شعر رغبت تمام داشت۔ و اشعارِ آب دار متضمن حقائق و معارف گفتے۔ چناں چہ دیوان نیاز کہ از تصانیف آں حضرت است بسیار مرغوب و مطبوع طبع جماعتِ اصفیا است"

اس مضمون میں اُن کے اُردو دیوان پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ شاہ صاحب کا اصل موضوع عشقِ حقیقی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے اُن کے کلام پر تنقید کرنا اُصولی غلطی ہوگی۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ اس اعتبار سے بھی شاہ صاحب کسی سے پیچھے نہیں۔

مختصر حالات | شاہ نیاز احمد صاحب ۱۱۷۳ھ میں بہ مقامِ سرہند پیدا ہوئے۔ والدِ ماجد حاجی حکیم

شاہ رحمت صاحب کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ آپ کی والدۂ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ جب سرہند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں مولانا شاہ فخرالدّین صاحب کی خدمتِ بابرکت میں علومِ ظاہری کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے۔ شاہ نیاز احمد صاحب نہایت ذکی اور ذہین انسان تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں معقول و منقول، فروع و اصول، حدیث و تفسیر میں کمال حاصل کرلیا۔ علومِ ظاہری سے فراغت ہوئی تو شاہ فخرالدّین صاحب دہلوی کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی اور علومِ باطنی کی طرف متوجہ ہوے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی۔ آپ کی لیاقت، استعداد اور سعیٔ پیہم سے پیر بہت متاثر ہوے اور اپنا خلیفۂ راستین مقرر کیا۔ بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قائم کی، جو بہت جلد، بہ قول غلام سرور "معدنِ فیوضِ ربانی" اور "مطلعِ انوارِ سبحانی" بن گئی۔ جگہ جگہ سے لوگ آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندستان میں جو کچھ فروغ ہوا، وہ مولانا شاہ فخرالدّین صاحب دہلوی کے دو مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمّد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے یوپی میں اپنے سلسلے کو خوب پروان چڑھایا۔ شاہ نیاز احمد صاحب نے سنہ ۱۲۵۰ھ میں بہ مقامِ بریلی وصال فرمایا۔

بہ حیثیت شاعر شاہ صاحبؒ کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ عشق ان کے خمیر میں تھا۔ جذباتِ عشق و محبت کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کرلیتے تھے۔ شاہ صاحبؒ شعر بہت کم کہتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے اُردو اور فارسی دونوں دیوان بہت مختصر ہیں لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ اپنی جامعیت اور افادیت میں کم نہیں۔ اُن کی فکرِ رسا نے تصوّف کے نہایت باریک نکات کو انتہائی حُسن اور دِل کشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کے کلام میں آورد نہیں۔ وہ قلبی واردات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوز و گداز، درد، علوِ معانی کے علاوہ نفاست، سلاست اور روانی اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ حضرتِ نیاز نے فکرِ رسا پائی تھی۔ اور اس پر خود حضرتِ نیاز کو ناز تھا۔ اکثر اشعار میں اُس کا ذکر کرتے ہیں ؎

رکھتے ہیں نیاز یہ اہلِ دِل ترے شعر سُننے کا اشتیاق
غزل ایک دوسری اور کہ تجھے حق نے فکرِ رسا دِیا

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

ہوں میں نیاز مند جناب امیر کا   اس واسطے میں صاحبِ فکرِ رسا ہوا

ایک جگہ اپنی فصیح البیانی کا ذِکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بھلا اک غزل اور بھی ایسی کہیو   تجھے میں فصیح البیاں دیکھتا ہوں

۱۔ سلاست اور روانی سلاست اور روانی حضرتِ نیاز کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ وہ نہایت بلند خیالات کو انتہائی سادگی، نفاست اور دِل کشی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اس سادگی میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں آمد ہی آمد ہے ’آورد کا نام نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

؎ رواں آنکھوں سے ہے سیلابِ گُل گوں   الٰہی چشم ہے یا چشمۂ خوں

؎ ایک تو ہی نہیں میں بھی ہوں اُن آنکھوں کا مارا
اے اہلِ نظر نرگسِ بیمار سے کہہ دو

؎ کروں کیا بیان میں ہم نشیں اثر اُس کے لطفِ نگاہ کا
کہ تعینات کی قید سے مجھے ایک دم میں چھڑادیا

؎ فرشِ زمیں ہے خاک نشینوں کا بسترا   بے خان ومانِ عشق کا تکیہ ہے خشت وسنگ

؎ مجھ سے مریض کو طبیب ہاتھ تو اپنا مت لگا   اس کو خدا پہ چھوڑ دے بہرِ خدا جو ہو سو ہو

؎ غمِ جُدائی کو ہم جانے یا خدا جانے   بلاکشوں پہ جو گزری تری بلا جانے

بعض چھوٹی بحر کی غزلیں اپنی روانی، سادگی اور شگفتگی میں بے نظیر ہیں ؎

ستارے نہیں یہ شبِ تار کے   شرارے ہیں آہِ شرربار کے
مبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت   میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے
جو دیکھے تجھے بُلبُل اے رشکِ گُل   نہ پھٹکے کبھی گرد گُل زار کے

صفائی ترے سلکِ دنداں کی دیکھ ہوے غرقِ دریا گہر ہار کے
عجب کیا جو تشریف لاؤ اِدھر عیادت کو آتے ہیں بیمار کے
کہاں فصلِ گُل ہے کہاں وہ بہار چلوبل کے رودیں گلے خار کے

غزل اور ایسی ہی کہیو نیاز
کہ مشتاق ہیں تیرے اشعار کے

۲۔ تاثیر حقیقی شاہ صاحبؒ کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ اس لیے ہر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلتا ہے، گرمی اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

ے مجھے بے خودی یہ تو نے بھلی چاشنی چکھائی کسی آرزو کی دِل میں نہیں اب رہی سمائی
ے نہ مقامِ گفتگو ہے نہ محلِ جستجو ہے نہ وہاں حواس پہنچیں نہ خِرد کو ہے رسائی
نہ مکیں ہے نے مکاں ہے نہ زمیں ہے نے زماں ہے دلِ بے نوا نے میرے جہاں چھاؤنی ہے چھائی
نہ وصال ہے نہ ہجراں نہ سرور ہے نہ غم ہے جسے کہیے خوابِ غفلت سو وہ نیند ہم کو آئی

۳۔ مبلغ علم حضرتِ نیاز بڑے پایہ کے عالم تھے۔ اُن کے اشعار سے تبحرِ علمی کا پتا چلتا ہے۔ فلسفہ، منطق وغیرہ میں کافی مہارت تھی۔ اس کی اصطلاحات اشعار میں استعمال کرتے ہیں:۔

ے سمندِ ناز کی جب باگ اُس نے دی ٹک چھوڑ وہیں ٹھٹک رہے برہان سُلمی منھ موڑ
ے جو خطِ جوہری ممکن نہیں حکیم کنے تو اوس کی دیکھ کر کیا کرے گا توڑ اور جوڑ
ے ترے آئینۂ رُخ کا صفا دیکھ تحیّر میں ہے اشراقِ افلاطون
ے کیا طرفہ اجتماعِ نقیضین ہے حکیم آنکھوں کے وہ لڑانے میں رکھتا ہے صلح وجنگ

بعض اشعار میں آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً ے

نکتہ اَینَمَا سے واقف ہو چہرۂ یار جابجا دیکھا

۴۔ مشکل زمین میں اشعار حضرت نیاز کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ وہ نہایت سنگلاخ زمین میں

بہت بے تکلف شعر کہتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ ان اشعار میں بھی آورد کا شبہ نہیں ہوتا۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

لشکرِ غم آپڑا اقلیمِ دل پر ٹوٹ ٹوٹ یہاں ندائے الاماں تھی واں صدائے لوٹ لوٹ

اس زمین میں تقریباً ۲۸ شعر کہے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چشمِ بد سے دور رہیو کیا ہی آب و تاب ہے ہوں گی یہ آنکھیں بنائی موتیوں سے کوٹ کوٹ

دیکھ میرا خونِ اشک اس نے کہا شب مجھ کو دیکھ تیری آنکھوں میں گئی میری حنا سب چھوٹ چھوٹ

ایک دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

دھیان اپنے کو نہ خاک نہ افلاک سے باندھے عرفان اگر چاہے دلِ پاک سے باندھے

اس غزل کا ایک بہت رواں اور پُرتاثیر شعر ہے ؎

اس چرخ سے کیا رکھیے بھلا چشمِ نکوئی جو بیرپس از مرگ بھی ہے خاک سے باندھے

۵۔ محاورات و روزمرّہ بعض اشعار میں روزمرہ اور محاورات نہایت صفائی اور سلاست سے باندھتے ہیں۔ روزمرہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

سینے میں قلزم کو لے قطرے کا قطرہ رہا بل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور

ادھر کی نہیں جانتے رسم و راہ ؎ میاں ہم تو باشندے ہیں پار کے

۶۔ متروکات وغیرہ نیاز صاحب بعض جگہ وہ الفاظ و محاورات لکھتے ہیں جن کا استعمال اب متروک ہے۔ مثلاً "ٹک"، "کنے" وغیرہ۔

شاہ صاحب کی چند لغزشیں یہ ہیں:۔

"جنگ نہ ہوتا" ——— جنگ مذکر استعمال نہیں ہوتا۔

"ہاتھوں کے مور اُڑنا" ——— صحیح محاورہ "ہاتھوں کے توتے اُڑنا" ہے۔

۶ جب دل میں کھنچا نیاز کے مجھ حسن کا نقشہ ——— "تیرے حسن کا" ہونا چاہیے۔

۶ ذرا چھپ نگاہ رقیب سے پڑی اس گلی میں تھی مری خاک ——— "ذرا چھپ کر" ہونا چاہیے۔

شاہ صاحب "دیکھنے والو" کے لیے "دیکھنے ہارو"، "مٹی کی جگہ "ماٹی" اور "کدھر" کو "کیدھر" لکھتے ہیں۔

۷۔ عشق و معرفت شاہ نیاز احمد صاحب صوفی تھے۔ عشقِ الٰہی اُن کے خمیر میں تھا۔ وہ عشق کے بندے تھے۔ عشق کی دُنیا میں رہتے تھے۔ عارفِ رومؒ کی طرح اُن کے قلب کی دھڑکنوں میں یہ آواز پوشیدہ تھی ؎

شادباش ای عشق خوش سودائے ما ای طبیبِ جملہ علت ہائے ما

عشق کے اُن پر اتنے احسان ہیں کہ کہتے ہیں ؎

کہاں تک کہوں لطف و احسانِ عشق کہ جوں جوں گھٹائیں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حسنِ عروج کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

عشق کی دُنیا میں پہنچ کر وہ عقل و ہوش کو الوداع کہتے ہیں ؎

جونہیں آمد آمدِ عشق کا مجھے دِل نے مژدہ سُنادیا خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوسِ کوچ بجادیا

ایک دُوسرا شعر ہی ؎

جب بردرِ دِل حضرتِ عشق آن پُکارے گوشے ہوئی عقل اور ہوے اوسان کنارے

جب شاہ فخرالدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ؎

جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبقِ مقامِ فنا لیا جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو دہ صاف [illegible]

علومِ ظاہری کو خیرباد کہ کر وہ اس شان سے عشق کے میدان میں قدم رکھتے ہیں ؎

عشق کے میدان میں آ صورتِ انسان بنا عاشقِ مولا ہوا چاند کا جیسے چکور

جذباتِ عشق اُن کے سینے میں متلاطم ہوتے ہیں۔ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

جوش زن ہی عشق کی مو اب خُمِ دل میں نیاز گہ اُبل کر وہ گرے گہ خُم سے نکلے پھوٹ پھوٹ

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کیا جوش میں ہی اب مئے وحدت خُمِ دل میں اُبلے ہی پڑی رومیؔ و عطارؔ سے کہ دو

آتشِ عشق اُن کے سینے کو جلا دیتی ہے ؎

کہیں عاشق نیازؔ کی صورت سینہ بریاں و دِل جلا دیکھا

طوفانِ اشک اُمنڈتا ہے۔ بے اختیار نیازؔ کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھتے ہیں ؎

یا الٰہی زورقِ گردوں سنبھال بے طرح اُمڈا ہے یہ طوفانِ اشک

ایک لمحہ رُکتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اشکوں نے حقیقتاً اُس کی یاوری کی ہے ؎

ڈُبک چکے تھے ہم تو ای یاردو ابھی گر نہ ہوتا اس گھڑی احسانِ اشک

عشق نے شاہ صاحب کی شاعری میں ایک درد، سوز اور گرمی پیدا کردی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محسوس بھی کرتے ہیں اس لیے اس کی آتش انگیزی بھی بے پناہ ہوتی ہے۔

۸۔ وحدت الوجود مختصر طور پر وحدت الوجود کا نظریہ یہ ہے۔ خدا کے سوا کوئی چیز کائنات میں موجود ہی نہیں۔ یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اسی کو ہمہ اوست کہتے ہیں۔

اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ ذات ہے۔ صوفیا کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں ؎

با وحدتِ حق زکثرتِ خلق چہ باک صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگادی جاتی ہیں اُن کا وجود اگرچہ دھاگے سے متمائز نظر آتا ہے لیکن فی الواقع دھاگے کے سوا، گرہ کوئی زائد چیز نہیں۔ صرف صورت بدل گئی ہے۔

اٹھارویں صدی میں شاہ نیاز احمد صاحب نے اس نظریے کو بہت پھیلایا۔ انھوں نے اکثر اشعار اسی عقیدے کی تشریح میں لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدت الوجود ہی ان کا اصلی موضوع ہے اور اسی سے اُن کا کلام لبریز ہے۔

اس سلسلے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت گر سرِ معرفت کو پاوے شعور تیرا
معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

ع عالم کہے جس کو جہاں یعنی جہانِ جسم و جاں — شامل ہیں سب اُس ذات کی جس کو کہے سنسار ایک
بے امتیازِ بیش و کم دانے میں ہیں یہ سب بہم — بیخ و درخت و شاخ و گل انبوہِ برگ و بار ایک
طوطی موجب دستاں سرا سو سو طرح سے دے نوا — ہر دم نئی بولے صدا اور ہے وہاں منقار ایک

ع نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہوجیو — ہر رنگ میں اُسی کو نمودار دیکھنا
ع جسے ذاتِ بے رنگ و بے چوں کہیں ہیں — بہ ہر رنگ جلوہ کناں دیکھتا ہوں
ع صورتِ گل میں کھل کھلا کے ہنسا — شکلِ بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہوکر کے اور پروانہ — آپ میں آپ کو جلا دیکھا
کرکے دعوا کہیں انا الحق کا — برسرِ دار وہ کھنچا دیکھا

کائنات اُن کے نزدیک ایک بحرِ رواں ہے ــــ مسلسل اور متواتر ــــ

ع اگر کوئی جانے جہاں غیرِ حق ہے — سو میں اُس کو دھوکا گماں دیکھتا ہوں
یہ جو کچھ کہ پیدا ہے سب عینِ حق ہے — کہ اک بحرِ ہستی رواں دیکھتا ہوں
ع ازل سے لے کے ابد تک وہی جو ہے سو ہے — بہ رنگِ بحرِ رواں جس میں ہے نہ توڑ نہ جوڑ

اسی مسئلے کو ریاضی سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ جو رشتہ ایک (مبتدا ء الاعداد) اور دوسرے اعداد میں ہے وہی رشتہ خدا اور کائنات کے درمیان ہے ــــ

ع تعینات کے نقطوں سے ہے کثیر احد — وہی ہے ایک یہ دس سو ہزار لاکھ کروڑ
ع ہیں دیدۂ بینا میں ہم سارے کم و بسیار ایک — کثرت نمایاں اتنی ہو جتنا کرے تکرار ایک

۹۔ وحدتِ ادیان

شاہ نیاز احمد صاحب وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ اُن کی حریت فکر و ضمیر کا یہ عالم ہے۔ کہتے ہیں

ع یہ سب ادیان و ملل ہیں شاخ ہائے یک درخت — ایک جڑ سے ہیں یہ نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ
ع صنم کو پوجے برہمن حرم کو مانے شیخ — یہ دونوں ایک ہیں مانوں کسے کسے دوں چھوڑ
ع گر بادۂ توحید پئیں اہلِ مشارب — ہفتاد و دو ملت کی ہو تکرار فراموش

ے جو رب الحرم ہی صنم بھی وہی ہی — حرم دیر میں ایکسان دیکھتا ہوں
اسے برہمن اور اُسے شیخ مانے — یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

۱۰۔ تراجم شاہ صاحب نے فارسی اشعار سے تراجم بھی بہ کثرت کیے ہیں۔ بعض جگہ تو وہ فارسی شعر کا صاف ترجمہ کردیتے ہیں۔ اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ فارسی شعر ذہن میں رکھ کر شعر کہا ہی۔ بعض غزلوں کے خیالات اور زمین فارسی اشعار سے لی گئی ہی۔ مثلاً "جو ہو سو ہو" والی غزل حافظ کی مشہور غزل "ہرچہ بادا باد" کا اثر معلوم ہوتی ہی۔ ایک دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہی ے

سر زمینِ چشت کی آب و ہوا کچھ اور ہی — دین و دنیا سے نرالا اور ہی کچھ طور ہی

احمد جامؒ کی مشہور غزل ے

عاشقانِ خواجگانِ چشت را — از قدم تا سر نشانے دیگر است

کے طرز پر لکھی گئی ہی۔

چند اشعار جو فارسی اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں ــــــــ

ے اسرارِ حقیقت کے خبردار جو ہوتے — ہفتاد دو ملت میں کبھی جنگ نہ ہوتا

حافظ کا شعر ہی ے

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ے کافرِ عشق ہوں میں بندۂ اسلام نہیں — بُت پرستی کے سوا اور مجھے کام نہیں

خسرو کا شعر ہی ے

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

ع کل دورۂ مجنوں تھا نیاز آج ہی اپنا

مشہور مصرع ہی۔ ع دَورِ مجنوں گزشت و نوبتِ ما است

ع پوچھو نہ مجھ خراب سے اصلاحِ کار تم

حافظ کا مصرع ہی۔ ع صلاحِ کار کجا و من خراب کجا

مریضِ عشق کا درماں عبث کرے ہی تو   دوا ہماری ارسطو بھلا تو کیا جانے

معلوم ہوتا ہی کہ خسرو کا شعر سامنے تھا ؎

از سرِ بالینِ من برخیز ای ناداں طبیب   دردمندِ عشق را دارو بہ جز دیدار نیست

خاتمہ حقیقت یہ ہی کہ شاہ نیاز احمد صاحب اٹھارویں صدی میں سلسلۂ نظامیہ کے نہایت صاحبِ کمال، وسیع مشرب، صاحبِ دِل اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے۔ عِلم وفضل میں یکتائے عصر تھے۔ عشقِ حقیقی میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے۔ اُن کے اشعار انھی جذباتِ عشق کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ اُن کے مزار پر جائیے تو آج بھی یہ آواز فضا میں سُنائی دے گی ؎

طمعِ فاتحہ از خلق نہ داریم نیازؔ   عشقم اندر پسِ من فاتحہ خوانم باقی ست

امرؤالقیس

(از جناب عبدالرحمان صاحب مستقیمی الاصلاحی)

نام و نسب اصلی نام جندح ہے۔ امرؤالقیس، الملک الضلیل اور ذوالقروح لقب ہے۔ ابوالحارث، ابووہب اور ابوزید کنیت ہے۔ باپ کی طرف سے نسب نامہ یہ ہے حجر بن حارث بن عمرو بن حجر۔ یہ لوگ مشہور شاہانِ کندہ سے ہیں۔ ماں کی طرف سے نسب نامہ حسبِ ذیل ہے:۔ فاطمہ بنتِ ربیعہ بن حارث بن زہیر تغلبی۔ یہ ربیعہ زہیر تغلبی کے دونوں بیٹے کلیب اور مہلہل کی بہن ہے۔

علمائے انساب اس نسب نامے پر متفق نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا نام جندح نہیں امرارالقیس ہے، کسی کے نزدیک اس کا نام صرف قیس ہے کوئی کہتا ہے کہ اس کے باپ کا نام عمرو ہے اور حجر غلط ہے اور اس کی ماں کا نام فاطمہ نہیں بلکہ "تملک" ہے، پھر امرارالقیس کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اس لیے اس کی کنیت کا ثبوت نہیں ملتا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درِ گور کردیا کرتا تھا لہٰذا اس کے کوئی اولاد باقی نہ رہی۔ بعض لوگ کہتے ہیں اس کے ایک لڑکی تھی جس کا نام ہندہ تھا مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس کی بہن تھی لیکن قرائن سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ بہرحال علمائے ادب کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ اختلافات اس بات کی دلیل ہیں کہ اس شاعر کا سرے سے وجود ہی غلط ہے۔ اس کے تمام قصے فرضی اور اس کے اشعار سب کے سب بعد والوں کی ایجاد ہیں اور اس کے متعلق تمام کی تمام روایتیں موضوع اور بے بنیاد ہیں اس لیے اس کی تمام داستان ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔

لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کہ صرف ان اختلافات کی بنا پر ہم اس کے وجود ہی سے انکار کردیں۔ اگر اس کے تمام واقعات صرف افسانہ ہی ہوتے تو پھر علمائے انساب کو اس قدر اختلافات کی ضرورت کیا تھی لہذا یہ اختلافات ہی دراصل اس کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔

تاریخ میں اکثر واقعات ایسے ملیں گے جن کے ساتھ حقیقت اور صداقت کا توازن بہت کم قائم رہ سکا

ہے جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول ومشہور ہوتا ہے اسی قدر افسانہ سرائی اسے اپنے حصارِ تخیل میں لے لیتی ہے لیکن پھر بھی بعض واقعات ایسے ملیں گے جن کے وجود کو بعد کی تحقیقات نے روشنی میں کھڑا کر دیا ہے اور دنیا ان کے وجود کے ماننے پر مجبور ہوگئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں لیکن زمانۂ اسلام اور اس کے پہلے خود ان کے اور ان کے والد کے نام میں بے شمار اختلافات ہیں چنانچہ بیسؔ نام ان کے اور پندرہ نام ان کے والد کے بتائے جاتے ہیں۔ پھر کیا ہم محض اس بنا پر ان کے وجود سے انکار کر دیں۔ اسی طرح یونان کے مشہور شاعر ہومر کے بارے میں بے شمار اختلافات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہومر اس کا لقب ہے لیکن اس کے معنیٰ اور اس کے ملقّب ہونے کے اسباب میں مختلف اقوال ہیں۔

ماحول

قبل اس کے ہم امراء القیس کی زندگی اور شعر و شاعری پر بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے وطنی قومی ماحول اور ان عوامل سے بحث کریں جو اس کی زندگی اور شاعری پر اثرانداز ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان پر اس کے ماحول اور ملکی آب وہوا کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ناممکن ہے کہ ایک حسّاس طبیعت کے اندر اس کے گہرے نقوش نہ پڑیں۔ پھر ایک شاعر کا دماغ تو اس سے ضرور ہی متاثر ہوتا ہے وہ حقیقت میں جو کچھ کہتا ہے اس کی زبان نہیں بلکہ اس زمانے اور ملک کی زبان ہوتی ہے جس میں وہ اور اس کے خیالات و جذبات پل کر جوان ہوتے ہیں اس لیے جب اس کی شاعری کا مطالعہ کرنا ہو تو لازم ہے کہ اس کے سارے ماحول کا مطالعہ کیا جائے۔

نجد نجد وسط عرب حجاز اور یمن کے درمیان میں واقع ہے اس کی مغربی سطح ۵۰۰۰ قدم اور مشرقی سطح ۲۵۰۰ قدم اونچی ہے۔ اکثر حصے ریتیلی زمین کے ہیں اور کچھ برفانی ہیں۔ پہاڑی سلسلے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جن میں قبیلۂ طے کے دو مشہور پہاڑ اجا اور سلما ہیں۔ وہاں بہت سی ندیاں بھی بہتی رہتی ہیں جو سال کے اکثر ایام میں سرزمینِ نجد کو سیراب کرتی ہیں۔ سب سے بڑی وادی رمہ ہے جو قریب قریب تمام نجد میں پھیلی ہوئی ہے۔

نجد میں خالص عربی زبان اور بدوی اشعار ملیں گے جس میں عجمیت کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب عجمیوں سے اختلاط شروع ہوا تو نجد ہی وہ جگہ ہے جہاں کی زبان بہت حد تک محفوظ تھی جبلِ عکاظ پر بسنے والوں کی زبان تو چوتھی صدی کے اخیر تک خالص رہی۔

نجد کے شمال میں اجا اور سلما کے پہاڑوں میں طی کا خاندان پایا جاتا تھا اور نجد کے بلند خطّوں میں بکر و تغلب کی آبادیاں تھیں۔ وادیٔ رمہ کے شمال میں عنترہ اور اسی کا خاندان آباد تھا اور نجد کے مغربی حصّے میں ہوازن اور سلیم کے قبائل بستے تھے۔

علمائے لغت نے جن افصح القبائل کا ذکر کیا ہے ان میں سے قیس، تمیم، اسد اور ہوازن کی بعض شاخیں ہیں جنھیں "علیاء ہوازن" کہتے ہیں۔ انھی کے متعلق ابوزید کا قول ہے کہ "افصح النّاس ہوازن کی دو شاخیں اوپر اور نیچے بسنے والی ہیں۔ نیچے کے بسنے والوں میں خاندانِ سعد بن بکر، جشم بن بکر اور نصر بن معاویہ ثقیف ہیں اور بلند حصّے میں بسنے والے اہلِ مدینہ اور ان کے اطراف و جوانب کے عرب ہیں لیکن یہ لوگ اہلِ سافل کی سی فصاحت نہیں رکھتے تھے۔"

جس طرح نجد کے قبائل میں افصح النّاس پائے جاتے ہیں اسی طرح کچھ ایسے قبائل بھی ہیں جو خالص عرب اور جن کا وطن خالص بلادِ عرب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں بعض قبیلے "جمرات" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان لوگوں کو جمرات اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ ان کا کوئی فرد کسی غیر قبیلے میں شامل نہ ہوگا اور نہ کسی غیر کو وہ اپنے میں شامل کریں گے۔ اس قسم کے چار خاندان تھے۔ بنو نمیر بن عامر بن صعصعہ، اولادِ حارث بن کعب، اولادِ ضبہ اور اولاد عبس بن بغیض۔

کندہ خاندانِ کندہ نجد میں حکومت کرتا تھا اور اس کے بادشاہ امراء القیس کے آباد اجداد تھے۔ علمائے انساب کہتے ہیں کہ خاندانِ کندہ جنوبی عرب کے قحطانی لوگوں سے تعلق رکھتا تھا۔ مورخین اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ کندہ کا جنوب سے نجد کی طرف ہجرت کرنے کا سبب کیا ہے؟ چناں چہ بہتوں کی رائے ہے کہ یہ قبیلہ جنوب کی طرف بحرین میں آباد تھا۔ پھر وہاں سے ہجرت کر کے حضرموت میں آیا یہاں ان کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ یہیں حضرموت کے ایک شہر کندہ میں مقیم ہو گئے اور اسی لیے پھر وہ اسی

شہر کے نام سے موسوم رہے ۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں سے مہرہ کے ایک قصبے دمون میں آباد ہوئے یہ تمام آبادیاں ان کے بھائی حمیریوں کے زیرِ حکومت تھیں ۔ حمیریوں نے اس خاندان کے رؤسا اور باا‌ثر لوگوں کو امورِ سلطنت میں داخل کیا۔ جب حسّان بن تبع حمیری کا زمانہ آیا تو کندیوں کی حیثیت میں چار چاند لگ گئے ۔ ان کا سردار حجر بن عمرو تھا جو حسان کا بھائی ہوتا تھا چوں کہ یہ جنگ اور فتوحات میں حسان کا مددگار تھا اس لیے حسان نے ان مقامات اور قبائلِ معد بن عدنان پر اسے حاکم بنادیا ۔ اور اس طرح خاندانِ کندہ میں ایک بادشاہ کا وجود ہوا ۔

جب حجر بن عمر کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے عمر بن حجر نے لی ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حارث حاکم ہوا جس کے زمانے میں یمن پر حبشہ کا تسلط ہوگیا اور حمیری حکومت ختم ہوگئی نیز کندہ سے بھی حمیریوں کی سیادت کا خاتمہ ہوگیا ۔ اب حارث مستقل طور پر اپنی آبائی حکومت کا مالک بنا۔ عراق میں آلِ منذر کی حکومت تھی جس سے حارث کی ہمیشہ ٹکر رہا کرتی تھی اس وقت وہاں کا فرماں روا منذر بن سما تھا جو قباذ کے زیرِ حکومت مقرر ہوا تھا۔

اسی زمانے میں مزدکی مذہب کا ظہور ہوا جو اشتراکیت کے بہت کچھ مشابہ تھا۔ ایران کے بادشاہ قباذ نے اس مذہب کو قبول کیا اور منذر بن ماء السماء کو بھی اس مذہب کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے یہ مشورہ ٹھکرا دیا اس پر قباذ برافروختہ ہوگیا اور اسے معزول کرکے اس کی جگہ حارث کو حاکم بنادیا۔ اس سے حارث کی عظمت میں اور اضافہ ہوگیا۔

مزدکیت کے ظہور کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ قباذ فوت اور اس کی جگہ نوشیرواں بادشاہ ہوگیا ۔ زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے مزدکیت کا خاتمہ کردیا۔ اسی کے ساتھ حارث کو معزول اور منذر بن السما کو پھر حاکم بنادیا ۔

حارث کا ایک لڑکا بنی اسد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے کئی لڑکے تھے جن میں بڑا لڑکا نافع اور چھوٹا ہمارا شاعر امراء القیس ہی ۔

یہ کندی حکومت امراء القیس کے زمانے تک اصل قحطانی اور بدوی حکومت تھی ۔ جس میں شہریت د

حضارت کے وہ آثار نہ تھے جو آلِ منذر اور آلِ غسان کی حکومتوں میں تھے لیکن یہ بدویت چند ہی دِنوں میں ختم ہوگئی۔ پہلے ان کا مذہب حمیری مذہب تھا مگر حیرہ کی حکومت ملتے ہی مزدکیت کو اختیار کرلیا۔ جب حیرہ کی حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو وہ پھر اپنے پُرانے حمیری ماحول کی طرف لوٹے اور دوبارہ اپنا قدیمی مذہب اختیار کرلیا۔

مہلہل امراءالقیس کا ایک ماموں مہلہل تھا جس کا نام عدی ہے وہ شاعر اور بہادر تھا مہلہل لقب اس لیے پڑا کہ یہ پہلا شاعر ہے جس نے طول طویل قصائد کہے اس کے پہلے چھوٹے چھوٹے قطعات اور متفرق اشعار کہے جاتے تھے۔

امامِ ادب جاحظ کتاب الحیوان میں لکھتے ہیں "حقیقی شعر کی عمر بہت کم ہے سب سے پہلے جس نے شعر کہا اور شاعری کا راستہ صاف کیا وہ امراءالقیس اور مہلہل ابن ربیعہ ہیں"

لیکن فرزدق کہتا ہے۔ "ومھلھل الشعراء ذاک الاول"۔ مہلہل سب سے پہلا شعر کہنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہلہل بن ربیعہ کو آدم الشعرا کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ اس زمانے کی عربی شاعری اس قدر کمال کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کہ یہ اسی صدی کی ساختہ پرداختہ ہے ایک مصری فاضل سلیمان البتانی اپنی کتاب "الیاذہ" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مہلہل، شنفری، تابط شرا اور دیگر شعرا جو چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں شمار کیے جاتے ہیں اس قدر فصیح وبلیغ اشعار کہتے ہیں کہ شعراے عرب کے مقدمۃ الجیش قرار نہیں دیے جاسکتے" ص ۱۰۸ و ۱۱۶

لیکن جب کہ اشعارِ جاہلیت کی تدوین باقاعدہ طور پر آٹھویں صدی عیسوی میں ہوئی اس وقت صرف دو ڈھائی سو برس پہلے یعنی ۵۰۰ء صدی عیسوی کے بعد کا کلام راویوں کو یاد تھا۔ اس حیثیت سے عربی ادب کی ابتدا ۵۰۰ء سے قائم کی جاسکتی ہے اور اس صورت میں البتہ مہلہل کو ہم عربی شاعری کا آدم الشعرا کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس کے پہلے کسی شاعر کا کلام ہم تک نہیں پہنچا۔

اس کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے بہت آزاد خیال اور رند مشرب آدمی تھا وہ مذہبی قیدوبند سے قطعی آزاد اور شرابی تھا وہ جو کچھ کرتا علانیہ کرتا۔ اپنے بھائی کلیب کی زندگی میں برابر قبیلوں کی عورتوں سے

چھیڑ چھاڑ کرنا، عیش و نشاط، شراب و کباب اور مختلف کیفیاتِ زندگی کے ترانے گاتا اور اپنے اشعار کے ذریعے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا۔ جنگِ بسوس کے چھڑ جانے سے اس کی حالت میں تھوڑا بہت تغیّر ہوگیا اور اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ جنگ کے بعد حارث اور اس کا لڑکا شرجیل بکر کے بادشاہ بن بیٹھے اور اس کا دوسرا لڑکا سلمہ تغلب کا حاکم بن گیا۔ اس طرح اس حکومت نے ان دونوں کے تعلقات پھر استوار کر دیے۔

بہ ہر حال امراءالقیس نے ایک بدوی حکومت کے زیرِ سایہ تربیت پائی جو تمدّن و ثقافت اور تعلیم و تعلّم سے قطعاً نا آشنا تھی۔ اس کا سرمایہ صرف وہ اشعار تھے جن میں عشق و محبّت کی داستانیں بیان کی گئی تھیں۔ اس نے تمام طرف سے توجہ ہٹا کر اسی کو اپنی زندگی کا مطمحِ نظر قرار دیا اور صرف شاعری اور عیاشی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس کے سامنے جو شاعری تھی وہ دراصل اسی قسم کی تھی جس میں ہر قسم کے جذبات کو علانیہ بیان کیا جاتا تھا چناں چہ امراءالقیس نے بھی اسی کو اپنا مددگار بنایا اور اس طرح ہر قسم کی بے باکیوں نے اس کے کلام میں جگہ حاصل کر لی۔

امراءالقیس کا باپ بھی ایک جابر بادشاہ تھا جس نے کبھی رعیّت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی۔ خراج کی آمدنیوں کو عیش و عشرت اور شہوت رانیوں میں صرف کیا کرتا۔ کلیب بھی کچھ کم متکبّر نہ تھا اور مہلہل تو اپنے خاندان سے الگ ہو کر زندگی کے لطف اٹھا رہا تھا۔ اور اس کی شاعری عیش و طرب سے معمور شاعری تھی۔ انھی ماحول نے امراءالقیس کے دماغ میں ہر قسم کی آزادی پیدا کر دی۔ چناں چہ وہ بھی اپنے ماموں مہلہل کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ اور تمام چیزوں میں اس نے بھی عیش و عشرت کو ترجیح دی۔ اپنے کلام میں حسنِ نسائی کی خوبیاں گِنا تا۔ ان کے جمال کے وصف میں جدّتیں پیدا کرتا۔ کبھی عنیزہ سے محبت کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو کبھی امّ حویرث اور امّ رباب کی ہوس رانیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی دارِ جلجل کی نہایت شہوت پرستانہ ساعت کو یاد کرتا ہے تو کبھی اپنی معشوقہ کے لیے اپنے اونٹ کی پُرلطف قربانی کا حال بیان کرتا ہے۔ کبھی بیٹھتا ہے تو شعر کے جادو سے شراب میں کیف و رنگ بھر دیتا ہے اور کبھی شکار کی طرف نکل جاتا ہے تو گھوڑے اور آلاتِ صید کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اس نے اپنے

ماموں مہلہل سے میراث پائی تھی۔

معاصرین امراءالقیس فطرۃً شاعر اور شوخ مزاج تھا لیکن ماحول اور خاص کر اس کے عزیز و اقارب اور معاصرین نے اسے اور زیادہ شوخ اور رندِ خراباتی بنا دیا۔ وہ اپنے معاصرین میں جن شاعروں سے زیادہ متاثر ہوا ہے اس میں ایک تو مہلہل ہی ہے اور دوسرا شاعر ابوداؤد ۔لایادی ہے۔ ابنِ رشیق نے لکھا ہے کہ امراءالقیس اپنی شاعری میں ہمیشہ اس سے سہارا لیتا تھا اور برابر اس کے اشعار کی روایت کرتا تھا چناں چہ بعض لوگوں نے امراءالقیس کو ابوداؤد کا راوی بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابوداؤد گھوڑے کی وصافی میں یدِ طولا رکھتا تھا اور امراءالقیس کا اکثر کلام اس کے کلام سے متاثر ہوا ہے۔

یوں تو وہ اپنے معاصرین میں اور دوسروں سے بھی کچھ نہ کچھ متاثر ہوا ہے لیکن مہلہل اور ابوداؤد اس کے مربّی اور معلّم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھی دونوں شاعروں کے رنگ اس کے کلام میں اکثر جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے معاصرین میں سے عبید بن ابرص بھی ہے جو بنی اسد کا شاعر اور اس کے باپ کا ندیم ہے۔ توأم یشکری۔ علقمۃالفحل اور عمرو بن قمئیہ بھی اس کے معاصرین میں بڑا پایہ رکھتے ہیں لیکن ان میں زیادہ جس کے کلام نے اس پر اثر ڈالا وہ عبید بن ابرص ہے۔ چناں چہ اسلوب و معانی میں بعض جگہ ان دونوں کے اشعار متفق ہو جاتے ہیں۔

حالاتِ زندگی

امراءالقیس کے آبا و اجداد کا تعلق خاندانِ کندہ سے تھا یہ لوگ نجد میں قبائلِ معد بن عدنان پر حکومت کرتے تھے۔ اس کا زمانہ اسلام سے چالیس سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ شروع زندگی کے حالات کا پتا نہیں اور نہ اس کے سنِ پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک تحقیقات و جستجو کے بعد اس کے حالات فراہم ہو سکے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی ابتداے سنِ شعور ہی سے آوارگی اور لاپروائی کی طرف مائل تھی پھر ماحول اور اس کے والدین کی ناعاقبت اندیشانہ روِش سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ چناں چہ جب اس نے شباب کے ہیجان انگیز میدان میں قدم رکھا تو پھر اس کا دماغ ہر قسم کی قیدوبند سے آزاد ہو گیا۔ دراصل صحیفۂ زندگی کا یہی ایک ورق ہے جو اغراض و مقاصد، سُود و زیاں اور نفع و نقصان کے نقوش

سے معرّا ہوتا ہو اس لیے سچ پوچھیے تو جذبات کے اظہار اور شاعری کا زمانہ بھی یہی ہو چناں چہ امراء القیس صہبائے شباب کی سرمستیوں میں اپنے والد اور معاملاتِ حکومت و سیادت سے کنارہ کش ہوگیا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اور اپنی تمام تر توجہ لہو ولعب، مجلسِ شراب و سرود، عورتوں کے حسن و عشق، سیر و شکار کی طرف مبذول کردی۔

قاعدے کے مطابق اس کے پاس اربابِ عیش ونشاط کا جمگھٹا ہونے لگا اور عرب کے اوباشوں کو ایک سردار بھی مل گیا۔ عیاشوں اور بدمعاشوں نے اس کی رفاقت اختیار کرلی۔ پھر کیا تھا قبائل کی لوٹ اور غارت گری شروع کردی۔ شراب پینے، شعر گانے اور بدمستی میں ہر قسم کی ناشایستہ حرکات کے مرتکب ہونے لگے۔ ان میں سے بعض شاعر بھی تھے جو اپنے اشعار امراء القیس کی جانب منسوب کرتے۔ لیکن نقادانِ سخن نے ان اشعار کا پتا چلالیا ہو اور انھیں الگ کرکے بتلا بھی دیا ہو۔ لیکن خود امراء القیس نے بہت سی ان کی خصوصیات کو اختیار کیا جس سے اس کے بعض طبعی رجحانات کو صدمہ بھی پہنچا ہو۔

ابنِ کلبی کا بیان ہو کہ اس کے والد نے شعر گوئی کی وجہ سے اس کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے نہ ملنے کی قسم کھالی تھی۔ لیکن ابنِ رشیق نے لکھا ہو کہ اس کے والد نے اس کو عشرت پسندی، مغازلہ اور ناؤنوشی کی وجہ سے الگ کردیا تھا کیوں کہ یہ چیزیں اصحابِ حکومت کے لیے کسی طرح زیبا نہ تھیں۔ شعر گوئی کی وجہ سے الگ کرنے کا کوئی سبب نہ تھا کیوں کہ شاعری وہاں کے شرفا کے نزدیک کوئی معیوب چیز نہ تھی۔ چناں چہ سلمہ، معدی کرب، مہلہل، حجر سب کے سب شاعر تھے۔

ایک روایت ہو کہ اس کے باپ نے اسے صرف اس بنا پر الگ کردیا کہ امراء القیس نے کسی عورت یا پڑوسن کے بارے میں تشبیب کی تھی یا شرجیل کی بیٹی عنیزہ کے متعلق اظہارِ خیال کیا تھا یہ بھی کہا گیا ہو کہ اس نے ان دونوں کے بارے میں اس وقت تشبیب کہی جب اس کے باپ نے اس کو نکال دیا اور وہ ان دونوں کے قبیلے میں جاکر مل گیا۔ تاریخ کے صفحات میں یہ بھی مرقوم ہو کہ اس کے باپ نے اس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا اور اپنے ایک غلام سے کہا کہ اس کو کہیں لے جاکر اس کی دونوں آنکھیں نکال ڈالو۔ چناں چہ غلام اسے لے بھی گیا مگر معاً اسے خیال آیا کہ جب اس کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو یقیناً اسے اس واقعے

سے قلق ہوگا۔ وہ گیا اور کسی جانور کی آنکھیں نکال کر اس کے سامنے لایا، اور امرءالقیس کو کہیں چھپا دیا۔ جب باپ نے وہ آنکھیں دیکھیں تو غمگین ہوا۔ اس کے بعد غلام امراءالقیس کو لایا تو باپ بہت خوش ہوا اور اسے شعرگوئی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کچھ دنوں تک وہ ضبط کیے رہا۔ مگر پھر جذبات اُمڈے اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے۔

الا عم صباحا ایها الطلل البالی

تو اس کا باپ پھر خفا ہوا اور اسے دوبارہ گھر سے نکال دیا۔

لیکن یہ تمام روایتیں فرضی ہیں اور ان کی حیثیت افسانے سے زیادہ نہیں۔ البتہ مذکورہ بالا بیانوں میں سے اگر کوئی بات قابلِ قبول ہے تو صرف اتنا ہی کہ امراءالقیس اپنے باپ کے نکالنے سے پہلے لہو و لعب میں اتنا منہمک نہ تھا۔ چناں چہ اس کا وہ کلام پڑھیے جس کو اس نے اپنے باپ سے جدا ہونے کے قبل کہا تھا۔

فلو انما اسعیٰ لادنیٰ معیشۃ کفانی ولم اطلب قلیل من المال

اگر تھوڑی معیشت کے لیے کوشش کروں تو میرے لیے وہ کافی ہوگی لیکن تھوڑے مال کے لیے میں جستجو نہیں کرتا۔

ولکنما اسعیٰ لمجد موثل وقد یدرک المجد الموثل امثالی

لیکن میں تو ایک پائے دار شرف کے لیے کوشش کرتا ہوں اور میرے جیسے انسان شرف حاصل کرلیتے ہیں۔

وما المرء مادامت حشاشۃ نفسہ بمدرک اطراف الخطوب ولا آلی

انسان جب تک زندہ رہتا ہے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کوشش سے باز نہیں رہتا اور نہ ناامید ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا باپ اس کے بڑے بھائیوں کو اس پر ترجیح دیتا تھا اس لیے اِمراءالقیس نے اِن سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اور اپنے دِل کو لہو و لعب سے تسلی دینے لگا۔ جب اس کو اپنے باپ کے قتل کی خبر پہنچی تو کہا "جب میں چھوٹا تھا تو مجھے ضائع کردیا اور جب بڑا ہوا تو اپنے خون کا بار مجھ پر ڈال دیا" اس سے معلوم ہوا کہ اِمراءالقیس کے خراب ہونے کا سبب خود اس کا باپ ہے وہ نہیں۔

وہ شہروں اور وادیوں کی خاک چھانتا موضع دمون میں پہنچا تھا، وہیں پر اپنے باپ کے قتل ہونے کی خبر سُنی۔ جس وقت اسے یہ خبر ملی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، اس کے دوستوں نے کھیل بند کردیا

پھر امراءالقیس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک اپنے باپ کا قصاص نہ لے گا، تیل اور خوش بو استعمال نہ کرے گا۔ اور نہ کسی کھیل سے دِل چسپی لے گا نہ کسی عورت سے تعلق رکھے گا اور نہ کبھی غسل کرے گا۔ نہ شراب پیے گا اور نہ کبھی گوشت کھائے گا۔ اس نے وہ رات بڑی بے چینی سے گزاری۔ کبھی دُشمنوں کے بارے میں ہجو اور غصّے کا اظہار کرتا اور کبھی اپنی مصیبتوں کی داستان کہتا۔ کبھی رات کی درازی کی شکایت کرتا تو کبھی ماضی کی یاد میں آنسو بہاتا۔

باپ کا بدلہ لینے کے لیے اور مُلک کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ ایک فوج تیّار کرنے لگا۔ جب بنی اسد کو اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے چند آدمیوں کو وفد کی شکل میں اس کے پاس بھیجا جس میں خاص کر عبید ابنِ ابرص اور قبیصہ ابنِ نعیم بھی تھے۔ جس وقت یہ لوگ اس کے پاس پہنچے وہ چھپ گیا اور تین روز تک برآمد نہ ہوا پھر سیاہ قبا اور عمامہ پہن کر ان کے سامنے آیا۔ (عرب سیاہ عمامہ کسی بڑی مصیبت کے وقت پہنا کرتے تھے) قبیصہ اسے دیکھتے ہی فوراً آگے بڑھا اور کہنے لگا:۔

''یقیناً تم بلند مرتبہ اور ذی مرتبت آدمی ہو۔ زمانے کے انقلابات اور حوادثِ روزگار سے خوب واقف ہو اس کے لیے تمھیں کسی واعظ کی ضرورت نہیں۔ تمھارے اندر خاندانی شرافت اور منصبِ سیادت ہے شریف النسل انسان لغزشوں کو معاف کردیا کرتا ہے جو کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں وہ دراصل ایک بہت بڑے سانحے کی پیش خیمہ تھیں ناممکن ہے اس کی مصیبتوں سے نزار و یمن اور کندہ کا کوئی فرد محفوظ رہے۔ تمھارا باپ ایک باوقار شخص تھا۔ اگر مقتول کا فدیہ لیا جائے تو ہمارے سردار فدیہ دینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ ایک ایسی ہستی تھی جس کا بدلہ یہ ادنیٰ چیزیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے حالات کے پیشِ نظر تین شرائط میں سے ایک کو اختیار کرلو۔ اور وہ شرائط یہ ہیں:۔

(۱) بنی اسد کے سب سے شریف اور بڑے آدمی کو چُن لو جس کو ہم تمھیں سونپ دیں گے۔ وہ پوری قوم کا کفارہ ہوگا۔

(۲) یا فدیہ لینا قبول کرو اور جتنے چاہو اونٹ لے لو۔

(۳) ورنہ اس جنگ کے لیے تیار ہوجاؤ جس کی ہیبت سے حاملات کے حمل ساقط، اور جس کے بوجھ سے پُشت خم ہوجائیں۔ اور اپنی تمام چیزوں کو جنگ کے جھنڈوں پر قربان کردیں۔''

اس بات کو سُن کر امراءالقیس آب دیدہ ہوگیا اور کہا کہ عرب اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ خوں بہا میں جبر

کا کوئی ہم سر نہیں اور ہیں فدیے میں اونٹ وغیرہ لے کر ہمیشہ کے لیے لوگوں کے طعنے کا داغ اپنے اوپر نہیں لگاسکتا۔ لہٰذا تیسری شرط کے سوا اور کچھ نہیں ۔

چناں چہ اس نے اِدھر اُدھر جاکر قبیلوں سے بنی اسد کے خلاف مدد مانگنی شروع کی ۔ اس کے ماموں بکر و تغلب نے ایک لشکرِ گراں سے اس کی مدد کی ۔ اس نے جاکر بنی اسد پر حملہ کردیا، بنو اسد بھاگ کھڑے ہوئے ۔ تو ان کا پیچھا کیا ۔ جب اس کی فوج پیاس کی شدّت سے پریشان ہورہی تھی اور بنو اسد ایک چشمے پر خیمہ زن تھے کہ یہ ناگاہ ان پر فوج لے کر ٹوٹ پڑا خوب لڑائی ہوئی دونوں طرف کے سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے ۔ جب رات ہوئی تو پھر بنو اسد بھاگ نکلے امراءالقیس نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر بکر و تغلب کے لوگوں نے لڑنے سے انکار کردیا اور کہا کہ اب تمھارے باپ کا بدلہ ادا ہوگیا ان کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت؟ یہ کہہ کر وہ لوگ واپس لوٹ گئے ۔ امراءالقیس وہاں سے مرثد بن ذی جدن کے پاس گیا ۔ مرثد نے اپنے پانسو آدمی اس کی طرف سے لڑنے کے لیے دیے ۔ اور کچھ عرب بھی اس کے ساتھ ہوگئے ۔ ان کو لے کر بنو اسد پر پھر اس نے چڑھائی کردی اور کام یاب ہوگیا ۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان سخت عداوت پڑگئی اور جنگ کا سلسلہ بہت دنوں کا جاری رہا ۔

ادھر منذر بن ماءالسما نے جو شاہانِ کندہ کا ازلی دشمن تھا امراءالقیس کو اس حالت میں دیکھ کر اسے ہزیمت دینے کی ٹھان لی اور کسریٰ انوشرواں سے ایک جرّار فوج لے کر اس کی تلاش میں نکلا ۔ حمیریوں نے جب یہ حالت دیکھی تو امراءالقیس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ عرب حلیفِ فارس اور آلِ منذر کے مقابلے میں اس کی مدد نہیں کریں گے تو وہ ان کے سیاسی حریف روم اور آلِ غسّان کی طرف متوجّہ ہوا ۔ چناں چہ اس سلسلے میں وہ پہلے سموئل بن عادیا کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام ایک خط لکھ دے کہ وہ اس کی قیصرِ روم سے ملاقات کرادے ۔ اس نے منظور کرلیا اور امراءالقیس وہیں اپنا تمام سامان رکھ کر اور اس خط کو لے کر روانہ ہوا حارث کے پاس پہنچا تو اس کی بڑی عزت ہوئی اور اس نے امراءالقیس قیصرِ روم "پوستینانس" کے پاس عمرو بن قمیئہ اور جابر بن حنی التغلبی کے ساتھ روانہ کردیا امراءالقیس جب قیصر کے پاس پہنچا تو قیصر نے بہت آؤ بھگت کی اور اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا ۔ اس کے بعد قیصر نے

امراءالقیس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور کیا کیا سلوک کیے، اس بارے میں مورّخینِ عرب مشکوک نظر آتے ہیں انھوں نے بیان کیا ہے کہ قیصر نے ایک بھاری فوج سے اس کی مدد کی جس میں امرائے روم کے بہت سے نوجوان بھی تھے۔ اِدھر امرؤالقیس کے آنے کے بعد ہی بنی اسد نے اپنے ایک آدمی طمّاح نامی کو قیصر کے پاس روانہ کردیا۔ تاکہ وہ قیصر اور اس کے درمیان اختلاف و رنجش کی خلیج حائل کردے چناں چہ جس وقت امراءالقیس فوج لے کر چلا تو اس نے امراءالقیس کے خلاف قیصر کے حضور میں زہر اُگلنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی کہا کہ امراءالقیس ایک آوارہ اور گم راہ شخص ہے حتّٰی کہ یہاں سے فوج لے کر روانہ ہوا تو آپ کی صاحب زادی سے پیام سلام شروع کردیے اور اس کے متعلّق کچھ عاشقانہ اشعار بھی کہے ہیں جو سارے عرب میں مشہور ہوچکے ہیں اس سے آپ کی اور آپ کی صاحب زادی دونوں کی بڑی رُسوائی ہوگی۔ قیصر نے جب یہ باتیں سُنیں تو وہ جی ہی جی میں پریشان ہوا اور اس غصّے میں اس نے ایک ذرہ تیار کروائی جو زہر میں بجھی ہوئی تھی پھر اُسے امرؤالقیس کے پاس بھیج دیا۔ جس کو امراءالقیس نے عین گرمی کے دنوں میں پہن لیا پھر کیا تھا تمام زہر اس کے جسم میں سرایت کرگیا اور جسم کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ یہ دیکھ کر جابر بن ضبی نے ایک سواری تیار کی اور اس پر سوار کرکے "انقرہ" میں پہنچایا جہاں اس کا کام تمام ہوگیا۔ پھر وہ وہیں پر دفن کردیا گیا۔

رومی مورّخین مثلاً "نونوز" اور "برکوب" کا بیان ہے کہ امراءالقیس نے (وہ لوگ اس کو صرف قیس کہتے ہیں) قیصر کے پاس جانے سے پیش تر خط و کتابت کی تھی جس میں منذر و فارس کے مقابلے میں اپنے لیے مدد مانگی تھی پھر اس کے پاس گیا تو وہ عزّت سے پیش آیا اور مدد دینے کا وعدہ کیا پھر اس کو فلسطین کا انتظام سپرد کردیا وہاں سے وہ جارہا تھا کہ انقرہ پہنچتے پہنچتے اس کو "ذات القروح" کی بیماری ہوگئی اور اسی مرض میں مرگیا اور انقرہ میں دفن ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ رومی مورّخین کی رائیں اس بارے میں زیادہ قابلِ قبول ہیں کیوں کہ یہ واقعہ روم کا ہے اور وہاں کا مورّخ غیروں سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے پھر عرب ذات القروح کی بیماری سے بالکل آشنا نہ تھے جب امراءالقیس اس بیماری میں مبتلا ہوا تو ان کے لیے یہ ضرور اچنبھے کی بات تھی۔ یہی وجہ ہے

کہ انھوں نے اس کی موت کا عجیب وغریب قصّہ گھڑ دیا ہو چناں چہ یہ لوگوں کی خاصیت بھی ہو کہ جب کوئی انوکھی چیز سمجھ میں نہیں آتی ہو تو اس کے لیے ایک علت تلاش کرلیتے ہیں۔ حالاں کہ بیان کیا جاتا ہو کہ جب قیصر کو اس کی موت کی خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ایک پُتلا بناکر قبر پر نصب کردیا جائے چناں چہ یہ تمثال مامون الرشید کے زمانے تک موجود تھی۔ اور جب وہ رومیوں سے لڑنے گئے تو اس تمثال کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہ واقعہ بھی رومی مورخین کی تائید کرتا ہو کہ قیصر اور امراءالقیس کے تعلقات موت تک خوش گوار رہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہو کہ کیا فلسطین کی سیادت یا فلسطین کے بعض قبائل پر حکومت مل جانے سے اس نے اپنی آبائی حکومت کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے باپ کا خوں بہا لینا بھول گیا۔ جس کے لیے وہ اتنے جتن سے قیصر کی خدمت میں گیا تھا؟ اس سوال سے ضرور ہمیں تھوڑا سا شک پیدا ہوتا ہو مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس اقتدار سے خوش نہ تھا اور اگرچہ اس نے عدمِ رضا کا قیصر سے اظہار نہیں کیا مگر اپنی ناکامیابی سے بہت مغموم تھا اور اسی رنج سے راستے میں اس کی روح پرواز کرگئی۔

زمانۂ حال کے بعض مصری ادیبوں کا خیال ہو کہ اگر امراءالقیس قسطنطنیہ قیصر کے پاس گیا تھا تو اس کے اشعار میں ضرور کچھ نہ کچھ اس بہترین شہر کا ذِکر ہوتا، یا اس کے کلام میں کم سے کم سفر کے متعلق کچھ واقعات ہی درج ہوتے۔ جس سے اس واقعے کی تائید ہوتی۔ لیکن ان کے لیے صرف اتنا ہی بس ہو کہ روم کے مورخین نے اس سفر کا ذِکر کیا ہو۔ اور اس کی تائید موجودہ دور کے مغربی مورخین کے یہاں بھی ملتی ہو۔ چناں چہ نکلسن اپنی کتاب "تاریخ ادبِ عربی" میں لکھتے ہیں:۔

"امراءالقیس کا باپ حجر بنی اسد پر حکومت کرتا تھا جب وہ قسطنطنیہ گیا تو شہنشاہ یوستنیانوس نے اس کی بڑی عزت کی۔ اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ کندہ کی حکومت کی تائید کرکے فارس کے پہلو میں کانٹا چبھادے۔ اسی لیے اس کو فلسطین کا امیر بنایا۔ وہاں سے وہ جارہا تھا کہ ناگاہ راستے میں موت آگئی۔ اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال نہ کرسکا اور پھر وہ اتنا کم ظرف بھی نہ تھا کہ فلسطین کی حکومت پر خوش ہوتا اور اس کے لیے شعر کہتا پھر بھی اس سفر کی یادگار اس کے ان اشعار سے واضح ہوجاتی ہو۔

تذکرت هنداً و اترابها فاصبحت ازمعت منها صدودا

و نادمت قیصر فی ملکه فاوجهنی ورکبت البریدا

ان تمام واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہو کہ باپ کی وفات کے بعد امراءالقیس کی حالت پہلے جیسی نہ رہی اور وہ خوں بہا کی خاطر خوں ریزی پر تُل گیا اور اس بات کو نظرانداز کردیا کہ اس کے باپ کا قتل ظلم و جبر کے سبب ہوا اس نے کشت و خون کے ذریعے ملک واپس لینے کی خواہش کی۔ حالاں کہ اس کو چاہیے تھا کہ جب بنی اسد کا وفد اس کے پاس آیا تھا تو اسی وقت ان کی شرائط کے مطابق صلح کرلیتا۔ لیکن وہ شبابی جذبات پر قابو نہ پاکر بدلہ لینے کے لیے آمادہ ہوگیا جس کا انجام تباہی ہوا۔ بہ ہر حال امراءالقیس کے اس زمانے کے اشعار بہترین ہیں کیوں کہ جب اس کے اعوان و انصار اور یاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو یک بہ یک اس کی آنکھوں کے پردے اُٹھ گئے اور وہ اس غم میں اپنے تجربات اور حکمت کی باتیں بیان کرنے لگا۔

سال وفات عام مورخین کا خیال ہو کہ امراءالقیس چھٹی صدی عیسوی میں گزرا ہو۔ بعض اس کو پانچویں صدی پہلے بتلاتے ہیں لیکن اگر اس کا باپ ۵۲۹ء میں قتل ہوا ہو تو زیادہ ارجح روایت یہ ہوگی کہ وہ ۵۰۰ء میں پیدا ہوا چناں چہ رینان فرانسیسی کا بھی یہی بیان ہو بعض روایت میں یہ بھی ہو کہ وہ ۵۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۵۶۵ء میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ہو ۵۴۵ء میں مرا ہو لیکن ہمارے لیے کوئی خاص سن متعین کرنا ناممکن ہو کیوں کہ اس زمانے کی طرح اس وقت سن کا التزام نہیں کیا جاتا تھا

قومیت اور مذہب انسان کی زندگی پر دین و مذہب کا ایک گہرا اثر پڑتا ہو اس کے اخلاق و معاشرت خیال و عمل پر مذہب کا رنگ جھلکتا ہو۔ اب تک جہاں ہم نے امراءالقیس کے زندگی کے واقعات پر تبصرہ کیا مناسب ہو کہ اس کے عقائد اور مذہب کے متعلق بھی عرض کردیں تاکہ آیندہ کلام پر نظر ڈالتے وقت یہ امور پیشِ نظر رہیں۔

سب سے پہلے اس کے جدِ اکبر حارث نے جب منذر بن ماء السماء نے مزدکیت کے اختیار کرنے سے انکار کردیا تو اس نئے مذہب کو اختیار کرکے حکومت کا وارث بن گیا اور قباذ نے اس کے صلے میں حیرہ کی حکومت عطا کی پھر "النّاس علیٰ دینِ ملوکهم" کے مصداق کندیوں کا بھی اسی مذہب پر عمل ہوگیا۔ اس سے یہ بھی

معلوم ہوتا ہے کہ کندیوں کا مذہب کے بارے میں کوئی مستقل اور پائے دار نظریہ نہ تھا۔ چناں چہ جب قباذ مرگیا اور اس کی جگہ پر انوشیرواں بادشاہ ہوا اور حارث کو اس نے حیرہ سے معزول کردیا تو پھر انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا۔

ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا قبیلہ مصالح اور اغراض کے ماتحت مذہب کا پرستار تھا ان کے نزدیک عرب میں نہ تو کوئی بُت قابلِ احترام تھا نہ مزدکیت قابلِ ستایش اور نہ مجوسیت کوئی اہمیت رکھتی تھی اور نہ وہ نصرانیت ہی سے کچھ مانوس تھے۔ اسی ماحول سے امراءالقیس کا بھی متاثر ہونا ضروری ہے اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ اس نے لامذہبیت میں پرورش پائی۔ زمانۂ شباب میں اس نے شہوات و لذات کی پرستش کی اور اپنے نزدیک دُنیا کی تمام چیزوں کو مباح کرلیا۔ اسی لیے بعض علما کو شبہہ ہوا ہے کہ وہ مزدکیت کا پیرو تھا۔ اور اس کی آڑ میں اپنے خاندان والوں کی طرح اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیوں کہ مزدکیت میں مال و آبرو وغیرہ تو ضرور مباح ہے لیکن قتل و خوں ریزی ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں ہے۔ امراءالقیس کا عمل اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ جب بنواسد اس کے باپ کے بدلے میں ایک شخص کو دے رہے تھے تو وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ پھر جب وہ بنی اسد سے لڑنے کے لیے نکلا تو ایک بُت ذوالخلصہ نامی کی طرف سے اس کا گزر ہوا جہاں پر عرب لوگ تیروں کے ذریعے فال نکالا کرتے تھے۔ امراءالقیس نے بھی فال نکالی تو موافق نہ نکلی، دوبارہ سہ بارہ تیر ڈالے لیکن ہر دفعہ جواب نفی میں نکلا جس سے اسے طیش آگیا تیروں کو بُت کے منھ پر پھینک دیا اور اسے بہت سخت و سست بھی کہا۔ اور گالی دے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ امراءالقیس کا کوئی خاص عقیدہ نہ تھا وہ صرف مصلحت پرست تھا۔ جیسا موقع ہوتا اپنے مقصد کے مدِنظر اس مذہب کا تھوڑی دیر کے لیے حامی بن جاتا۔ اور جب اس کا مقصد پورا ہوجاتا تو فوراً اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا۔ اس معاملے میں اس کے نزدیک عرب کی بُت پرستی اور دوسرے تمام مذاہب یکساں تھے۔

اس کا نام امراءالقیس (قیس) بُت کے نام پر اس لیے نہیں پڑا کہ وہ اس کا معتقد تھا۔ بلکہ ایک محبوب انسان ہونے کی وجہ سے اِس نام سے موسوم ہوگیا۔ آج بھی کتنے ملحدین ہیں جن کا نام علی، حسین وغیرہ ہوگا۔

صرف نام کی وجہ سے امراءالقیس کے عقیدے پر فتوا نہیں لگایا جاسکتا۔

بعضوں نے امراءالقیس کو نصرانی شعرا میں شمار کیا ہو ان کا خیال ہو کہ اس کے آبا نے اس مذہب کو حیرہ میں قبول کیا تھا۔ لیکن اصل یہ ہو کہ حیرہ پر ان کا قبضہ تو مزدکیت کے سبب حاصل ہوا وہ جب تک حیرہ میں رہے کسی دوسرے مذہب سے بالکل ناآشنا تھے۔ البتہ امراءالقیس کی ایک چچی ہندہ بنت حارث اور بعض دوسری رشتے دار عورتیں نصرانی تھیں۔ اس سے اس کا نصرانی ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس خاندان کے لوگ اس عورت کے گھر سے بہت دور دیہات میں رہتے تھے اور وہ "حیرہ" میں جاکر اس وقت نصرانی ہوئی جب کہ اس کی شادی منذر بن ماءالسما سے ہوئی۔ لیکن امراءالقیس کا نصرانی ہونا بعید بھی نہیں ہو کیوں کہ جب وقت عربوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ قیصر کے پاس مدد کے لیے گیا تو شاید اس نے سوچا ہو کہ جس طرح اس کے آباو اجداد مذہب کی آڑ میں شکار کھیلتے رہے اسی طرح وہ بھی مصلحتاً عیسائی ہوجائے اور شاید یہی وجہ ہو کہ اس کی موت کے بعد قیصر نے اس کی بڑی عزت کی۔ اور ایک تمثال اس کی قبر پر نصب کرادی۔

امراءالقیس کے اشعار میں بعض جگہ "اللہ" کا بھی نام آیا ہو مگر وہ اس طرح پر کہ اس کے عقیدے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ وہ کہتا ہو ؎

فقالت سباك الله انك فاضحی ۔۔۔ الست تری السمار والناس احوالی
فقلت یمین الله ابرح قاعداً ۔۔۔ ولو قطعوا رأسی لدیك واوصالی
حلفت لها بالله حلفة فاجر ۔۔۔ لناموا فما ان من حدیث ولا صالی
والله انجح ما طلبت به ۔۔۔ والبر خیر حقیبة الرحل

آخری شعر سے واقعی مذہبیت کا پتا چلتا ہو اور معلوم ہوتا ہو کہ یہ کسی خداترس آدمی کا شعر ہو چناں چہ بعض لوگوں کا خیال بھی ہو کہ اس کا یہ شعر کبھی نہیں ہوسکتا بلکہ کسی دوسرے کا ہو اور غلط طور پر اس کی جانب منسوب ہوگیا ہو۔ اس قسم کی باتیں امراءالقیس جیسے آوارہ منش اور رندانِ قدح خوار کی زبان سے ادا نہیں ہوسکتیں۔ اس بارے میں محققین کی یہ رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہو کہ اس قسم کے جتنے اشعار اس کے دیوان میں ملیں گے سب کے سب ہنسی دل لگی کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

اصلی زبان | جس عربی زبان میں امراء القیس کا کلام موجود ہے وہ عدنانی زبان ہے کیوں کہ اس کا قبیلہ کندہ بھی عدنانی ہے اس لیے اس کا کلام اگر عدنانی زبان کے مطابق ہو تو کوئی تعجب نہیں ۔لیکن جمہور علمائے انساب کا خیال ہے کہ وہ قحطانی ہے تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ قبیلہ کندہ نجد کی طرف چلا گیا ہوگا اور عدنانیوں پر اس نے حکومت کی ہوگی ۔ غالباً یہ زمانہ حسّان بن تبع کا زمانہ ہے جو پانچویں صدی کے اوائل میں تھا (۴۲۰-۴۲۵) اور یہ خاندان پورے پانچویں صدی میں یا چھٹی صدی کے اوائل تک یعنی امراء القیس کے ظہور تک رہا اس زمانے میں یمن پر حبشہ کا قبضہ ہوگیا اور حمیر کی حکومت وہاں سے ختم ہوگئی ، اس کے ساتھ ساتھ کندہ کے تعلقات اس سے منقطع ہوگئے تو وہ شمال کی طرف چلے گئے اور ان کے تعلقات عدنانیوں سے استوار ہوتے گئے ۔ پھر ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں مختلف قبیلوں پر قائم ہوتی رہیں ۔ انھی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں ایک حجر کی بھی حکومت تھی جو بنی اسد پر حکم راں تھے ۔ اس طرح علمائے انساب کے نزدیک امراء القیس کے کندی قحطانی خاندان کی زبان عدنانی ہوگئی ۔

ان تمام دلائل کے علاوہ ایک اور دلیل بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امراء القیس کا عدنانی زبان سے متاثر ہونا ناگزیر تھا ۔ امراء القیس کی ماں فاطمہ تغلبی تھی جو عدنانی ہے ظاہر ہے ماں کا اثر اولاد پر بہت زیادہ پڑتا ہے ۔خصوصاً زبان اور عادات و اخلاق پر تو بہت گہرے نقوش مرتسم ہوتے ہیں ۔ پھر امراء القیس جن دو شاعروں کی صحبت سے فیض یاب ہوا وہ عدنانی ہیں ۔ اور اس کے باپ کا شاعر "عبید ابنِ ابرص" بھی عدنانی ہے جس نے امراء القیس کے کلام پر انھی دونوں شاعروں کی طرح اثر ڈالا ہے مختصر یہ کہ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ قحطانی شاعر عدنانیوں کی صف میں نظر آرہا ہے ۔

بعض مستشرقین نے ان تمام عوامل سے قطع نظر کرکے کہہ دیا ہے کہ یہ تمام اشعار جو عدنانی زبان میں ہیں اور امراء القیس کی طرف منسوب ہیں غلط ہیں اس لیے کہ وہ قحطانی تھا ہم اس بارے میں انھیں معذور سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انھیں واقعات کا صحیح علم نہیں اور ان کی نظریں حقیقت رس نہیں ہیں پھر ان ادیبوں کی عقل پر حیرت ہے جو کہتے ہیں کہ یہ اشعار اس کی طرف غلط منسوب ہیں اگر یہی ان کے نزدیک معیارِ تحقیق و نظر ہے تو پھر اس طرح سے ایک ہزار برس کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ "احمد شوقی بک" کے تمام اشعار منسوب الیہ

ہیں۔کیوں کہ وہ عربی نہیں ہیں اوران کے اشعار کی زبان عربی ہے۔

عدنانی زبان کے مختلف لہجے تھے اور امرا القیس کا کلام بھی اس کے قبیلے کے لہجے سے مختلف ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی میں شعر اختلافِ لہجات سے پہلے آیا یا اس کے بعد؟ اس مشکل سوال کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ عربی زبان کا اختلافِ لہجات سے پہلے ایک مدت دراز تک بغیر شعر و ادب کے رہنا غیر معقول سی بات ہے۔ سچ پوچھیے تو اختلافِ لہجات سے پہلے ادب اور شعر موجود تھے اور جو لوگ اس زمانے کے قریب گزرے ہیں وہ سب کے سب اسی طرز پر شعر کہا کرتے تھے۔ وہ جدت بھی اگر پیدا کرتے تھے تو وہ فقط لفظی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ادب کی ایک متفقہ زبان تھی۔ مگر معدودے چند افراد ایسے بھی تھے جو اس شاہ راہ سے ہٹ کر گفتگو کرتے تھے۔ پھر جب خفیف سا لہجہ تبدیل ہوا تو اس وقت بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اور وہ سب کے سب ایک دوسرے کی زبان اور لہجے سے بہ خوبی آشنا تھے۔ آج بھی ہم کو بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو عربی میں قدامت کا نشان ہیں اوران سے ان شعرا کا بھی پتا چلتا ہے جو اسلام سے پہلے گزرے۔ تاریخ میں بھی ان کے نام زندہ ہیں اگران کے اشعار دست یاب نہ ہوتے تو وہ کبھی کے فراموش کردیے گئے ہوتے۔ ان غیر معروف شعرا میں ایک "ابنِ خزام" ہے جس کا ذکر امرا القیس نے اپنے شعر میں کیا ہے ؎

عوجاً على الطلل المحيل لاننا		نبكي الديار كما بكى ابن خزام

علامہ سیوطیؒ اپنی کتاب "المزہر" میں لکھتے ہیں:۔

"ابنِ خزام کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ قبیلۂ طے کا فرد ہے اس کے علاوہ اس کے اشعار کا پتا نہیں اور نہ اس کے علاوہ کہیں اس کا ذکر ملتا ہے"

زہیر بن سلمیٰ کہتا ہے ؎

ما ارانا نقول الا معاراً		او معاداً عن لفظنا مكرورا

اس شعر میں زہیر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کے معاصرین کے کلام شعرائے قدیم کے کلام سے مستعار ہیں عنترہ بن شداد العبسی کہتا ہے ؎

هل غادر الشعراء من متردم　　　　ام هل عرفت الدار بعد توهم

اس شعر میں وہ کہتا ہے کہ اگرچہ قدما نے کچھ نہیں چھوڑا ہے مگر پھر بھی وہ نیا شعر پیدا کرسکتا ہے۔

کلام کی تدوین

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب چوں کہ اُمّی وناخواندہ تھے اس لیے اسلام سے پہلے وہ قدیم شعرا کے کلام مدوّن نہ کرسکے لیکن یہ خیال صحیح نہیں بلکہ ان کی نظر سے شعرائے جاہلیت کے کلام نہیں گزرے ہیں ورنہ معلوم ہوتا کہ کلامِ عرب کے نہ مدوّن ہونے کے خاص اسباب ہیں۔ اور شاید انھی اسباب کے ماتحت اسلام کے دوسو برس بعد ان کا کلام صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوسکا۔

یوں تو ان کی کتابت کا حال آلِ منذر کے وقت سے معلوم ہوچکا ہے لیکن پھر بھی اس بارے میں ان کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے کے فن سے بالکل ناآشنا نہ تھے البتہ وہ تحریر وکتابت کو بہت معیوب سمجھتے تھے اور وہ فطرۃً ہر چیز کو زبانی یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے چناں چہ حدیثوں سے بھی اس کی تائید ملتی ہے:-

"مذهب العرب انهم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذالک"

اصل یہ ہے کہ عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اُڑاتا تھا ان کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا "حرف فی تامورک خیر من عشرۃ فی کتبک" دِل میں ایک حرف کا محفوظ رکھنا کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے۔" عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لیس بعلم ما حوی القمطر　　　　ما العلم الا ما حوی الصدر

علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے۔　　　　نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینے میں محفوظ ہو۔

دوسرا کہتا ہے ؎

استودع العلم قرطاساً فضیعہ　　　　وبئس مستودع العلم القراطیس

جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔

تیسرے کا شعر ہے

علمی معی حیث ما یممت احملہٗ		بطنی وعاء لہ لا بطن صندوق

میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اسے اٹھائے لیے جاتا ہوں میرا باطن اس علم کا برتن ہے نہ کہ شکمِ صندوق۔

ان کنتُ فی البیت کان العلم فیہ معی		اذا کنتُ فی السّوق کان العلم فی السّوق

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔

ان اشعار سے عربوں کے خاص رجحان کا پتا چلتا ہے اور لکھنے اور کتابت کے متعلّق ان کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ اس خاص مذاق کا نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظے پر بھروسا کرنا پڑتا تھا ظاہر ہے کہ انسان اپنی جس قوّت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اس میں جِلا پیدا ہوجاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی غالباً یہی وجہ ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ "انّ العرب قد خصّت بالحفظ" عرب قوّتِ حافظہ میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ان کے قوّتِ حافظہ کے حیرت انگیز واقعات کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ لیکن کتابی قوموں کے لیے ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ بہرحال کلامِ عرب کی تدوین عہدِ عبّاسی سے شروع ہوئی اور اس عہد کے علما نے خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ ان میں سے بعض ثقہ علما مثلاً ابوعمرو بن علا، اصمعی، خالد بن کلثوم اور محمّد بن حبیب نے امراء القیس کا کلام بھی جمع کیا۔ ان کے بعد ابوسعید السّکری، ابوالعبّاس احول، ابن سکیت وغیرہ اس کے اشعار کی روایتوں کو اکٹھا کرتے رہے ان کے علاوہ اور بہت سے ثقات جیسے ابوعبیدہ اور ابوعمرو الشیبانی اور معضل الضّبی نے نے ان اشعار کی روایتوں کی کاٹ چھانٹ کی اور بہت سے اشعار کا اضافہ کیا۔ سب سے زیادہ ثقہ روایت ابوحاتم السجستانی کی ہے، جس کو وہ اصمعی سے روایت کرتے ہیں بہتر ہوگا ان رواۃ کے متعلّق آئمۂ جرح تعدیل کی رائے معلوم کرلی جائے۔

(۱) ابوعمرو بن علا ——— ان کا نام قرائے سبعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ عربی ادب، قرآن اور شعر کے زبردست عالم تھے۔ اتنی کتابیں تصنیف کیں جن کا انبار ان کے کمرے کی چھت تک اونچا جاتا تھا۔ انھوں نے روایات میں بہت محنت سے کام لیا تھا اور جب قرآن کے متعلّق ان پر کوئی الزام نہیں تو

شعر میں کیسے ہوسکتا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۴ھ میں ہوئی۔

(۲) اصمعی —— نام عبدالملک بن قریب ہے۔ نحو، لغت، تاریخ میں ان کا ثقہ ہونا مسلّم ہے۔ ربیع بن سلیمان نے امام شافعی سے سُنا وہ کہا کرتے تھے کہ "اصمعی جیسی عبارت سے کوئی عرب فوقیت نہیں لے گیا۔" مامون نے بہت چاہا کہ اصمعی اس کے پاس چلے آئیں مگر وہ نہ آئے۔ اکثر مشکل مسائل مامون ان کے پاس بھیجا کرتا۔ قرآن و سنّت کی تفسیر میں اصمعی بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب کوئی قرآن و سنّت کی باتیں پوچھتا تو وہ کہتے کہ عرب اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں اور میں اس سے زیادہ کتاب و سنّت کے بارے میں اور نہیں جانتا۔ ان کی وفات ۲۱۶ھ میں ہوئی۔

(۳) ابوعبیدہ —— نام معمر بن مثنّیٰ ہے حافظ کہتے ہیں کہ تمام علوم میں اس سے زیادہ کوئی ماہر نہیں۔ اس کی سب سے زیادہ معلومات 'غریب اشعار'، 'اخبارِ عرب' اور 'ایامِ عرب' میں ہے۔ ابوعبیدہ' اصمعی اور ابوزید انصاری تینوں ایک ہی زمانے میں آئمۂ ادب تھے۔ مگر تینوں میں جامعیت ابوعبیدہ کے اندر تھی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ابوزید نحو کا سب سے بڑا عالم تھا۔ علی بن مدینی بیان کرتے ہیں کہ ابوعبیدہ عرب کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں بالکل صحیح بیان کرتے ہیں ان کی وفات ۲۰۹ھ میں ہوئی۔

(۴) ابوحاتم سجستانی —— نام سہل بن محمّد ہے یہ کثیر الرّوایت تھے لغت اور شعر سے خوب واقف تھے اور عروض بھی بہت اچھا جانتے تھے۔ لغت میں ان کی بہت سی تالیفات ہیں۔ ان کے بیانات بہت صحیح ہیں۔ کتابوں پر بہت عبور تھا۔ مشکل سے مشکل مسائل حل کرتے تھے۔ اور نہایت دقیق النظر تھے ان کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی۔

اکثر وہ کتابیں جن میں امراءالقیس کے اشعار جمع کیے گئے ہیں یا ان کی شرح کی گئی ہے ان کا دار و مدار انھی علما کی روایتوں پر ہے۔ ان میں سے خاص کر حاتم اصمعی سے جو روایت کرتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) "شرح دیوانِ امراءالقیس" —— وزیر ابی بکر عاصم بن ایوب بطلیموسی النحوی متوفی ۴۹۱ھ کی ہے۔ یہ کتاب بار بار شائع ہوچکی ہے۔ گو اس کتاب میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ یہ روایت کس سے لی گئی ہے مگر جہاں تک

پتا چلتا ہو کہ ابوحاتم کی روایتیں ہیں البتہ صرف دو قصیدے ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ روایت کس کی ہو۔

(۲) ''دواوین الشعرا الستۃ الجاہلین'' —— یعنی امراءالقیس، علقمہ، زہیر، نابغہ، طرفہ، عنترہ کے کلام اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ مغربی مطبع کا چھپا ہوا مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہو۔ جس کے اندر اشعار کی شرح بھی موجود ہو۔ اس کتاب کی ابتدا امراءالقیس کے شعر سے ہوتی ہو۔ کل اٹھائیس[۲۸] قصائد بروایت حاتم جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے پہلے اور آخری قصیدے کے علاوہ تمام قصیدوں کی شرح وزیر ابوبکر نے کی ہو۔ اور آخر میں لکھا ہو'' حاتم کا بیان ہو کہ جن قصائد کی اصمعی نے تصحیح کردی ان سے یہ الگ ہو اور اس کے بہت سے اشعار اس کے مصاحبوں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں''۔ ہم کچھ ایسے چیدہ اور منتخب قصائد پیش کرتے ہیں جن پر ابوحاتم کی نظر نہیں پڑی ہو اصمعی ان کو ربیعہ بن جشم کا قصیدہ بتاتے ہیں مثلاً

(۱) احار بن عمر کانی خمر (۲) الانعم صباحا ایہا الربع فانطق (۳) امن ذکر سلمٰی اذ نانک تنوص

(۴) حی الحمول بجانب العزل (۵) تطاول لیلک بالاثمد (۶) جزعت ولم اجزع من البین مجزعا

اس دیوان کے ایک قصیدے (اعنی علیٰ برق اراہ ومیض) کے متعلق کہا جاتا ہو کہ یہ ابوداؤد کا ہو چنانچہ یہ حاتم کی روایت ہو تین اور بھی قصیدے ہیں جن کو وزیر ابی بکر نے حاتم سے روایت کی ہو، مختلف فیہ ہیں۔ ان قصائد کی طرف ایک اور مقطع کا اضافہ کیا جاتا ہو ؏ —— '' الا لا تکن ابل فمعزی''

وزیر ابوبکر نے اپنی شرح میں لکھا ہو کہ اصمعی کے نزدیک یہ امراءالقیس کا مقطع نہیں بلکہ ان کا قیاس حطئیہ کی طرف ہو۔ قصیدۂ '' خلیلی مرابی علی ام جندب '' کے متعلق عام طور پر خیال ہو کہ وہ امراءالقیس کا نہیں ہو۔

(۳) '' عقد الثمین فی دواوین شعراء الستۃ الجاہلین '' —— نابغہ، عنترہ، طرفہ، زہیر، علقمہ اور امراءالقیس کے کلام اس کے اندر ہیں۔ اس کا مولف ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوا۔ موسیو ولیم ابن الورد بروسی نے اس کی تصحیح اور تزئین کے بعد شائع کیا ہو۔ ان قصائد میں ولیم نے کچھ بھی زیادتی نہیں کی ہو۔ صرف

ان قصائد کو حروفِ ابجد کے قاعدے پر ترتیب دے دیا ہے۔ نیز اس میں اصمعی، ابو عمرو بن علا، معضل اور ابوسعید السکری کی روایات جمع کردی ہیں اور تمام شعرا کے قصائد کی شانِ نزول کی ایک ایک فہرست بھی مرتب کردی ہے۔ البتہ روایات کے ضمن میں کچھ قصائد اور مقطعے ذکر کردیے ہیں اور ان اشعار کے متعلق حاشیہ چڑھادیا ہے جو ان شعرا کی طرف منسوب ہیں۔ منسوب شدہ قصائد کے مطلع حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) قالت الخنساء لما جئتها (۲) اجارتنا ان الخطوب تنوب (۳) أذکرت نفسك مالن یعودا

(۴) لمن طلل بین الجدایۃ والجبل (۵) طرقتك هند بعد طول تجنب (۶) الم یحزنك ان الدهر غول

(۷) الحرب اول ما تکون فتیۃ

(۴) ”شرح دیوان شعر الستۃ الجاہلیین“ —— اس کا ایک نسخہ مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے مگر اس میں مولف کا نام نہیں ہے صرف یہ لکھا ہے کہ تالیف کرکے سیف الدولہ ابوالولید اسماعیل بن معتضد باللہ کو ہدیتہً پیش کیا گیا۔ احمد بن عبد بن المختار کے خط میں مغربی مطبع میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے مولف نے اصمعی کی روایت پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ پھر منتخب قصائد کا ذکر کیا ہے جن کی روایت اصمعی کے علاوہ اوروں سے لی ہے لیکن اس نے اصمعی کے تمام قصائد کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کا مقصد چیدہ قصیدوں کا جمع کرنا تھا۔

(۵) ”نزهۃ ذوی الکیس وتحفۃ الادباء فی قصائد امرؤالقیس اشعر الشعرا“ —— اس کا ایک نسخہ مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے اور ۱۸۳۱ء میں دارالطبائع السلطانیہ میں چھپی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ اور قصیدوں کا ترجمہ بھی ہے۔ فرانسیسی زبان میں بعض ملاحظات بھی درج ہیں اس کا مولف زیادہ تر ابوالحجاج بن سلیمان سے روایت کرتا ہے اس نے ابو حاتم کی روایت سے معلقہ کو حذف کردیا ہے۔

(۶) ”دیوان امرؤالقیس“ —— اس کی روایتیں ابوسہل خربنداذ بن شیذ کی ہیں جو ابوالحسن علی بن عبداللہ بن سنان الطوسی اور ابونصر احمد بن حاتم کی جو اصمعی اور ابوعمرو الشیبانی سے روایت کرتے ہیں اور انھی لوگوں کی روایت کے مطابق اس کے قصیدے کی شرحیں بھی ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ عثمانی خط میں مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے۔

کتاب کی ابتدا ابوالحسن علی طوسی کی روایت سے شروع ہوتی ہے اور ابونصر کا ذکر صرف ایک یا دو شعر میں

آیا ہو۔ اس دیوان میں وہ تمام قصائد اور مقطعے بھی ہیں جن کو ابو حاتم نے اصمعی سے روایت کی ہو اور ان منسوب الیہ قصائد اور مقطعات کا بھی ذکر ہو۔

(۷) "دیوانِ امرؤالقیس" ـــــ اس کی روایتیں ابوسہل ماخرہنداد کی ہیں جو ابوجعفر کونی اور ابوعمر اصطخری سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہو کہ میں نے ان تمام روایات کو ابوجعفر احمد بن حسن کونی کو شیراز میں سُنایا پھر ابوعمر حفص بن عمر العبدی اصطخری کو سُنایا اور ابوجعفر کا بیان ہو کہ انھوں نے ابوعبشمی اور اصمعی کے بعض اصحاب کو بھی پڑھ کر سُنایا۔ ابوعمر کا بیان ہو کہ انھوں نے ابوعبیدہ حسن عبدی اور ابومسعود سلمہ بن عبد کو سنایا اس کتاب میں بہت سے منسوب الیہ قصائد بھی درج کیے گئے ہیں۔

(۸) "دیوانِ امرارالقیس" ـــــ اس میں شیخ محمد محمود کی شرح بھی شامل ہو اور اس میں وہ اشعار بھی جمع کیے گئے ہیں جو دیوانِ شعراستہ میں بالکل ہی نہیں ہیں۔ اس میں ایک قصیدہ ایسا بھی آیا ہو جس کو سہل نے حاتم کی روایت سے چھوڑ دیا تھا اس کا مطلع ہو ع (منعت اللیث من اکل بن حجنی) مگر اس کو منسوب الیہ شمار کیا ہو۔

اب اگر ہم ان تمام قصائد کا شمار کرنا چاہیں جو مختلف روایات سے امرارالقیس کے تسلیم کیے گئے ہیں تو ان کی تعداد سو سے زائد ہوتی ہو حالاں کہ محققین کا بیان ہو کہ امرارالقیس بہت کم گو شاعر تھا اور زیادہ سے زیادہ اس کے کل بیس قصائد اور قطعات ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ قصائد جن کو سہل بن ابوسہل خرہنداد نے بیان کیا ہو ان کا غیر مشہور اور مضطرب ہونا یقینی ہو۔

ابن ندیم اپنی کتاب میں علی بن عبداللہ طوسی اور احمد بن حاتم کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ لوگ ان کے نزدیک ان لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے کلامِ امرارالقیس کی تدوین میں کوئی حصّہ لیا ہو۔

اس سلسلے میں اگر ہم اس مجموعے کا کچھ ذکر کریں تو بے محل نہ ہوگا جس میں نام ور شعرائے جاہلیت کے سات قصائد ہیں۔ اور سب سے پہلا قصیدہ امرارالقیس کا ہو۔ ع

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل

مؤرخین کا خیال ہو کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے البتہ تدوین کے زمانے تک گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد صرف سات رہ گئی۔ یہ معلقات حماد راویہ نے ۱۵۶ھ (عہدِ عباسیہ) میں جمع کیے تھے اور چوں کہ یہ بہترین انتخاب تھا لہٰذا کل قصائد مقبول ہوے۔

عام طور سے مشہور ہو کہ یہ قصائد خانۂ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے اس وجہ سے معلقات کے نام سے مشہور ہوئے لیکن زمانۂ حال کے محققین کا خیال ہو کہ یہ وجہِ تسمیہ بالکل سطحی ہو ان کے نزدیک معلقہ کا مادہ اشتقاق علق ہو جس کے معنی شئ نفیس اور قیمتی کے ہیں اور چوں کہ ان قصائد کے اشعار جواہرات کے ہم پلّہ مانے جاتے تھے اس لیے معلقہ کہلائے۔ جس کی تائید دوسرے نام السموط (موتی کی لڑیاں) سے ہوتی ہو اور چوں کہ یہ قصائد بڑے ہیں اس لیے ان کو "سبع الطّوال" بھی کہتے ہیں۔ ابنِ رشیق کا خیال ہو کہ معلقات کو "مذہبات" بھی کہتے تھے کیوں کہ یہ قصائد قباطی (مصر کا ریشمی کپڑا) پر سونے کے پانی سے لکھ کر حرمِ کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ عرب اس کو الہامی کلام تصوّر کرتے تھے اور جس طرح سینکڑوں خداؤں کو سجدہ کرتے تھے اسی طرح یہ معلّقات بھی برسوں مسجودِ خلائق رہے۔ ان قصائد کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہوچکا ہو اور امراءالقیس کے عاشقانہ کلام خاص طور پر پسند کیے گئے ہیں۔

عہدِ اسلام میں بصرہ اور کوفہ کے علما نے عہدِ جاہلیت کے کلام کو مختلف حیثیتوں سے جمع کیا بعض نے صِرف ایک شاعر کا دیوان مرتب کیا تو بعض نے کلیات ترتیب دیے جن شعرا کے دیوان مرتب ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

امراءالقیس، نابغہ، زہیر، عنترہ، طرفہ، علقمہ، عروہ، لبید، حاتم، ردس بن حجر، حاورہ، خنسا۔

یہ دیوان مصر، بیروت اور یورپ میں چھپ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دیوانِ مختارات شعرائے عرب مرتبہ ابن الشجری اور ہزلئین کے مجموعے جداگانہ ہیں۔ مفضل جنبی نے شاہ زادوں کی تعلیم کے لیے خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۲۸ نظموں کا مجموعہ مرتب کیا تھا جو 'مفضلیات' کے نام سے یورپ نے شائع کیا ہو۔ اسی ذیل میں حماسہ ابوتمام اور حماسہ بحتری کے کلیات بھی ہیں۔ ایّام العرب میں حرب واحس اور حربِ مسوس، کی رزمیہ نظمیں الگ ہیں بعض ادیبوں نے "جمہرات" کے نام سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا ہو چناں چہ ان میں جمہرہ ابوزید انصاری بہت

مشہور ہیں۔ ان میں تقریباً پچاس شاعروں کے کلام سے ایک ایک قصیدہ لے کر ایک مجموعہ مرتب کیا ہی پھر خاص اوصاف کے لحاظ سے ہر حصّے کا جُداگانہ نام رکھّا ہی چناں چہ عہدِ جاہلیت کے وہ سات کلیات یہ ہیں :۔

(۱) معلقات، (۲) مجمہرات، (۳) منتقیات، (۴) مذہبات، (۵) مراثی، (۶) مشوبات، (۷) ملحمات۔

یہ مجموعہ تقریباً ۳۹۱ھ میں مرتب کیا گیا اور اس کا نام "جمہرہ اشعار العرب" رکھّا۔

محققینِ یورپ کی تحقیقات کے مطابق اس میں جس قدر کلام ہی وہ ۵۰۰ء سے ۶۲۲ء تک کا ہی۔ اور اسی زمانے کو وہ عہدِ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں کیوں کہ ۶۲۲ء سے اسلام کا آغاز ہوتا ہی اس کے بعد کا کلام زیادہ تر کتبِ ادب، تاریخوں اور تذکروں میں پھیلا ہوٗا ہی۔

کلامِ جاہلیت کی تدوین جس طریقے سے عمل میں آئی اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا حقیقت یہ ہی کہ عہدِ عباسیہ کے علماے ادَب کا اتنا بڑا کارنامہ ہی جس پر عرَبی ادَب جتنا بھی ناز کرے کم ہی۔ لیکن افسوس کہ بعض مستشرقین جیسے پروفیسر مارگیولیتھ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا خیال ہی کہ یہ تمام کے تمام مجموعے بالکل فرضی ہیں اور یہ کلام بعد والوں کی ایجاد ہیں۔ یہ خیال تاریخ اور اصولِ تنقید کے سراسر منافی ہی۔

اس میں شک نہیں کہ کسی قدر تغیّر اور تبدیلی ضرور ہوئی ہی اور کلامِ جاہلیت میں عہدِ اسلام کے قریب کا زمانہ بھی شامل ہوگیا ہی لیکن جملہ امثال اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں اور ان میں مطلق تغیّر نہیں ہوٗا ہی۔

"استفادات"

اس مقالے میں جن کتابوں سے مدد لی گئی وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ کتاب الآغانی مصنفہ ابوالفرج اصفہانی
۲۔ کتاب الشعر " محمد بن سلام
۳۔ مقدمۂ ابنِ خلدون
۴۔ تاریخِ یعقوبی
۵۔ تاریخ ادبِ عربی پروفیسر نکلسن
۶۔ الیاذہ سلیمان البستانی
۷۔ تاریخ الخضری
۸۔ کتاب الحیوان جاحظ
۹۔ کتاب العمدہ ابنِ رشیق
۱۰۔ کتاب الشعر والشعراء ابنِ قتیبہ
۱۱۔ جمہرہ انصاری
۱۲۔ تاریخ دول العرب محمد طلعت حرب
۱۳۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان
۱۴۔ تاریخ علم الادب عند الافرنج والعرب دکتر ہیوگو
(۱۵) شعر الجاہلی ڈاکٹر طٰہٰ حسین
(۱۶) مقدمہ دیوان امراء القیس استاد حسن السندوبی
(۱۷) مقالات مجلہ المقتطف وغیرہ۔

مومن کی شاعری پر ایک نظر

(جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے)

مومن کی شاعری کا پس منظر

سیاسی حالات مومن خاں مومن دہلوی ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا ماحول کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اِس وقت سلطنت دہلی کی شمع جھلملا رہی تھی، اور انگریزی تسلط کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو مرہٹوں کے زیرِ اثر تھا، اپنے قبضے میں کرلیا۔ سرجی ارجن گانو کے صلح نامے کی رو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ معہ آگرہ او دہلی کے انگریزوں کے سپرد کردیا۔ وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے ایک زمانے میں شانِ عجم اور شوکتِ روم حقیر معلوم ہوتی تھی، نیست و نابود ہوگیا۔ اور مغلوں کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چہار دیواری تک رہ گئی شاہ عالم کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہِ ثانی مسندِ حکومت پر متمکن ہوا۔ ۱۸۲۷ء میں اس کے مرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر جو دُودمانِ تیموریہ کا آخری چشم و چراغ تھا، تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت کی بساط ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں درہم و برہم ہوگئی۔

اِس وقت تاحدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمارا سیاسی، اخلاقی اور روحانی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ قوائے عمل شل ہو چکے تھے۔ اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ دست بردِ زمانہ سے اگر کوئی چیز رہ گئی تھی تو صرف اوہام کا تار و پود۔ لوگ مذہب کو دِل و جان سے مانتے تو تھے لیکن اس کی اصلی روح ختم ہو چکی تھی۔

Stoddard نے جو کچھ اٹھارویں صدی کی اسلامی دُنیا کے متعلق لکھا ہے، وہ انیسویں صدی کے ہندستان کے متعلق زیادہ صحیح ہے:-

مذہبی اور اخلاقی حالات "اٹھارویں صدی عیسویں میں اسلامی دنیا کے ضعف و انحطاط کی انتہا ہو چکی تھی۔ کسی

جگہ اور کسی گوشے میں بھی صحت اور حیات کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہر طرف جمود اور زوال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہی حال مسلمانوں کے عادات وخصائل اور آداب و اخلاق کا تھا۔ عربی کلچر کے نقوش مٹتے جاتے تھے۔ امرا "مے و رامش و رنگ و بو" کی دنیا میں مست وخراب تھے۔ عوام وحشیانہ پستی اور گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ تعلیم مُردہ ہو چکی تھی۔ چند درس گاہیں جو اس ہول ناک زوال میں باقی تھیں، وہ بے توجہی و بے مائگی کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں۔ امراء رؤسا آزاد اور بے عناں تھے۔ اس نظامِ مراتب کے نیچے جمہور دبے جا رہے تھے۔ دیہاتی اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود تھے۔ تجارت اور زراعت دونوں سدرمق کے لیے کی جاتی تھیں —— مذہب بھی دوسری چیزوں کی طرح زوال پذیر تھا۔ محمدؐ عربی (ص) کی پاک بازانہ توحید پر سفیہانہ توہم پرستی اور پُراسرار تصوف کی تہیں جم گئی تھیں۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں ..... عوام تعویذ اور گنڈے پر پورا اعتقاد رکھتے تھے۔ فقیر اور درویش ہر طرف اپنا اثر جمائے ہوئے تھے۔ لوگ بزرگوں کی زیارتوں پر جاتے تھے، اور ان کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ اس کی طاعات بلاواسطہ اور وسیلہ ہو ہی نہیں سکتیں۔ احکاماتِ قرآنی کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور اکثر ان کے خلاف بھی قدم اُٹھایا جاتا تھا۔ شراب اور افیون کا استعمال عام تھا۔ زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمالِ قبیحہ کُھلّم کھلّا بے حیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے ...... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی اصلی روح ختم ہو گئی ہے اور صرف بے معنی رسمیات اور مبتذل توہمات باقی ہیں۔ لوگ توہم پرستی اور رسم پرستی کو اصلِ مذہب سمجھ کر اسی کے گرویدہ تھے۔"[۱]

Dr. Herklot نے "اسلام اِن انڈیا" (۱۸۳۲ء) میں ان رسموں اور تہواروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جو پیر بندہ نواز گیسو دراز زندہ شاہ مدار اور پیر دست گیر کے سلسلے میں منعقد ہوتے تھے۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے :-

"مسلمانوں میں مُلکی اور غیر مُلکی عناصر کے ملنے سے بہت سی ایسی رسمیں پیدا ہو گئی ہیں جو اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ سحر اور جادو سے متعلق بہت سی باتیں جو ان کی معاشرت کا جزو بن گئی ہیں، اسی قبیل کی ہیں۔ مسلمان جاٹ اور راج پوتوں میں شادی ولادت و وفات کی اکثر رسمیں ہندوانہ ہیں۔ وہ بعض اوقات وراثت میں ہندوؤں کے اصول کی پابندی کرتے ہیں اور مصیبت میں مقامی ہندو دیوتاؤں سے مدد مانگتے ہیں۔ شمالی

[۱] World of Islam pp 20-21

مغربی صوبے اور بلوچستان میں بھی جہاں ہندی اثرات بہت کم ہیں ، مظاہر پرستی نظر آتی ہے ....
پیر کو اختیاراتِ کلی حاصل ہیں ، وہ مصیبت کو دور کرسکتا ہے ، بیمار کو اچھا کرسکتا ہے، اولاد بہم پہنچا سکتا ہے اور مُردے کی عاقبت سنوار سکتا ہے" ۱؎

مذہبی اور اخلاقی حالت کا اس سے زیادہ دردناک منظر" سیرتِ سید احمد شہید" کے مولف نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۲ تا ۳۰۔ یہاں صرف ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

"سنت و شریعت بے معنی الفاظ تھے ، جو صرف کتابوں میں رہ گئے تھے .... ہر بدعت ، بدعتِ حسنہ تھی۔ بہت سے حرام، حلال ہوگئے تھے ، اور بہت سے حلال، حرام۔ شعائر اُٹھ رہے تھے ..... قران و حدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہوگئے تھے مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیم میراث شرفائے اسلام کی نئی شریعت میں مستحب و فرض سے حرام و متروک ہوگئے تھے ..... قران ایک چیستاں تھی جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا نہ اس میں غور کرنے کی ضرورت تھی۔ نہ اس پر عمل کرنے کا سوال تھا .... مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہورہے تھے۔ اس درخت کو گھن لگ گیا تھا۔ امرا و متوسطین سے لے کر غربا تک عیاشی عام تھی اور ہر ایک نشے میں سرشار تھا" ۲؎

پنجاب میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ سکھ انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ اذان بند کردی گئی تھی اور بہت سی مسجدیں ویران پڑی تھیں۔ بادشاہی مسجد، فوجی گودام میں تبدیل ہوگئی تھی ۳؎ موتی مسجد کا نام موتی مندر رکھ دیا گیا تھا۔ سنہری مسجد پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا۔ اس کا تمام فرش گوبر سے لپا ہوا تھا۔ امرت سر میں ایک مسجد بھی مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ کوئی شخص آزادی سے نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ۴؎

اصلاحی تحریک

ٹھیک اسی زمانے میں مولوی سید احمد بریلویؒ نے اپنی مذہبی اور اصلاحی تحریک شروع کی۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ سے تعلیم پائی تھی اور کثرت سے لوگ اُن کے مرید و معتقد تھے۔ انھوں نے بلادِ اسلامی میں اپنے خیالات کی اشاعت کی اور ہندستان میں بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریک کو پھیلایا۔ ۱۸۲۶ء میں انھوں نے مولوی اسماعیل دہلویؒ (صاحبِ تقویت الایمان)

۱؎ Islam in India - P. 8 ۲؎ سیرتِ سید احمد شہید ص ۲۸ ، ۳۰ -

۳؎ تاریخ لاہور (لطیف) ص ۱۱۵ - ۴؎ The Punjab a Hundred Years ago (Garret) p. 27.

کے ہم راہ سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ۱۸۳۱ء میں دونوں جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

مولوی سید احمد بریلوی رح کی مذہبی تحریک جس کو سرسید نے لوتھر کی تحریک سے مشابہ قرار دیا ہے، رفتہ رفتہ انگریزوں کے لیے بھی خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر (W.W. HUNTER) نے اپنی کتاب (ODR INDIAN' 'MUSALMANS) میں اس کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ وہابی مبلّغین اُس آبادی کو جو اپنے آئینۂ ماضی میں مسلسل غلامی کو نہیں دیکھ سکتی، برابر حکومت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔

مومن پر ماحول کا اثر مومن نوجوانی ہی میں مولوی سید احمد بریلوی رح کے مرید ہوگئے تھے اس لیے تقلید و بدعت سے سخت نفرت کرتے تھے، ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

یہ کچھ رہِ سنّت نہ طریقِ توحید پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں توحید
ہم سمجھے ہیں معنائے حقیقی یعنی حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

مذہبیت ان کی غزلوں میں بھی یہ صلابتِ دین اور عصبیّت موجود ہے ؎

لے نام آرزو کا تو دِل کو نکال لیں مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ایک اور جگہ اپنے مذہبی خیالات بڑے جوش سے بیان کیے ہیں ؎

اربابِ حدیث کا ہیں فرماں بر ہوں تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روایتِ ائمّہ نہ قیاس یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

مومن کو مولوی سید احمد بریلوی رح سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔ ایک مثنوی میں لکھتے ہیں :-

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا
وہ نورِ مجسّم وہ ظلِّ الٰہ کہ سائے سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سیّد احمدؒ قبولِ خدا سرِ امتحانِ رسولِ خدا

مومن مولوی سیّد احمد بریلویؒ کو «مہدیٔ دوراں» سمجھتے تھے ؎

گلابِ ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمدؒ کہ محض مقتدیٔ سنّتِ پیمبر ہے

وہ شاہِ مملکت ایماں کہ جس کا سالِ خروج
"امامِ برحق مہدئ نشاں علی فر" ہو

۱۲۴۲ ہجری

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

شوقِ بزمِ احد و ذوقِ شہادت ہو مجھے
جلد مومن لے پہنچ اس "مہدئ دوراں" تلک

غیر ملکی حکومت سے نفرت

مومن کی یہ مذہبیت جب بلند سطح پر پہنچ جاتی ہو تو وہ غیر ملکی حکومت سے نفرت اور بیزاری کا سبب بن جاتی ہو۔ ان کی وارستگیٔ مزاج اور مولوی سید احمد بریلویؒ اور مولوی اسماعیل دہلویؒ کی صحبت کا مقتضا بھی یہی تھا۔ انھوں نے ایک قصیدہ عرفیؔ کے طرز میں لکھا ہو۔ اس میں فرماتے ہیں ؎

ایں عیسویاں برلب رسانند
جانِ من و جانِ آفرینش

تا چند بہ خوابِ ناز باشی
فارغ زفغانِ آفرینش

مومن شدہ ہم زبانِ عرفیؔ
از بہرِ امانِ آفرینش

برخیز کہ شورِ کفر برخاست
ای فتنہ نشانِ آفرینش

مومن کی آسودہ حالی اور مذہبیت نے اُن کے اندر خودداری اور استغنا کی شان پیدا کردی تھی اُن کے یہاں نہ ذوقؔ کی سی لابہ گری ہو اور نہ غالبؔ کا سا "تاخدا باشد بہادر شاہ باد" والا اندازِ بیان، نہ انگریز حکام کی ثناگستری اور چاپلوسی۔ اس کے برخلاف وہ مثنوی جہادیہ میں لکھتے ہیں ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فداجی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہو
خداوند اس سے رضامند ہو

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لیے جاں نثاری کرو

آخر میں دعا کرتے ہیں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ میں ہوں تیرہ کار
پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار

تو اپنی عنایت سے توفیق دے عروج شہید اور صدیق دے

اسی مضمون کو ایک رباعی میں بیان کیا ہے ؎

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں

انصاف کرو، خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

ان مضامین کو دیکھ کر اگر مومن کو مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

مومن کی سیرت مومن عربی میں شاہ عبدالقادرؒ کے شاگرد تھے اور شاہ عبدالعزیزؒ کی مجالسِ وعظ کے حاشیہ نشین۔ وہ مولوی سید احمدؒ کے مرید تھے اور مولوی اسماعیلؒ کے ہم سبق۔ ان کی شادی دہلی کے نام ور خاندانِ ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ دردؒ کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد و تملّق ان میں نام کو بھی نہیں تھا۔ خودداری اور استغنا کی شان نمایاں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حمد و نعت و منقبت کے سوا کسی امیر یا رئیس کی تعریف نہیں کی۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ امرا و رؤسا تو درکنار وہ اساتذۂ سلف کی تعریف کرنا اور سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کو انھوں نے ہمیشہ "کارِ ہوس پیشگاں" سمجھا۔ فارسی دیوان میں لکھتے ہیں ؎

بادشاہا بہ ایں متاعِ قلیل مدح چوں از منے چرا خواہی

دیگراں دیگرند و من دیگر ہرچہ از بوم از ہما خواہی

مومن نے شاعری اور طبابت کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ٹامسن صاحب نے اسیؔ رپے کی پروفیسری دینا چاہی تھی انھوں نے انکار کردیا۔ ریاست کپورتھلہ نے ۳۵۰ رُپے پر بُلانا چاہا، نہ گئے۔

اُنیسویں صدی کی معاشرت بھی عجیب تھی۔ وہ مومن جو "ہجرِ پردہ نشیں" میں مرتا ہے، جو "شبِ وصلِ غیر" کاٹنے پر آمادہ ہے اور جو "کوچۂ رقیب" میں بھی سر کے بل جانے کے لیے تیار ہے، وہی مومن یہ دُعا کرتا ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اس زمانے میں ہماری زندگی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ رندی و مذہبیت ایک ساتھ چلتی تھیں۔ ان میں اتنا تضاد نہیں تھا جتنا آج نظر آتا ہے۔ زندگی عشقِ مجازی سے شروع ہوتی تھی اور بعض صورتوں میں وہ عشقِ حقیقی کا زینہ بن جاتی تھی۔ مومن حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے، نجبائے کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا گھرانا بادشاہی طبیبوں اور شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ مومن نے اس زمانے کے طریق کے مطابق عربی و فارسی میں مہارتِ تامّہ پیدا کی۔ جوانی ہی میں مرید ہوگئے۔ فنِ طب اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری، علم نجوم، شطرنج، تاریخ گوئی میں کمال پیدا کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ دادِ عیش بھی خوب دی اور جوانی کا زمانہ ہوس ناکی میں گزارا۔ وہ نہایت خوب صورت، جامہ زیب، خوش گلو، خوش وضع اور عاشق مزاج آدمی تھے۔ دلّی ان کی جولان گاہ تھی۔ جب جوانی کی ہوس ناکی ختم ہوگئی تو انھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی اور نماز روزے کے پابند ہوگئے۔

اسلوب ان سب باتوں نے مومن کے اسلوب کی تعمیر میں مدد دی ہے۔ ان کے یہاں دو طرز بہت نمایاں ہیں: ایک پیچیدہ ہے، دوسرا سادہ اور دونوں اُن کے اصلی اور حقیقی رنگ ہیں۔ پیچیدگیٔ کلام کا سبب مومن کی بڑھی ہوئی علمیت ہے۔ لیکن غالباً اصلی وجہ جدّت طرازی اور انفرادیت ہے۔ وہ روشِ عام سے الگ رہنا چاہتے تھے ممکن ہے اس کا نفسیاتی سبب عشق کی پردہ داری بھی ہو۔ اس کے علاوہ مومن کی شاعری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں بھی دو ذہنیتیں ملتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک طرف خیالات و واردات اور معنویت پر زور دیا جارہا تھا۔ دوسری طرف زبان، رعایتِ لفظی اور خارجی پہلو پر۔ غالب اور آتش کے یہاں پہلا طرز نمایاں ہے اور ذوق، نصیر اور ناسخ کے یہاں دوسرا۔ مومن کے یہاں یہ دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ کہیں آکر مل گئے ہیں اور کہیں الگ الگ ہیں۔ لیکن ان کی اُستادی اور انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔

مومن نے چند روز شاہ نصیر (ناسخ دہلی) کو اپنا کلام دکھلایا تھا اور جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا تو اس کا تتبع بھی کرنے کی کوشش کی اور اس قسم کے اشعار کہے ؎

لے اُڑی لاشہ ہوا لاغر زبس تن ہوگیا ذرّۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا

لیکن بعد میں ان کی جدّت پسند طبیعت نے ایک علاحدہ رنگ اختیار کرلیا جس میں رشک آمیز سوز، داخلیت اور خارجیت کا لطیف امتزاج، تخیّل کی وسعت اور بیان کی لطافت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

مومن کی خصوصیات

(۱) مومن کے یہاں نکتہ یابی اور نازک خیالی کا کمال نظر آتا ہو۔ بات میں بات پیدا کرنا اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہو مثلاً ؎

دیکھ اپنا حالِ زار منجّم ہوا رقیب　　　تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

(یعنی منجّم نے نجوم کے ذریعے عاشق کی محرومی اور بدبختی کا پتا لگا لیا۔ اور اس کی ناکام یابی سے اپنی کام یابی کی توقعات پیدا کرلیں۔ اس طرح منجّم عاشق کا رقیب بن گیا اور عاشق کا بختِ ناساز، منجّم کے حق میں سازگار ثابت ہوا۔)

یا ؎　پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہو　　　اس کا نہ دیکھنا نگۂ التفات ہو

یا ؎　تھا مقدر میں اس سے کم ملنا　　　کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

یہ اصل میں فغانی و شفائی کا طرز ہو، جسے عرفی و نظیری نے ترقی دی اور کلیم و بے دل نے انتہا کو پہنچا دیا۔ مومن کو فارسی سے طبیعی مناسبت تھی۔ ان کی اُستادی کی بنیاد بھی ایک حد تک اسی دست گاہِ فارسی پر قائم ہو اس لیے کہا جاسکتا ہو کہ ان کا یہ طرز فارسی پسندی کا لازمی نتیجہ ہو۔

(۲) فارسی ہی کے اثر سے مومن کے یہاں ایسی لطیف ترکیبیں پائی جاتی ہیں، جو شعر کی جان ہیں مثلاً ؎

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہوچکے　　　اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کردیا　　　حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکام یاب میں

گریۂ رُسوا اور دلِ ناکام یاب کی ترکیبوں نے ان اشعار کی معنویت اور تاثیر کو دوبالا کردیا ہو۔ ایسے ہی ؎

غیر سے سرگوشیاں کرلیجیے پھر ہم بھی کچھ　　　آرزو ہاے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

یا ؎　امتحاں کے لیے جفا کب تک　　　التفاتِ ستم نما کب تک

یا ؎　کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　　　کہیں پامال سر نہ ہوجائے

التفاتِ ستم نما، اور پامال سر کی تراکیب نے بہت وسیع مفہوم کی گنجایش پیدا کردی ہو۔

غرض، آرزوہاے دلِ رشک آشنا، چشمِ ستارہ بار، آہوے نیم خواب، شکوۂ زخم ریز اور اسی قسم کی بیسیوں استوار اور خوش نما ترکیبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ مومن کی طبیعت فارسی مذاق سے بہ خوبی آشنا تھی اور یہ مرصّع کاری اسی کا فیضان ہو۔

(۳) مومن نفسیاتی امور کو سامنے رکھ کر شاعری کرتا ہے۔ بعض جگہ اسی وجہ سے فطریت اور درد و اثر کی فراوانی نظر آتی ہے۔ محبوب کو فکرِ جور سے باز رکھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ؎

دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک میں بھی زرا آرام لوں، تم بھی زرا آرام لو

میں بھی "زرا آرام لوں" کا ٹکڑا محض گمانِ بد رفع کرنے کے لیے ہے یہی وجہ ہے کہ اس جزو نے استدعائے عاشق کا نفسیاتی اثر بڑھا دیا ہے۔

بعض اوقات مومن اپنا مطلب اس نفسیاتی طریقے سے ادا کرتا ہے کہ بہ ظاہر اپنا فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ مخاطب خود اپنا فائدہ تصور کرتا ہے مثلاً ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے اس طرز کا نام مکرِ شاعرانہ رکھا ہے لیکن یہ حقیقتاً نفسیاتی اسلوب ہے جو معشوقِ عاشق پیشہ کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس میں عاشقانہ عجز اور بلند فتادگی کچھ اس طرح شامل ہے کہ بتِ سنگ دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مومن نے شعور و وجدان سے بھی کام لیا ہے اور دنیائے شعر و نفسیات میں ان دونوں چیزوں کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ ظاہر ہے مثلاً ؎

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

کیا دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

ہو نہ بے تاب ادا تمھاری آج　　　کچھ تو کہتی ہی بے قراری آج

(۴) مومن کی شاعری میں "کوچہ گردی کی بو" آتی ہی۔ اس کا معشوق "جنسِ کم ارز" سے تعلق رکھتا ہی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی وقوعہ گوئی اور معاملہ بندی جرأت و انشا سے بلند ہی۔ اس نے اسلوب کی ندرت اور پاکیزگی سے اپنے کلام پر ابتذال اور عریانی کا دھبّا نہیں آنے دیا۔ ؎

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　　سارے گلے تمام ہوے اِک جواب میں

چینِ جبیں کو دیکھ کے دِل بستہ تر ہُوا　　　کیسی کشودِ کار، کشادِ نقاب میں

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی　　　نکلی ہی جان جاتی ہی ہر ہر ادا کے ساتھ

(۵) اسی سلسلے میں ایک بات اور قابلِ لحاظ ہی۔ مومن کا معشوق ضرور بازاری ہی لیکن اس کا عشق بازاری نہیں ہی۔ اُس کے عشق میں خودداری ہی اور فتادگی میں بلندی۔ وہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو یا حُسن وعشق کے مرتبے سے گِرا ہوا ہو۔ مثلاً ؎

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں　　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بُلا　　　وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

مرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ　　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومن اپنے محبوب کو ملزم نہیں ٹھیراتا ؎

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہی　　　اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہی

اگر وہ اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کا ذِکر کرتا ہی تو عشق کی پوری نیاز آگینی کے ساتھ ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مر چک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بُری طرح

(۶) مومن کا معشوق جنسِ لطیف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قسم کے اشارے جا بہ جا اُن کے کلام میں ملتے ہیں ؎

ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

لیکن تمام کلام "عشقِ حلال کا مرقع" نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں ؎

دلِ مومن آتش کدہ کیوں بنے
لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

لیکن یہ ان کا عام رنگ نہیں ہے۔

(۷) مومن کی شاعری کا محور جذبۂ رشک اور ذکرِ غیر ہے لیکن اس نے جرأت اور انشا کی طرح کوئی بات خلافِ تہذیب نہیں لکھی اور کسی جگہ بھی فتادگیٔ عشق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

مومن کی شاعری میں جذبۂ رشک کی فراوانی کی نفسیاتی وجہ اس کی غیرت وحمیّت ہے۔ مثلاً

غیر کے ہم راہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

یہ جذبۂ رقابت، بے حمیتی نہیں بلکہ عینِ غیرت وحمیّت ہے ؎

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروّت کس سے دیکھا جائے ہے

یہ رشک بھی ملاحظہ ہو جس نے نامہ بر کو راہ بر بنا دیا ہے۔ ؎

رشکِ پیغام عناں کشِ دل ہے
نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

مومن کے اس بدنام شعر میں ؎

لے شبِ وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اظہارِ کرب کے ساتھ، الفاظ میں جو روک تھام ہے، وہ تعریف سے مستغنی ہے۔

(۸) مومن توجیہہ خوب کرتا ہے۔ شبِ فراق میں مرنے کی خواہش بالکل فطری بات ہے لیکن وہ کہتا ہے ؎

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

ایسے ہی تجاہلِ عارفانہ کی مثالیں اس کے یہاں کثرت سے ملیں گی ؎

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے   تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

اِس تجاہل سے محبوب کے رُخِ روشن میں مبالغہ منظور ہے۔

(۹) مومن کو جمعِ تضاد میں کمال حاصل ہے ؎

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا   مرنا ہی مقدّر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

آخر امّید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا   مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

مومن لفظی ہیر پھیر سے تخئیل کے لیے نئی راہیں کھول دیتا ہے ؎

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینے کو   کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینہ زنگِ غم نے توڑا   کیوں کر اسے منھ دکھائیں گے ہم

(۱۱) مومن کے یہاں محذوفات غالب سے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات وہ بات کو پیچ سے بیان کرتے ہیں؛ لیکن اس میں بڑی لطافت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چند الفاظ میں ایک وسیع مضمون کو حُسن و خوبی کے ساتھ بیان کردینا مومن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے مثلاً ؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دِل کیسا نکل آیا   مَیں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے   مَیں نے ہی تم سے بے وفائی کی

وہ مسلّمات کو سمجھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ضروری ٹکڑوں کا اظہار کردیتے ہیں مثلاً ؎

تھی نوحہ زنی دِل کے جنازے پہ ضروری   شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

ذِکرِ اغیار سے ہوا معلوم   حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے   صیّاد کی نگاہ سوے آشیاں نہیں

(۱۲) مومن کے کلام میں صحتِ بیانی بہ درجۂ اتم موجود ہے ؎

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گُل تو دُور   اور سوے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

کچھ کچھ درست ضد سے تری ہو چلے ہیں وہ یک چند اور کج روی ای آسمان نہ چھوڑ

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(۱۳) مومن کو جذبات اور واردات بیان کرنے میں امتیاز حاصل ہے

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب تجھے ای زندگی لاؤں کہاں سے

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی نکلی ہی جان جاتی ہو ہر ہر ادا کے ساتھ

اُلٹے وہ شکوے کہتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوے ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

(۱۴) مومن کے کلام میں شوخیٔ ادا کی بھی مثالیں ملتی ہیں ۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے
بات ناصح سے کہتے ڈرتا ہوں کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
ہم حال کہے جائیں گے سُنیے کہ نہ سُنیے اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

(۱۵) مومنؔ کے آرٹ کا کمال طنز نگاری میں نظر آتا ہے۔ اس کے طنز کا نشتر براہِ راست رگِ جان پر اثر کرتا ہے ؎

رحم فلک اور مرے حال پر | تو نے کرم اے ستم آرا کیا

کیا پسند آئی اپنی جور کشی | چرخ کے انتخاب نے مارا

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی | پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

(۱۶) مومنؔ جب دِقت اور پیچیدگی کو چھوڑ کر سہلِ ممتنع پر آجاتا ہے تو سادگی، روانی اور سوز و اثر کا دریا بہا دیتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو | عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال | ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ | پھونک کر میرے آشیانے کو

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا | رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے | ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
چارۂ دِل سوائے صبر نہیں | سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر | ہاتھ دِل سے جُدا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا | دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
رحم فلک اور مرے حال پر | تو نے کرم اے ستم آرا کیا

(۱۷) نیاز فتح پوری نے لکھا ہو کہ "رنگِ تغزل میں مومن کا کلام اس غیر تغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہو جس کو تصوف یا عشقِ حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہو۔" پروفیسر ضیا احمد کا بھی تقریباً یہی خیال ہو۔ انھوں نے لکھا ہو کہ "مومن نے فلسفے یا مابعد الطبیعیات کی وادیوں میں قدم نہیں رکھا۔" ہمارا خیال ہو کہ مومن کے یہاں تصوف' فلسفے اور اخلاق کے مضامین ہیں لیکن کم۔ زیادہ تر اسی مادّی عشق کے تجربات اور واردات بیان کیے ہیں۔ اِس اعتبار سے کہا جاسکتا ہو کہ مومن کا کلام صحیح رنگِ تغزل کا حامل ہو اور اس نے غزل کے "ابتدائی" مفہوم کو سامنے رکھا ہو اور رازگفتن بہ معشوق کا حق ادا کردیا ہو۔ وہ خود کہتا ہو ؎

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

(۱۸) مومن کی بعض غزلوں میں واسوخت کا رنگ غالب ہو ؎

اب اور سے لَو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بُت خانۂ چین ہو گو ترا گھر مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

(۱۹) مومن نے اپنے تخلص سے ہر جگہ فائدہ اُٹھایا ہو ؎

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو
نام عشقِ بتاں نہ لو مومن کیجیے بس خدا خدا صاحب
مومن تم اور عشقِ بُتاں اے پیر و مرشد خیر ہو یہ ذِکر اور منھ آپ کا، صاحب خدا کا نام لو

معائبِ مومن

(۱) مومن نے بعض جگہ صحتِ زبان کا خیال نہیں رکھا ہو۔ اس کا اصلی سبب ان کی بے پروائی ہو' ناواقفیت نہیں۔

(۲) بعض اشعار میں تعقیدِ لفظی و معنوی ہو مثلاً ؎

جوں نکہتِ گل جنبش ہو جی کا نکل جانا اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

پہلے مصرع کے دو ٹکڑے ہوسکتے ہیں۔ شانِ اُستادی یہ ہو کہ دونوں ٹکڑوں کے الفاظ الگ الگ رہیں۔ لیکن اس

شعر میں "جنبش" پہلے ٹکڑے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس کا تعلق دوسرے ٹکڑے یعنی "ہو جی کا نکل جانا" سے ہے۔ کبھی جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے مصرع میں لاتے ہیں۔ مثلاً ؎

بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے — پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

(۳) تلمیحاتِ بعیدہ کی کثرت ہے مثلاً اس شعر میں ؎

جلتا ہوں اہلِ نار کی تبدیلِ جلد سے — مومن غضب ہے آتشِ لذت فزائے داغ

بدلنٰھم جلوداً غیرھا کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) غزل ان کی بڑھی ہوئی علمیت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے — رجعتِ قہقہریٔ شمس و قمر آخر شب

قرانِ انجم سیارہ برجِ آبی میں — ڈبوئے گی مری چشمِ ستارہ بار مجھے

(۵) بعض جگہ محذوفات کی زیادتی اور مسلمات سے انحراف کی وجہ سے پیچیدگی اور مُعمائیت پیدا ہوگئی ہے۔

(۶) مومن کی دنیا تنگ ہے اور اس کا میدان محدود۔ جو کمال دکھلایا ہے وہ "تنگ نائے غزل" میں اور اس کے بھی چند مضامین خاص طور پر لیے ہیں۔

مومن کا اثر شعرائے مابعد پر

مومن نے شعرائے مابعد پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود جو کچھ نظر آتی ہے، وہ ایک معنی کر مومن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُن کے مقلدین میں شیفتہ، حالی، نسیم، تسلیم، تسکین اور حسرت موہانی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

شیفتہ کے اکثر اشعار طرزِ مومن میں ہیں ؎

یاں سبک حرفِ ملامت، واں گراں عرضِ نیاز — سخت جاں میں کب نہ تھا اور نازنیں تو کب نہ تھا

کب ہمیں حاجتِ پرہیز پڑی — غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا

اس سے ہیں شکوے کی جا شکرِ ستم کر آیا کیا کروں تھا مرے دل میں سو زباں پر آیا
میرے آنے سے تم اُٹھ جاتے ہو بزمِ دشمن میں نہ آؤں کیوں کر

شیفتہ کے کلام میں بھی مومن کی سی ہموار اور خوش گوار ترکیبیں پائی جاتی ہیں مثلاً: اشکِ گل ریز، خراشِ ناخنِ غم، مطرب جادو ترانہ، ظنِ نیم ستم، دلِ شورش ادا، مستیٔ نیم خام، شوقِ غلط کار، توبۂ ژولیدہ۔

حالی نے بالواسطہ مومن سے استفادہ کیا ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی نے جابجا پیرویٔ مومن کا ذکر کیا ہے ؎

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں مومن سے اپنے رنگ کو تونے ملا دیا

طرزِ مومن پہ مرحبا حسرت تری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

حسرت کی شاعری میں نفسیاتی واقفیت اور حسن و عشق کے گوناگوں پہلو ملتے ہیں۔ ان کا سرچشمہ بھی ایک معنی میں مومن ہی کا کلام ہے۔ پچھلے بیس سال کے اندر ہزاروں نئی ترکیبیں وضع کی گئیں جو شاعرانِ نو کی جدتِ پنہاں کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کی مثالیں بھی مومن اسکول میں زیادہ ملیں گی۔ حسرت کا کلام اس کا شاہد عادل ہے ؎

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا
اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بےقرار کچھ پوچھیے نہ وہ نگۂ فتنہ زا ہے کیا

مومن کے فکر و تخئیل نے اردو غزل کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اس کی شاعری اور زندگی میں ایک لطیف ہم آہنگی ہے اسی لیے اس کی مہذب غزلیت آج بھی لطف دیتی ہے اور شاعرانِ عصرِ حاضر کے لیے شمعِ راہ بنی ہوتی ہے۔ مومن کی غزل بے جان نہیں ہے، اس میں زندگی تازگی اور ندرت ہے۔

تبصرے

ادبیات

نادراتِ شاہی (مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی صاحب ناظم کتاب خانہ ریاست رام پور)

یہ شاہ عالم بادشاہ کے اُردو، فارسی، ہندی اور پنجابی اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کتاب خانۂ ریاست رام پور میں ہے جو نواب خلد آشیاں کے عہد میں نواب مرزا خاں داغ مرحوم کی معرفت خریدا گیا تھا۔ مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانے نے بڑے سلیقے سے اسے مرتب کیا ہے اور شروع میں ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے جس میں شاہ عالم بادشاہ کے حالات اور اُن کے کلام پر تبصرہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نام "نادراتِ شاہی" خود بادشاہ نے تجویز کیا تھا۔

اس مجموعے میں اُردو کی کل ۷۴ غزلیں ہیں اور ہر غزل میں پانچ شعر ہیں۔ شاہ عالم بہت پُرگو تھے۔ یہ ان کے کلام کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ عرشی صاحب نے اُس اُردو دیوان کا بھی ذکر کیا ہے جو ڈاکٹر اشپرنگر کی فہرست میں درج ہے۔ جس میں ۲۴۴ صفحے تھے اور ہر صفحے میں آٹھ سطریں تھیں اور اب نایاب ہے۔ نیز بہار ریسرچ سوسائٹی، برٹش میوزیم لندن اور میونخ لائبریری کے نسخوں کا ذکر ہے یہ سب بہت مختصر نسخے ہیں۔ تعجب ہے کہ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے نسخے کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا حالاں کہ بادشاہ کے کلام کا بہت ضخیم کلیات ہے اور خوش خط لکھا ہوا ہے۔

ان ۷۴ غزلوں کے بعد متفرق ہندی کلام ہے۔ ہر صفحے میں دو دو تین تین شعر ہیں۔ سارا کلام اُردو ہندی دونوں رسم خط میں ہے۔ فارسی کی صرف دو غزلیں پانچ پانچ شعر کی اور چھ مختلف شعر ہیں۔

کلام معمولی ہے۔ کتاب بہت اچھے نسخ ٹائپ میں چھپی ہے۔ آخر میں اختلافِ الفاظ اور اشاریہ کے دو ضمیمے بھی ہیں۔

اَدَبی مقالات | بہ قلم جناب بشّر علی صاحب صدّیقی، ایم اے، معلّم گورنمنٹ ہائی اسکول، ہاتھرس۔ شائع کردہ: شاہ اینڈ کمپنی، وصی روڈ، آگرہ۔ درسی کتب کی تقطیع، ۱۶۴ صفحات پر مجلّد، منقّش گرد پوش کے ساتھ شائع کی گئی ہو۔ کاغذ، لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت عہ

اصل میں یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہو جو صدّیقی صاحب نے مختلف ادبی عنوانات پر تحریر کیے اور وقتاً فوقتاً اُردو رسائل میں چھپے تھے۔ شروع میں آلِ احمد صاحب سرور اُستاد مسلم یونی ورسٹی کا تعارف شامل ہو جس میں ہمارے تنقیدی ادب پر ایک متین و مختصر تبصرہ کیا گیا ہو۔

اقبال، حالی، سودا، نذیر احمد اور مولانا احسن مارہروی پر صدّیقی صاحب کے مضامین کافی دل چسپ اور طلبہ کے لیے ضرور مفید ہوں گے۔ تذکرۂ آبِ حیات، اُردو کی ابتدا اور ہندی اُردو کے تضیے پر بھی الگ الگ مقالات ہیں مگر مضمون کی وسعت کے اعتبار سے یہ کسی قدر تشنہ رہ گئے ہیں۔ حال آں کہ فاضل موئلف نے اقبال کے تصورِ شیطان پر خاصی موشگافی اور جزئیات نگاری کی ہو جس سے گمان ہوتا ہو کہ شاید وہ اسے رند مزاج شاعروں کے تفنّن اور آزاد مشرب صوفیوں کی خیال آرائی کی بجائے واقعی کوئی سنجیدہ موضوع سمجھتے ہیں۔

'اُردو مزاح نگاری' کے مقالے میں لائق موئلف نے رشید احمد صاحب صدّیقی کو (جو غالباً موئلف کے اُستاد ہیں) خراجِ تحسین کے ساتھ یہ سرٹی فکیٹ بھی دے دیا ہو کہ وہ ایک ناکام یاب پروفسر ہوں تو ہوں ایک کام یاب مزاح نگار ضرور ہیں! (ص ۶۵)

فاضل مقالہ نگار حالی کے معتقدین یا متّبعین میں شامل ہیں جس کی سرور صاحب نے بھی اپنے تعارف میں تصدیق کی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ ایک مضمون میں جہاں حالی کی "برکھا رُت" کو انھوں نے اُردو کی ایک یادگار نظم قرار دیا ہو وہاں اس کے مقابلے میں نظیر اکبر آبادی اور ایک زمانۂ حال کے شاعر کے بعض چو بولے نقل کرکے 'برکھا رُت' کے برابر بلکہ بہتر ہونے کا اشارہ کرتے ہیں! 'برکھا رُت' حالی کی نہایت سلیس و شیریں بیانیہ نظم ہو۔ پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعرے میں پڑھی گئی تو کہا جاتا ہو کہ اُن کے بعض نامی حریف بھی خود اپنی نئی شاعری سے بیزار نظر آنے لگے تھے۔ اُسے نظیر کی

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہی اودس

یا حال کی کسی ایسی نظم سے ٹکرانا کہ جس کے ہر بند سے آورد اور فکر کی بے ربطی اور افلاس ٹپکتا ہو[1] کمال بے دردی یا بدمذاقی سمجھا جائے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ایک مضمون جدید انگریزی شاعری پر، شامل ہو اور اس میں بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی دیے گئے ہیں۔

لائق مولف کا ایک دلچسپ تسامح یہ نظر آیا کہ جنوری ۴۱ء کے ایک مضمون میں اصرار کرتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاں رحمۃ اللہ علیہ کو جان جاناں لکھنا درست نہیں مگر ایک آیندہ مضمون میں جس پر اکتوبر ۴۱ء کی تاریخ درج ہو خود بھی جا بہ جا جان جاناں ہی تحریر فرماتے ہیں (ص ۱۱۴، ۱۱۵)۔ کتاب میں اقتباسات اور دوسروں کے اقوال کو بھی احتیاط کے ساتھ واوین میں یا علاحدہ نمایاں نہیں کیا گیا ہو جس سے بعض اوقات غلط فہمی پیدا ہوتی ہو۔

مجموعی طور پر یہ مجموعہ اربابِ شوق اور خصوصاً اُردو ادب کے طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہو۔ (س)

تصحیح

کتاب "تعلیم کے نئے اصول" پر رسالۂ 'اُردو' بابت جولائی ۴۵ء میں تبصرہ شائع ہوا ہو۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کتاب کی قیمت درج نہیں۔ اب جناب مولف تحریر فرماتے ہیں کہ قیمت عہ/، مقدمۂ کتاب کے بعد کے صفحے پر درج ہو۔ ملنے کا پتا: سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ، اڈیٹر درہ نمائے تعلیم'، لاہور، ہو۔ یہ دونوں باتیں تبصرہ نگار صاحب کی نظر سے نہیں گزریں۔ اب [illegible] کردی جائے۔

---

[1] اس نظم کا، جس کے مقابلے میں فاضل مقالہ نگار کو "حالی کے یہاں ایک قسم کا پھیکاپن یا بےنمکینی" محسوس ہوئی، ایک بند نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہو ؎

بھر دیے پانی نے جل تھل ندیاں بہنے لگیں		چھوڑ کر شانوں پہ زلفیں مسکرائے نازنیں
گم ہو غرقِ سفیدی شوخ تھی کل جو زمیں		سرد پانی چوس کر ذرّوں نے آنکھیں بند کیں
جھوم کر برسی ہو کیا برسات کی پہلی گھٹا

پریم چند از مدن گوپال ۔ ناشر: دی بُک ایوڈ، سرکلر روڈ، لاہور ۔قیمت: تین رُپے آٹھ آنے ۔

مدن گوپال صاحب نے اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس منشی پریم چند پر یہ مختصر سی کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے ۔ جو چھوٹے سائز کے ایک سو تیس (۱۳۰) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔

اس کتاب میں انھوں نے سب سے پہلے پریم چند کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں ۔ اور اس کے تمام نشیب و فراز کو آنکھوں کے سامنے بےنقاب کردیا ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے پریم چند کے ماحول پر روشنی ڈالی ہے اور جن سماجی حالات سے وہ متاثر ہوے ہیں، ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ اور آخر میں انھوں نے ان کی ناول نویسی اور افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ مدن گوپال صاحب نے منشی پریم چند کا مطالعہ کرنے میں بڑی محنت کی ہے ۔ چناں چہ ان کے آرٹ اور زندگی، دونوں کے اسرار و رموز ان پر پوری طرح کھل گئے ہیں ۔

ناولوں پر جہاں انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی ہے، اس میں ایک بات البتہ کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے پریم چند کے فن کا مقابلہ ڈکنس، ٹالسٹائے، گورکی، ہارڈی اور ہکسلے وغیرہ سے کیا ہے ۔ جو ایسا کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوا ۔ زیادہ اچھی بات تو یہ ہوتی کہ مدن گوپال صاحب اس کی بہ جائے ان ناول نگاروں کے اثرات کا تذکرہ کرتے، جو پریم چند نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیے ۔

بہ ہر حال یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے اور چوں کہ وہ ہندستان کے ایک بڑے ادیب کو انگریزی دانوں سے روشناس کرتی ہے، اس لیے اس کا وجود کچھ اور بھی زیادہ اہمیت کا مالک ہوجاتا ہے ۔ (ع ۔ ی)

ادب اور زندگی از مجنوں گورکھ پوری ۔ ناشر: کتاب خانۂ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۔ قیمت دو رُپے

اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد جناب مجنوں گورکھ پوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو کتاب خانۂ دانش محل لکھنؤ نے شائع کیا ہے ۔ اور اگرچہ یہ دوسرا ایڈیشن ہے لیکن بعض حیثیتوں سے پہلے ایڈیشن سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے ۔ کیوں کہ اوّل تو اس میں کئی نئے مضامین کا اضافہ ہے اور دوسرے اس کو کارکنانِ دانش محل نے چوں کہ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے اس لیے اس کی صوری حیثیت بھی پہلے ایڈیشن سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے ۔ "ادب اور زندگی" کے اس ایڈیشن میں جو مضامین بڑھائے گئے ہیں ان میں

"نیا ادب کیا ہے"، "اُردو مختصر افسانے میں جدید میلانات" اور "نظیر اکبر آبادی" (ضمیمہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"نیا ادب کیا ہے؟"ـــــ ہمارے نئے ادبی رجحانات، ان کی اہمیت اور ضرورت پر ایک مختصر مگر نہایت ہی مدلّل، جامع اور سیر حاصل تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں مجنوں صاحب نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہمارے جدید ادب میں ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا جھگڑا دو ایسے طبقوں اور جماعتوں کا جھگڑا ہے، جو زندگی کو دو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور زندگی کے متعلق جن کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہے۔ ان میں سے ایک زندگی کو جامد اور غیر متحرک سمجھتا ہے اور اگر ایسا نہیں سمجھتا تو اس کو جامد اور غیر متحرک بنانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ دوسرے کا خیال ہے کہ زندگی ہر دم جوان اور پیہم رواں دواں ہے جس کی وجہ سے اس کے ہر شعبے میں تغیّر کی حکم رانی ازبس ضروری ہے۔ چناں چہ زندگی کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ ادب بھی کروٹیں بدل رہا ہے۔ اور ترقی پسندی بھی اسی طرح کی ایک کروٹ ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے اپنے وقت کی سماجی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ہے۔ چناں چہ آج کے ادب کا بھی یہی حال ہے کہ اس کے دامن میں وقت کے نہایت ہی اہم سماجی مسائل آگئے ہیں۔ سرمایہ و محنت کی کش مکش، ایک نئی دُنیا کا قیام، طبقاتی تقسیم اور اس کی بے اعتدالیاں، تمدّنی اور سماجی نظام میں انقلاب کی ضرورت، دولت کی مساوی تقسیم، جنسی ناہمواری ـــــ یہ اور اسی طرح کے اور مسائل ترقی پسند ادب کے خاص موضوعات ہیں۔ کیوں کہ آج خود انسانیت ان کی طرف زیادہ توجہ کر رہی ہے۔ وہ ان کو جلد سے جلد حل کرنا چاہتی ہے تاکہ زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔ اور وہ سکون و مسرّت اور امن و شانتی سے ہم کنار ہو ـــــ لیکن مجنوں صاحب سارے نئے ادب کو ترقی پسند ادب خیال نہیں کرتے۔ ان کو اس کا ایک حصّہ ناقص بھی نظر آتا ہے جس میں آیندہ تعمیر کا کوئی جز نہیں۔ ان کے خیال میں "ترقی پسند ادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سنجیدہ وقیع، امید افزا اور حوصلہ انگیز ہو۔ اس میں اگر تصوّف اور تجرّد کی گنجایش نہیں تو کلیت Cynicisam اور چڑچڑاہٹ کا بھی گزر نہیں ہے۔ انقلابیت یا اشتراکیت کا تخیئلی معیار یہ ہے کہ کام کرنے والے میں ایک دُھن ہو اور اس کے ماتھے پر شکن نہ ہو۔ اس کے اندر تھوڑی سی سخت دلی کی ضرورت ہے ورنہ اس کی انقلابیت جذباتی انقلابیت ہو کر رہ جائے گی جو ایک قسم کی خلوبیت Defeatisam ہے"ـــــ غرض یہ کہ وہ ترقی پسند ادب کی کم زوریوں کو کم زوریاں اور خامیوں کو خامیاں کہنے سے ہچکچاتے نہیں بلکہ وہ ترقی پسندی کے تخریبی رجحانات کو ختم کرنا بھی

اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ تعمیری رجحانات کے وجود کو ضروری جانتے ہیں۔ ان کو ترقی پسند ادب کے ماضی سے کنارہ کشی بھی منظور نہیں برخلاف اس کے ان کی نظر میں ماضی کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے افعال میں ماضی سے قطع تعلق کرکے کوئی بڑا ادبی کارنامہ پیش کیا ہی نہیں جاسکتا کیوں کہ جدید ادب کی جڑیں بہرحال ماضی ہی میں پیوست ہوتی ہیں جن کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا گویا اس کی فطری نشو ونما کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ " ماضی یک قلم حرفِ غلط ہے اور اسلاف کے اکتسابات ہمارے کسی کام کے نہیں دھوکا ہے۔ روایات یعنی ماضی کے اکتسابات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کو انھی کو لے کر آگے بڑھنا ہے ورنہ تاریخی تسلسل باقی نہیں رہے گا" ان کے نزدیک روایات نہایت زبردست سماجی قوتیں ہیں مگر وہ جامد اور غیر متحرک ہیں۔ جس میں وہ حرکت پیدا کرکے ان کو انقلاب اور ترقی کی قوتوں میں تبدیل کردینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ رجعت اور انحطاط کے اسباب نہ بن جائیں ـــــ غرض یہ کہ نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر ان کے خیالات نہایت ہی سلجھے ہوئے ہیں۔ جن کو پیش کرکے انھوں نے ترقی پسند ادب کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کردی ہے۔

مجنوں صاحب نے "اُردو مختصر افسانے میں جدید میلانات" پر جو مضمون لکھا ہے۔ وہ بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن جامعیت رکھتا ہے۔ چوں کہ یہ کئی سال ادھر لکھا گیا ہے اس لیے اس میں ان رجحانات اور میلانات کا ذکر موجود نہیں ہے۔ جو پچھلے دو تین سال میں افسانہ نگاری میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور نہ اُن افسانہ نگاروں ہی کا تذکرہ ہے جن کا فن اسی عرصے میں پروان چڑھا ہے۔ مثلاً اس مضمون میں کرشن چندر، فیاض محمود، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور ان بے شمار بالکل نوجوان لکھنے والوں کا ذرا بھی ذکر نہیں ہے جو بہت ہی تھوڑے عرصے میں ہمارے افسانوی ادب پر چھاگئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مجنوں صاحب نے یہ مضمون اس وقت لکھا ہے جب ان سب کے فنوں میں کوئی خاص سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے شاید انھوں نے ان کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال جو کچھ انھوں نے اُردو افسانوں کے جدید میلانات پر لکھا ہے وہ گہری سوچ کا نتیجہ ہے۔

ان کے علاوہ اس مجموعے میں جو دوسرے مضامین شامل ہیں وہ بھی کسی کم اہمیت کے مالک نہیں یہ ادب

اور زندگی"، "مبادیاتِ تنقید"، "زندگی اور ادب کا بحرانی دور"، "ادب اور ترقی"، "ہندستانی ناٹک"، "نظیر اکبرآبادی" اور "حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں" ـــــ یہ سب کے سب نہ صرف اپنے موضوعات کے اعتبار سے اہم ہیں بلکہ اپنے اندر سوچ کی وہی بلندی اور تفکر کی گہرائی رکھتے ہیں۔

"ادب اور زندگی"، "مبادیاتِ تنقید"، "زندگی اور ادب کا بحرانی دور"، "ادب اور ترقی" ـــــ ان چاروں مضامین میں کچھ ایسی ادبی باتیں سموئی ہوئی ہیں، کچھ ایسے ادبی مباحث کا تذکرہ ہے، کچھ ایسے ادبی مسائل کا بیان ہے، جن پر مختلف ممالک میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُردو ادب جن سے بہت بڑی حد تک آج بھی تہی دامن ہے ــــ وہ ادبی باتیں اور ادبی مسائل یہ ہیں کہ ادب کیا ہے؟ ۔ادب کے عناصر کیا ہیں؟ ۔ادب کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں؟ ۔ ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ ــــ اور آیا کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ ۔ادب کی سماجی اہمیت کیا ہے؟ ادب انسانیت کے لیے کیوں ضروری ہے؟ ادب کا مقصد کیا ہے؟ ۔کس زمانے میں کیسا ادب پیدا ہونا چاہیے؟ ادب کا کوئی افادی پہلو ہے بھی یا نہیں؟ ۔ ادب اور جمالیات سے کیا رشتہ ہے؟ ۔ ادب میں حُسن کاری کی کیا اہمیت ہے؟ ۔ اور وہ کس حد تک ضروری ہے؟ ۔ ادب میں مواد اور ہیئت موضوع اور اسلوب کس چیز کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے؟ ــــــ غرض یہ کہ کچھ اسی طرح کے موضوعات ہیں جن پر مجنوں صاحب نے نہایت کام یابی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ اور جس نے بڑی حد تک اُردو تنقید کے نظریاتی پہلو کو مضبوط بنانے میں مدد کی ہے۔

(ع - ی)

معاشیات

مطبوعات

ادارۂ معاشیات حیدرآباد دکن | خوشی کی بات ہے کہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے اساتذہ وطلبہ نے مختلف ادارے علمی اور اصولی مباحث پر کتابیں شائع کرنے کے لیے قائم کیے ہیں جن میں ایک ادارۂ معاشیات بھی ہے جو اس وقت تک مختلف اقتصادی مسائل پر بہت سے رسائل شائع کرچکا ہے اور ان میں سے بعض پر "اُردو" کی سابقہ اشاعتوں میں تبصرہ بھی کیا جاچکا ہے۔ اس ادارے کے نگراں بلکہ روحِ رواں ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی کا نام کسی مزید تعریف و تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

ان رسالوں کی عام خصوصیت یہ ہے کہ معاشیات کے ضروری اہم مسائل جن کا روزمرّہ کی زندگی سے تعلق ہے انھی پر بحث کی گئی ہے اور ہر مبحث پر ایک الگ رسالہ لکھا گیا ہے جو کم و بیش اسّی صفحات کی مختصر ضخامت میں ہے اور اسی میں تمام کام کی باتیں بیان کردی گئی ہیں۔ ہر مضمون پر مختلف لکھنے والوں نے لکھا ہے اور اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ اندازِ بیان ایسا رہے کہ معمولی درجے کے اُردو خواں کی سمجھ میں آجائے اور اس طرح عامی اور عالم دونوں کے لیے یکساں مفید ہو۔ حال ہی میں اس ادارے نے جو رسائل ہمیں بغرض تبصرہ بھیجے ہیں ان کا حال مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہے۔ یہ رسائل ادارۂ معاشیات فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن سے مندرجۂ ذیل قیمتوں پر حاصل کیے جا سکتے ہیں:۔

'معاشی لائحۂ عمل'، حصّہ دوم، مترجمہ سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) حجم ۵۸ صفحے قیمت بارہ آنے۔

یہ مشہور و معروف بمبئی پلان کے ترجمے کا دوسرا حصّہ ہے۔ پہلے حصّے پر اس کے پیش تر تبصرہ کیا جا چکا ہے' اس دوسرے حصّے میں تقسیمِ دولت اور حکومت کے فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ چوں کہ تعمیرِ بعد از جنگ کے مسائل اس وقت زیرِ بحث ہیں، جس میں بمبئی پلان کو خاص اہمیت حاصل ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے مصنّفین میں سے ایک صاحب یعنی سر اردیشر دلال اس وقت حکومتِ ہند کے ممبر ہیں جن کے سپرد اسی قسم کا کام کیا گیا ہے۔ اس لیے اُردو داں پبلک کو اس پلان کی تفصیلات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے اور امید ہے کہ رسالۂ زیرِ نظر کے ہر دو حصّے دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔

'زرعی پیداوار کی فروخت'۔ از محمّد تاج الدّین بی اے (عثمانیہ) و مانک بھٹ صاحب عثمانیہ۔ حجم ۸۰ صفحات قیمت عمہ

اس رسالے میں اہم زرعی پیداوار اور ان کی فروخت کا موجودہ طریقہ، اس طریقے کے نقائص اور جدید منظّم طریقے کی تجاویز پیش کی گئی اور اس کی اصلاح میں حکومت جو کارروائیاں کرسکتی ہے وہ بتائی گئی ہیں حکومت نے کچھ دنوں سے مارکٹنگ کا محکمہ قائم کیا ہے مگر ابھی اس میں اتنی وسعت نہیں ہوئی ہے کہ زرعی پیداوار کی فروخت پر قابو حاصل کرسکے اور حریص بنیوں اور آڑھتیوں سے جنس پیدا کرنے والوں کو جو تکلیفیں اور نقصانات پہنچتے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ اس مسئلے پر جلد تر توجہ کی جائے۔ ہندستان ایک زرعی مُلک ہے اور یہاں اگر زرعی

پیداوار کی فروخت کا انتظام بھی معقول نہ ہوا تو ملک کی اقتصادی حالت کس طرح درست ہوسکتی ہے۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اسی مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔

"نظری اور عملی معاشیات" از محمد ناصر علی ایم اے (عثمانیہ)، حجم ۸۲ صفحات قیمت ۸ر

اس رسالے میں عام معاشیات اور خصوصاً ہندستانی معاشیات کے بعض مسائل پر اصولی اور عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ خاص کر ہندستان کے اضافۂ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہے اور ہندستان کی قدیم صنعتیں اور ان کے زوال کے اسباب سے بحث کی ہے۔ اندازِ بیان ادارۂ سیاسیات کے عام معیار کے مطابق عام فہم ہے اور مصطلحات سے حتی الامکان پہلو بچا کر لکھا گیا ہے جس سے عام لوگوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

"ہندستان کا مالی نظام"۔ از خواجہ شمس الدین بی اے (عثمانیہ) حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۸ر۔

اس رسالے میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ہندستان کے نظامِ مالیہ سے بحث کی گئی ہے اور انتظامی اداروں میں مالیات کی اہمیت بتا کر ہندستانی مالیات کی تاریخ اور اہم محاصل کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات اور ان کا ہندستانی مالیے پر اثر دکھایا گیا اور پھر ہندستانی مالیے پر جنگ کے اثرات واضح کرکے عام مالی پالیسی پر بحث و تنقید کی گئی ہے۔ اس طرح ہندستانی مالیے کا مسئلہ عام فہم زبان میں پورے طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، جو امید ہے کہ مقبول ہوگی۔

"ہندستان کے زرعی مسائل"۔ از شفیق الرحمان بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت ۸ر

ہندستان ایک زرعی ملک ہے اور صنعت و حرفت کی یہاں کتنی ہی ترقی ہوجائے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہے گی اس لیے زراعت کا مسئلہ ہندستان کے لیے تمام اقتصادی مسائل میں سب سے زیادہ اہم ہے اور اس رسالے میں اس "مسئلے" سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ زمین کی زرخیزی، کھاد کا استعمال، ذرائع آب پاشی، تقسیم و انتشارِ اراضی، زرعی آلات، مواشی غرض کہ تمام متعلقہ زرعی مسائل کی وضاحت کرکے زرعی ترقی کے مستقبل پر ماہرانہ بحث کی گئی اور عملی اصلاحی تدابیر بتائی گئی ہیں جو حکومت اور قومی کارکنوں دونوں کے لیے مفید ہوں گی۔

'ہندستان کے صنعتی مسائل'۔ از سعید احمد مینائی، بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۶ صفحات قیمت عمر۔

ہندستان کی صنعتی رفتار کو حکومت کی غیر جانب دارانہ بلکہ غیر ہمدردانہ پالیسی سے جو نقصان پہنچا ہی وہ اس رسالے میں واقعات و اعداد و شمار سے واضح کیا گیا ہی اور دکھایا گیا ہی کہ کس طرح یہاں کی اکثر عمدہ صنعتیں اس پالیسی کی وجہ سے فنا ہوگئیں۔ اور پھر ان کے دوبارہ زندہ کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ قدیم صنعتوں کے فنا ہوجانے کی وجہ سے یہاں کے صنعتی کاروبار کو پھر سے اُبھارنے کی ضرورت ہی جو بغیر تامین (پروٹیکشن) کے ممکن نہیں ہی لیکن تامین کے سلسلے میں بھی حکومت نے جو قدم اٹھایا ہی وہ بہت ہی ناکافی اور غیر تشفی بخش ہی۔ گھریلو صنعتیں جو ہندستان میں خاص اہمیت رکھتی ہیں؛ حکومت کی توجّہ کی محتاج ہیں اور اس بات کی ضرورت ہی کہ انھیں ماہرانہ مشورے اور بازار کے بدلتے ہوے حالات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ہندستانی حرفتوں کے مالی پہلو سے بھی بحث کی گئی ہی اور موجودہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔

'ہندستان کی تجارت'۔ از محمد معین الدین بلگامی، بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۴ صفحات، قیمت عمر

اس رسالے میں معاشیات کی اُس اہم شاخ سے بحث کی گئی ہی جو مُلکی تجارت سے متعلق ہی۔ اس میں ہندستان کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے مسائل سے تاریخی پس منظر کے پیشِ نظر بحث کی گئی ہی اور تنزل کے اسباب بتاکر اصلاح کی تجاویز بتائی گئی ہیں۔ ہندستان کی تجارت پر جنگ کے اثرات بھی اعداد و شمار سے واضح کیے گئے ہیں اور آیندہ تجارتی ترقّی کے لیے جن وسائل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہی اُن کی مدلّل تشریح کی گئی ہی۔ توازنِ تجارت اور توازنِ ادائی کے مسائل ذرا اصولی قسم کے ہیں مگر مُلک کی عام فلاح اور اقتصادی حالت پر ان کا بہت بڑا اثر پڑتا ہی اس لیے ان مسائل پر بھی حتی الامکان عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہی۔

'ہندستان کی سڑکیں اور ریلیں'۔ از ارجن پرشاد شرما (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عمر۔

ہندستان میں نقل و حمل کا مسئلہ بہت کچھ محتاجِ اصلاح و ترقّی ہی، اور چوں کہ کسی ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ بہت کچھ اسی سے ہوتا ہی اور اسی پر دار و مدار ہی اس لیے حکومت اور قومی کارکنوں کو اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا اور ضروری تدابیر اختیار کرنا چاہیے۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اس مسئلے کے ایک پہلو یعنی ریلوں

اور سڑکوں سے بحث کی گئی ہو اور ان کی انتظامی خامیوں کو واضح کر کے اصلاح کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ریلوں کی ہندستان میں کمی کا مظاہرہ موجودہ جنگ میں نہایت ہی افسوس ناک طریقے پر ہوا جب کہ ضروریاتِ سفر میں زیادتی اور انتظاماتِ نقل وحمل کی کمی کی وجہ سے مسافروں کی تکلیفیں انتہا کو پہنچ گئیں اور خاص کر نیچے درجے کے مسافر توسامانِ باربرداری کی طرح ٹھونس ٹھونس کر ریل کے ڈبّوں میں بھرے جانے لگے اور پٹروں پر لٹک کر ریل پر چلنے والوں کو اکثر مہلک حادثات پیش آئے۔ اس معاملے میں حالات کو سمجھ کر حکومت پر زور ڈالنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہوگی جس میں عام فہم زبان میں مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھایا گیا ہو۔

’ہندستان میں امدادِ باہمی کی تحریک‘۔ از محمد طاہر حامد (عثمانیہ) حجم ۸۷ صفحات قیمت عہ ر

اس رسالے میں مختلف ممالک میں امدادِ باہمی کے حالات دکھا کر ہندستان میں اس تحریک کی حالت سے مقابلہ کیا گیا ہو اور موجودہ نظام پر تنقید و تبصرہ کر کے آیندہ کے لیے مفید علمی تجاویز بتائی گئی ہیں۔ ہندستان میں مہاجنی کاروبار کی ترقی کی بڑی وجہ امدادِ باہمی کے اداروں کی کمی ہو، اور مہاجنی ذہنیت جو اخلاقی حیثیت سے بہت ہی پست ہوتی ہو اسی خامی کی پیداوار ہو۔ اس لیے امدادِ باہمی کی تحریک کو ہندستان میں بہت ترقی دینے اور پھیلانے کی ضرورت ہو تاکہ حرفتی کاروبار میں لگانے یا اہم ذاتی اخراجات کے رُپے کی ضرورت اسی سے حل ہو سکے اور مہاجنوں سے قرض نہ لینا پڑے جو غریب طبقے کے لیے بہت گراں پڑتا ہو اور اس سے ان کی ساری زندگی پریشانی میں گزرتی ہو۔ زیرِ نظر رسلے میں اِس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہو، جو حکومت اور عوام الناس دونوں کے لیے مفید ہو۔

’’زرعی قرض داری‘‘۔ از سید عبداللہ (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ ر

ہندستانی مزارعین کو سب سے زیادہ پریشانی مہاجنی قرضے کی ہو جس کی وجہ سے اُن کی سخت محنت کی پیداوار پر مہاجن کا قبضہ ہوجاتا ہو اور دیہی مہاجن اتنے حریص ہوتے ہیں کہ وہ مقروض مزارعین کا جونک کی طرح خون چوس لیتے ہیں۔ رسالہ زیرِ نظر میں زرعی قرض داری کا ہول ناک نقشہ اعداد و شمار سے کھینچ کر دکھایا گیا ہو اور حکومت نے صورتِ حال کی اصلاح کے لیے جو قوانین وقتاً فوقتاً بنائے ہیں، ان پر بحث کی گئی ہو۔ پھر ایک باب میں خاص مملکتِ حیدرآباد کے حالات کی وضاحت کر کے زرعی قرض داری کو روکنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں

جن پر صوبائی حکومتوں کو غور کرنا چاہیے اور قومی اداروں کو اس معاملے میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

'ہندستان کی قومی آمدنی': از توفیق محمد خاں بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ،

کسی ملک کی قومی آمدنی کا بیشتر وہاں کے باشندوں کے معیارِ زندگی سے اندازہ کیا جاتا ہو اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہندستان کا معیار اس سلسلے میں بہت ہی پست ہو جسے اُبھارنے کے لیے خطیر رقم سرمایے سے طویل مدت تک کام کرنے کی ضرورت ہو جیسا کہ مشہور 'بمبئی پلان' کے مرتبہ نتائج سے معلوم ہوتا ہو۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ نہایت ہی اہم ہو اور اسے پورے طور پر سمجھنے کے لیے کچھ اصولی معلومات کی بھی ضرورت ہو۔ رسالہ زیرِ نظر میں اسی مسئلے سے بحث کی گئی ہو اور جہاں تک عام فہم زبان میں ممکن ہوسکا اس کے ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ آخر میں قومی آمدنی میں اضافہ اور باشندوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں اور اس سلسلے میں 'بمبئی پلان' کی تجاویز پر بھی تبصرہ کیا گیا ہو۔

'ہندستان کے مزدوروں کے مسائل': از حامد محی الدین بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ،

کسی ملک کی معاشی زندگی میں مزدور کو جو اہمیت حاصل ہو اُس کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کرسکتے جو ان کی محنت کی پیداوار کو قلیل قیمت پر لے کر اپنی آسائشوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ ہندستان کی حکومت جو دفتری قسم کی ہو مزدوروں کے مسائل کو پورے طور پر سمجھنے سے قاصر ہو اور اس دفتری راج میں مزدور کی حالت بہت زیادہ ناگفتہ بہ ہوتی جاتی ہو۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اس مسئلے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہو اور ہندستانی مزدوروں کے مخصوص مسائل کی تشریح کرکے اُن سرکاری قوانین پر تبصرہ کیا گیا ہو جو مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے وقتاً فوقتاً بنائے گئے اور جن سے کوئی قابلِ لحاظ اصلاح نہیں ہوئی۔ موجودہ جنگ میں ہندستان کے مزدور طبقے کو جس طرح متاثر کیا ہو اس کی بھی تشریح کی گئی ہو اور تنظیم بعد از جنگ میں مزدوروں کا جو حصہ ہونا چاہیے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے جس قسم کی تدابیر کی ضرورت ہو ان کی تشریح کی گئی ہو۔

'ہندستان کا نظامِ بنک کاری': از رام اوتار بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ،

موجودہ سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت میں نظامِ بنک کاری کو بڑی اہمیت حاصل ہو اور جب تک دُنیا میں

سوُد کا رواج ہو اور قانون اس وسیلۂ آمدنی کو جائز رکھتا ہو اُس وقت تک بنکوں کا قیام ضروری ہو اور ان کے ذریعے سے مہاجنی کاروبار کو بڑی حد تک گھٹایا اور مزارعین اور اہلِ حرفہ کے بارِ قرض کو بہت کچھ ہلکا کیا جاسکتا ہو مگر ہندستان کے موجودہ نظامِ بنک کاری کو عوام الناس سے دوُر کا بھی واسطہ نہیں رکھا گیا ہو اور بنکوں کا سارا کاروبار سرمایہ داروں سے رہتا ہو۔ اس نظام کی کایا پلٹ تو بہ حالتِ موجودہ دُشوار ہو لیکن اصلاح و ترقی کی جو گنجایش اس میں ہو وہ بہ روے کار لائی جاسکتی ہو اور اس کے لیے ضرورت اس کی ہو کہ خود اس نظام کی تفصیلات کو سمجھا جائے ۔ زیرِ نظر رسالے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہو اور اس کی اصلاح کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ مبادلے اور تجارتی لین دین کی موجودہ شکل کو مُلکی مفاد کے لحاظ سے بدلنے کی بھی ضرورت بتائی گئی ہو اور یہ کوشش کی گئی ہو کہ تمام متعلقہ مسائل عوام الناس کی سمجھ میں آجائیں ۔

'ہندستان کا معاشرتی نظام': از حسن الدین احمد بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۷ صفحات قیمت ۸؍۔

عام ملک کی اقتصادی حالت پر وہاں کے نظامِ معاشرت کا بہت بڑا اثر پڑتا ہو اور رہن سہن لباس غذا مکان پانی وغیرہ کی خرابیوں کی وجہ سے نہ صرف صحت متاثر ہوتی ہو بلکہ اقتصادی حالت میں بھی تنزل ہوتا ہو۔ بہت سی شادی بیاہ وغیرہ کی رسمیں اور برادری کے رواج اسراف کا باعث ہوتے ہیں جس میں لوگ مقروض ہوجاتے ہیں اور یہ قرض محدُود آمدنی میں ادا نہیں ہو پاتا جس سے ساری عمر پریشانی میں گزرتی ہو اور تمام صلاحیت کارمردہ ہوجاتی ہو۔ اس لیے اقتصادی مسائل کے اس شعبے سے عوام کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہو اور رسالۂ زیرِ نظر میں یہ کوشش کی گئی ہو کہ ہندستان کے موجودہ معاشرتی نظام کی خرابیوں کو واضح کرکے ان کی اصلاح کی تدابیر بتائی جائیں اور اس سلسلے میں حکومت اور عوام الناس کا جو فرض ہو اُس پر توجہ دلائی جائے ۔ موجودہ جنگ کا جو اثر ہندستانی معاشرت پر پڑا ہو اور جنگ کے بعد جو مسائل اس سلسلے میں پیدا ہوں گے ان کی بھی تشریح کی گئی ہو اور بعد از جنگ کی بے روزگاری اور تجارتی کسادبازاری کو قابو میں رکھنے کی ضرورت واضح کی گئی ہو خاص کر حکومت کو اس بارے میں جو تدابیر اختیار کرنی چاہییں وہ بتائی گئی ہیں ۔　　　(ر ۔ ع ۔ ہ)

رسائل کے خاص نمبر اور سال نامے

'تربیت' (انجمنِ اساتذہ صوبۂ اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ)

یہ سہ ماہی رسالہ صوبۂ اورنگ آباد دکن کے اساتذہ نے مولوی سید ساجد علی صاحب صدرِ مہتمم تعلیمات صوبۂ اورنگ آباد کی سرپرستی میں جاری کیا ہے۔ اس کا مقصد تعلیم و تربیت ہے۔ جو مضامین اس پہلے نمبر میں درج کیے گئے ہیں وہ مقصد کے اعتبار سے اُستادوں کے لیے بہت مفید ہیں اور ان سے اُن کے علم اور معلومات میں کافی اضافہ ہوگا اور انھیں اپنے تجربوں میں بہت مدد ملے گی۔ اُستاد کے فرائض بہت اہم ہیں اور یہ اسی حالت میں بہ خوبی انجام دے سکتے ہیں جب کہ ان کی معلومات میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ اس رسالے کے ذریعے اساتذہ اپنے اپنے تجربے دوسروں تک پہنچا سکتے اور تعلیم و تربیت میں آسانیاں بہم پہنچا سکتے ہیں۔

سال نامہ "آج کل" یہ رسالہ جنگ کی پیداوار ہے۔ جنگ کے متعلق تو اس میں دو چار صفحے ہی ہوتے ہیں، باقی سارا رسالہ دِل چسپ اَدَبی مضامین اور فسانوں اور شعر و شاعری کے لیے وقف ہوتا ہے اور اس وجہ سے اِسے بہت مقبولیت حاصل ہوگئی۔ یہ سال نامہ ۱۵۲ صفحات پر ہے۔ اس میں بعض بہت اچھے مضمون پڑھنے اور مطالعے کے قابل ہیں۔ مضامین کی نوعیّت بھی گوناگوں ہے۔ تاریخی، تنقیدی، علمی، معاشیاتی کے علاوہ دو ڈرامے، پندرہ افسانے اور کوئی اکتیس نظمیں اور غزلیں ہیں اور سولہ تصویریں۔ اس رسالے کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے قابل اڈیٹر نے اُردو کے اچھے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ یہ سال نامہ اس کا شاہد ہے۔ اس میں ہر ذوق کے لیے دل چسپی اور غور و فکر کا سامان موجود ہے۔ ہم اس کے اڈیٹروں کو اس کام یابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

"شاہ کار" یہ "شاہ کار" کا "ترقّی پسند ادب" نمبر ہے۔ اس میں آپ کو ترقّی پسند اَدَب اور اس کے کارناموں کے جانچنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔ اس میں نثر بھی ہے اور نظم بھی۔ اَدَب بھی اور اس کی تنقید بھی۔ خوبیاں بھی اور خامیاں بھی۔ لکھنے والے زیادہ تر ترقّی پسند ہیں اور ایک دوسرے کو سراہتے ہیں، یہ قابلِ تعریف بات ہے۔ منظومات میں بے قافیے اور قافیے دار دونوں طرح کی نظمیں ہیں۔ فسانے مختلف رنگ کے ہیں، بعض ترجمے ہیں بعض طبع زاد، لیکن سب میں جدّت اور ترقّی پسندی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

سال نامہ "عالم گیر" اس میں زیادہ تر شعر و شاعری اور فسانے ہیں۔ اَدَبی مضمون صرف تین ہیں۔ ایک معمولی تنقیدی دوسرا ترقّی پسند اَدَب کی تائید میں، تیسرا "روایات اور جدید تخیّلِ شعری"

پر۔ نظموں میں ترقی پسند شاعر نہیں ہیں۔ فسانوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

'نئی زندگی' اس رسالے نے اگست ۱۹۴۵ء میں فران سسکو نمبر شائع کیا ہے، اس نمبر میں مختلف لکھنے والوں نے اس کان فرنس کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اسے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بین الاقوامی تنظیم اور جمعیت الاقوام کی تاریخ و واقعات۔ دوسرے باب میں ڈمبرٹن اوکس کے منصوبے اور اُن کی تجویزوں اور بین الاقوامی مجلسِ امن کی تنقید ہے۔ تیسرے باب میں کان فرنس کے فیصلے اور چوتھے میں نیا نظامِ عالم اور ہندستان اور آخر میں اخبارات کی رائیں ہیں۔

اڈیٹر نے ٹھیک لکھا ہے کہ "سان فران سسکو کان فرنس میں جو سب سے بڑی کمی نظر آتی ہے وہ باہمی اخلاص کی کمی ہے"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اور کون سی ایسی جمعیت ہے جس میں یہ کمی نہیں۔

مجموعہ مقالاتِ علمیہ حیدرآباد اکادمی کا ساتواں رسالہ ہے جو 'اردو' کی تقطیع اور گنجان خط کے ۱۴۳ صفحات پر، اکادمی کی مجلسِ ادارت نے شائع کیا ہے۔ مجلس کے ارکان، اور اس مجموعے کی قیمت وغیرہ کی تفصیل رسالے میں تحریر نہیں ہے۔ مجموعہ پانچ مضامین پر مشتمل ہے:۔ (۱) "حقائقِ حیاتِ انسانی" جس میں سابق پرنسپل کلیۂ عثمانیہ مولوی عبدالرحمان خاں صاحب نے انسان کے دُنیا میں ظہور کرنے کے وقت سے موجودہ زمانے تک کے حقائق پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ ابتدائی حصے میں سائنس کے دقیق مسائل و قیاسات کی بحث کی ہے تو آخر میں گھریلو زندگی اور اجتماعی اور انفرادی اخلاق کے مباحث بھی زیرِ نظر آگئے ہیں۔ (۲) مولوی عبدالقادر صاحب نے "ادارۂ جنگ کی معاشی توجیہ" کے عنوان سے جنگ کے تجارتی اور مالی اسباب کے بعض جدید نظریات پر نظر ڈالی ہے۔ اِدارہ، غالباً انسٹی ٹیوشن کا ترجمہ ہے لیکن اس موقع پر دستور یا آئینِ جنگ ہمارے محاورے کے مطابق ہوتا۔ اِدارہ، ایک جماعتی نظام کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقصد کے لیے قائم اور عمل میں مصروف ہو۔ ایک مقالے میں ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب قادری نے کوئی تین جُز کے اندر "فارسی شاعری کا آغاز اور اس کی تاریخ" سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس پامال مضمون کے لکھنے میں متداول تذکروں کے علاوہ تاریخِ سیستان سے بھی مدد لی گئی ہے۔ یہ تاریخ قرنِ سابع میں تالیف ہوئی لیکن صدیوں سے گم نام رہی اور حال میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں بعض حالات یا قیاسات نئے ہیں اگرچہ ضرور نہیں کہ دوسرے اقوال کے مقابلے میں انھیں زیادہ صحیح مانا جائے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین

صاحب نے اپنے خاص انداز میں اقبال کے نظریۂ عقل وعشق پر بہت دل چسپ بحث لکھی ہو۔ آخری مقالے میں مولوی یوسف الدین صاحب نے تعلیمی تنظیم بعد از جنگ کے مسئلے پر قلم اُٹھایا ہو۔ اور سارجنٹ صاحب کی تجاویز پر اجمالی نظر ڈالی ہو۔ حال آں کہ مفید عام ہونے کے اعتبار سے یہ مضمون زیادہ سلاست و وضاحت چاہتا تھا۔ بہرحال خوشی کی بات ہو کہ حیدرآباد اکادمی عالمانہ قسم کے مضامین چھاپنے میں کوشاں ہو اور زبانِ اُردو کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہی ہو۔

اعلان

ہندستانی اکادمی یو، پی الہ آباد کی مجلسِ عالمہ نے اُردو کی مطبوعہ کتابوں پر پانسو رُپے سالانہ انعام دینے کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہو کہ

۱ ـــ ہر سال مندرجۂ ذیل مضمونوں میں سے ایک پر سلسلے وار انعام دیا جایا کرے گا :-

(الف) شعر اور ڈراما	(د) تاریخ اور حیات نگاری
(ب) ناول اور مختصر افسانے	(ﮦ) فلسفہ
(ج) مضامین (عام اور انتقادی)	(و) نیچرل سائنس

۲ ـــ انعام سنہ ۱۹۴۵ء میں شعر اور ڈرامے کی کتابوں پر دیا جائے گا۔

۳ ـــ شعر اور ڈرامے کی صرف اُن کتابوں پر غور کیا جائے گا جو ۳۱ر مارچ سنہ ۴۱ء کے بعد شائع کی گئی ہیں۔

پبلک، اہلِ علم حضرات اور طابعین و ناشرین سے درخواست ہو کہ ہندستانی اکادمی کو مندرجۂ بالا تاریخ کے بعد شائع شدہ شعر اور ڈرامے کی کتابوں کے متعلق تفصیلات سے مطلع فرمائیں تاکہ ابتدائی انتخاب کے وقت اُن پر غور کیا جاسکے اور منتخب کتابوں کے متعلق ججوں کی کمیٹی فیصلہ کرسکے

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ ع سے رسالۂ « سائنس » بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ رپے ششماہی دو رپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے ، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی‌الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے :-

معتمد مجلس ادارت رسالۂ « سائنس »

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ :— رسالہٴ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع) تک دفتر انجمن ترقیٴ اردو (ہند) دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 25 October 1945 No. 4

THE URDU

The Quarterly Journal
OF
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by
ABDUL HAQ

Published by
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
Delhi.

جلد ۲۵ جنوری ۴۵ء نمبر ۱

اردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر :- عبد الحق

شائع کردہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

اُردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے -

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم آج کل تقریباً سوا سو صفحات، چونکہ قوانین کنٹرول کے سبب کاغذ نپا تلا ملتا ہے -

۳ - سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے - نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے -

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۰، دریا گنج - دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے -

المشـــــــــــــــــــــــتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنے پورا ایک صفحہ	۱۶ روپے	۶۰ روپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۹ روپے	۳۲ روپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۵ روپے	۱۸ روپے

اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے - غیرمہذب اشتہارات شائع نہیں کیے جائیں گے -

المشـــــــــــــــــــــــتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

جلد ۲۵ جنوری سنہ ۴۵ء نمبر ۱

اُردو

انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:- عبدالحق

شائع کردہ

انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی

اُردو

جلد ۲۵ جنوری سنہ ۴۵ء نمبر ۱

فہرستِ مضامین

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماراں دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

اُردو میں علمی اصطلاحات

میرے علم اور تحقیق میں ہندستانی زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہی جس میں زمانۂ دراز سے علمی اصطلاحات پر غور و فکر کیا گیا اور مختلف اوقات میں اس کے اصول وضع کیے گئے۔ ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا جب کہ دہلی کالج میں تمام جدید علوم مثلاً جغرافیہ، تاریخ، نیچرل فلاسفی، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبعیات وغیرہ وغیرہ اُردو زبان کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے۔ سارے ہندستان میں صرف یہی کالج تھا جہاں اس اصول پر عمل ہوتا تھا۔ اس وقت کے ماہرینِ تعلیم نے نیز سرکاری رپوٹوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہی کہ کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی قابلیت اُن طالب علموں سے کسی طرح کم نہیں جو انگریزی کے ذریعے ان علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ کالج کی مجلسِ ترجمہ نے تخمیناً ڈیڑھ سو کتابوں کا ترجمہ کیا یا کتابیں تالیف کیں۔ صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اصطلاحات کے وضع کرنے کے اصول بھی تجویز کیے ہیں۔ یہاں اُن اصول کا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ جب سائنس کے کسی ایسے لفظ کا مترادف اُردو میں موجود نہ ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہی مثلاً سوڈیم، پوٹے سیم، کلورین وغیرہ تو وہ بجنسہٖ اُردو میں لے لیا جائے۔ یہی اصول اُن القاب و خطابات اور عہدوں کے متعلق بھی اختیار کیا جائے جن کا ذکر تاریخ میں آتا ہی۔

۲۔ جب سائنس کے کسی ایسے لفظ کا ہم معنی اُردو لفظ موجود ہی جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہی تو اُردو لفظ استعمال کیا جائے۔ مثلاً آئرن کے لیے لوہا، سلفر کے لیے گندھک، منسٹر کے لیے وزیر، سمنز SUMMONS کے لیے طلب نامہ۔

۳۔ اگر لفظ مرکب ہی اور اس کے دونوں جز انگریزی ہیں۔ اور دونوں میں سے کسی کا ہم معنی لفظ اُردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہٖ اُردو میں منتقل کر لیا جائے مثلاً ہای ڈرو کلورین کیوں کہ ہای ڈروجن اور

کلورین کے ہم معنی لفظ اُردو زبان میں نہیں ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو اُردو میں لے لیا جائے۔

۴۔ اگر لفظ مرکب ہو اور اُردو میں اس کا کوئی ہم معنی لفظ نہیں، مگر اس کے ہر دو اجزا کے الگ الگ مترادف اُردو میں موجود ہیں تو یا تو اِن دونوں کو مِلاکر یا کسی دوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کرلیا جائے۔ جیسے کرانولوجی Chronology کا ترجمہ علمِ زماں۔ ہاؤس آف لارڈز کا کچہری امیروں کی، ہاؤس آف کامنز کا کچہری وکلاے رعایا کی یا صرف کچہری وکلا کی۔

۵۔ جب یہ قاعدہ یا قاعدۂ ذیل آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر زبان کا لفظ اُردو میں لے لیا جائے۔ جیسے ہائیڈروجن، نائٹروجن وغیرہ۔

۶۔ اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہو جن میں سے ایک کا مترادف اُردو میں موجود ہو مگر دوسرے کا مترادف نہیں ہو تو ایک انگریزی اور دوسرے اُردو سے مرکب بنا لیا جائے۔

۷۔ بعض لفظ ایسے ہیں جیسے آرڈر Order کلاس، جینس Genus، سپیشیز Species جن کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اُردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اُردو میں منتقل کرلیے جائیں تو مناسب ہوگا۔ کیوں کہ اُردو میں اس قبیل کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں اور اس سے اصل مفہوم کے سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہوجاتا ہو۔ حالاں کہ ان الفاظ کے معانی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت اہم ہو۔

۸۔ درختوں کے انواع (یا خاندانوں) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا اس نوع کے بعض مشترک خواص کی بنا پر نام رکھ لیا جاتا ہو۔ اس قاعدے کی پابندی اُردو میں بھی کی جائے۔ اگر یہ زیادہ سہل اور کارآمد ثابت ہو کہ ہر نوع (خاندان) کے الگ الگ نام صرف اس کے خاص اور نہایت ممتاز افراد پر رکھے جائیں تو پھر یہی کیا جائے۔

اوپر کے قواعد میں اُردو مترادف سے ایسا لفظ مراد ہو جو مُلک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقے میں معروف ہو۔ اگر ہماری مشرقی زبانوں کی لغات میں کوئی ہم معنی لفظ نہ ملے اور پنڈتوں

اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے تو یہ بہتر ہو کہ انگریزی لفظ ہی اختیار کرلیا جائے۔ سائنس کا ترجمہ انگریزی سے کیا جائے گا اس لیے انگریزی الفاظ سے زبان کو بچانا ناممکن ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے ۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہو تو اُسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اس سے قبل لکھی جاچکی ہیں انھیں مہیّا کرے اور جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو انھی الفاظ کے استعمال کرنے کی کوشش کرے جو ان کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں ۔ جب کسی انگریزی جُملے میں کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ ہو جس سے اہلِ ہند واقف نہ ہوں تو مترجِم کو چاہیے کہ حاشیے میں یا مناسب ہو تو متن میں اس کی مختصر طور پر تشریح کردے ۔

مترجِم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہیے ۔ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جُملے کے معنے اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہو خواہ اس کی ساخت یا طریِ ادا کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو ۔

کیمسٹری کی اصطلاحات کے متعلّق یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ تمام انگریزی اصطلاحی لفظ بجنسہٖ اُردو میں لے لینا مناسب ہوگا ۔ البتّہ جن کیمیائی عناصر کے نام اُردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے دیے جائیں ۔ لیکن مرکّبات میں انگریزی نام ہی رہیں جیسے ہائیڈروسلفرک وغیرہ ۔ چوں کہ اصطلاحی الفاظ کے مادّے تعداد میں زیادہ نہیں اس لیے اُن کی تفہیم میں کچھ زیادہ مُشکل نہ ہوگی۔

نباتیات کا ترجمہ بہت کٹھن ہو ۔ یورپی مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہوجائے گا ۔ البتّہ جو دوسرا طریقہ درختوں کے خاندانوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہو وہ زیادہ بہتر ہو اور عام طور پر مستعمل ہو، خصوصًا ایسی حالت میں جب کہ یورپ میں کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد وہی نہیں ہوتے جو ہندستان میں ہیں ۔ بہرحال یہ نہایت ضروری ہو کہ کوئی صاحب جو نباتیات کا عام علم رکھتے ہوں اور اُردو بھی خوب جانتے ہوں اس کام کو انجام دیں ——— . . . .

یہ اصول اُس زمانے کے اعتبار سے بہت مناسب اور معقول تھے ۔ یہ کالج اگر قائم رہتا تو

اُردو کی بہت بڑی خدمت کرتا اور یہی سب سے پہلی اُردو یونی ورسٹی ہوتا۔

اس کے بعد جسے کوئی ستّر سال کا عرصہ ہوتا ہو مولوی سیّد حسین بلگرامی (نواب عماد الملک مرحوم) نے ایک نہایت عالمانہ اور ناقدانہ مقالہ اس موضوع پر لکھا۔ اس مقالے کی تحریر کا باعث یہ ہوا کہ اُس زمانے میں حکومت بنگال نے دیسی زبانوں میں طبّی رسائل کی تالیف کے لیے ایک کمیٹی مقرّر کی تھی۔ کمیٹی کے دو ارکان نے اپنی تجویزیں پیش کیں۔ اُن میں سے ایک اُس وقت کے فاضل اور ماہرِ علم اللسان بابو راجندرا لال متر تھے۔ ان کی تجویز کے متعلق نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "علمی اصطلاحات پر اس سے زیادہ مبسوط بحث پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزری"۔ دُوسرے مُلک کے نامور طبیب مولوی تمیز الدین خان بہادر تھے جنھیں صوبۂ بنگال کی دونوں زبانوں میں علومِ تشریح الابدان اور طب کی تعلیم کا بہت بڑا تجربہ تھا۔ تیسری تجویز راے سوہن لال مہتمم مدارس حلقۂ بہار کی تھی جن کا کلکتہ کی کمیٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان تینوں تجویزوں پر نواب صاحب مرحوم نے بڑی غائر نظر ڈالی ہو اور مفصّل تنقید کے بعد وضعِ اصطلاحات کے متعلق اپنے اصول پیش کیے ہیں۔

بابو راجندر لال متر اصطلاحات کے ترجمہ کرنے کے زبردست حامی تھے۔ لیکن وہ ترجمہ لفظی پابندیوں میں جکڑا ہوا نہ ہو۔ جیسے مکھی پر مکھی مار دی۔ بلکہ اس ترجمے سے ایسے الفاظ پیدا ہونے چاہییں جو اشیاے متذکرہ کے لیے علامات کا کام دیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ الفاظ اشیا کا دھندلا تصوّر ظاہر کریں جو قدیم زمانے میں کسی نسل نے غلطی سے اُن کے متعلق اپنے ذہن میں قائم کیا تھا جس وجہ سے غلط الفاظ اس کی زبان میں ہمیشہ کے لیے داخل ہوگئے اور زمانۂ قدیم سے مستعمل ہونے کے باعث اب تک مروّج ہیں۔

بابو صاحب نے اپنے مقصد کے لحاظ سے جُملہ الفاظ کو چھ قِسموں میں تقسیم کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

پہلی قسم میں زبان کے وہ معمولی الفاظ ہیں جو کبھی کبھی بطور اصطلاحات استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا جائے۔

دوسری قسم کے الفاظ میں جامد اسما اور مختلف چیزوں کے نوعی نام شامل ہیں۔ جیسے یسٹ (خمیر) مالٹ (شعیرِ منقوع) وغیرہ۔ گو یہ الفاظ نہایت عام فہم ہیں لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی وجہ سے انھوں نے نیم اصطلاحی شکل اختیار کرلی ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنا لیا جائے اور بہ شرطِ ضرورت ان میں اصلاح کرلی جائے۔

تیسری قسم کے الفاظ سائنس کی اشیا کے غیر اشتقاقی نام ہیں مثلاً کونین، ٹیلیریم (دھات)، اسیلنیم (دھات)، برومن (ایک مفرد مائع) وغیرہ۔ ابتدا میں جب یہ الفاظ وضع کیے گئے تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے ان کی کوئی خاصیت ظاہر کرتے تھے لیکن ان میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنے عرصۂ دراز سے مفقود ہوگئے اور یہ الفاظ دوسرے درجے کے جامد بن گئے ہیں۔ ان الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے دیسی زبان میں لکھا جائے۔

چوتھی قسم میں نباتات و حیوانات کے مرکب علمی ناموں کا شمار ہے جو ابتدا میں اشتقاقی معنے رکھتے تھے لیکن بوجوہ چند درچند ان میں سے اکثر الفاظ کی اب یہ کیفیت نہیں رہی اور اب وہ کسی خاص نوع یا جنس کا نام ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً جونیسیا اسوکا (JONESIA ASOKA)، کوئیس بھیکٹی COIUS BHEKTI وغیرہ۔ لہٰذا گزشتہ اقسام کی طرح یہ بھی جامد اسما تصوّر کیے جاسکتے ہیں۔ ان الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے بلا تغیّر و تبدّل دیسی زبان میں لکھا جائے۔

پانچویں قسم سے اُن مفرد الفاظ کو تعلق ہے جن کے اشتقاقی معنے نہایت صاف و صریح ہوتے ہیں اور صرف اسی حدتک کارآمد ہیں جب کہ سامع پر اپنے اشتقاقی معنے بہ خوبی واضح کردیں۔ چوں کہ یہ الفاظ صرف علوم و فنون ہی میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے انھیں خالص اصطلاحی سمجھنا چاہیے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنا لیا جائے اور بہ شرطِ ضرورت اُن میں اصلاح کی جائے۔

چھٹی قسم میں وہ مرکب اصطلاحات شامل ہیں جن کا کم از کم ایک اور اکثر حالتوں میں ہر جز کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنے ضرور رکھتا ہے۔ یہی معنے اُن اصطلاحوں کی جان ہوتے ہیں۔ اور اس شو

کی نوعیت معلوم کرنے کی غرض سے جن کے لیے کوئی اصطلاح استعمال کی جاتی ہو لازمی ہو کہ سامع ہر جز کا مطلب بخوبی سمجھ لے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے اور بشرطِ ضرورت ان میں اصلاح کی جائے لیکن آلات کے نام اس سے مُستثنا ہیں، اُن کا صِرف املا ہی دیسی زبان میں لکھا جائے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ (۱) اُن تمام اصطلاحات کا جو اشیا کی صفات ظاہر کرتی ہیں بغیر استثنا ترجمہ کیا جائے یا ضروری ترمیم سے مفید مطلب بنا لیا جائے۔ لیکن اگر ہندُستانی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملیں تو مفرد اشیا کے نام یورپی زبان سے لیے جاسکتے ہیں۔

(۲) اصطلاحات کے مکمل لغات تیار کیے جائیں جن میں دیسی زبان کے مترادف الفاظ یا اُن الفاظ کا املا دیسی زبان میں درج کیا جائے جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر تمیز خاں اس بات میں تو بابو راجندر لال سے متفق ہیں کہ دیسی زبان کی اصطلاحات اگر مل سکیں تو ضرور اختیار کی جائیں۔ لیکن نئے الفاظ گھڑنے کے مؤید نہیں ہیں۔ وہ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ دیسی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملنے کی حالت میں اصطلاحات وضع کرنے کے لیے عربی و سنسکرت سے کام لینے کی بجائے وہ بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ مغربی اصطلاحات کو برقرار رکھا جائے۔ اُن کا خیال ہو کہ محض سنسکرت عربی فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اُس تصوّر سے بہتر تصوّر نہیں ہوسکتا جو اس کے انگریزی، لاطینی یا یونانی نام سُننے اور طالب علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہو کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو اور کسی دُوسری چیز کے لیے نہیں بولا جاتا۔

تیسری تجویز رائے سوہن لال منتظم نارمل اسکول پٹنہ کی طرف سے پیش ہوئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام ادق اور ثقیل اصطلاحات نکال دی جائیں اور ان کی بجائے عام لوگوں کی بول چال کے لفظ اختیار کرکے سائنس کی تعلیم میں آسانی پیدا کی جائے اور اسے عامۃ النّاس کی دست رس میں کردیا جائے۔

ان تینوں تجویزوں کے ذِکر کے بعد نواب صاحب مرحوم نے ان پر تبصرہ کیا ہو اور اُن کے عیب و صواب پر بحث کرنے کے بعد خود وضعِ اصطلاحات کے اصول قائم کیے ہیں۔

اُن کا یہ کہنا بالکل درست ہی کہ مروجہ اصطلاحات کے متعلق کوئی اختلافِ راے نہیں ہی۔ ساری بحث اُن الفاظ کے متعلق ہی جن کے مترادف معلوم نہیں۔ یہ مترادف معلوم کرنے کے لیے ہمیں یا تو

(۱) مغربی اصطلاحات کو بجنسہٖ قائم رکھ کر انھیں املا کے ایک دقت طلب طریقے کے مطابق دیسی زبانوں میں منتقل کرنا چاہیے، یا

(۲) اُس خزانۂ الفاظ کو جو عربی و فارسی میں مدفون ہی فراخ دستی اور کشادہ دلی سے صرف کرکے ان اصطلاحات کا دیسی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہیے۔ یا

(۳) بعض مغربی اصطلاحات بجنسہٖ قائم رکھنے اور بعض کا ترجمہ کرنے سے ان دونوں طریقوں کو مخلوط کردینا چاہیئے۔

پہلا طریقہ ہرگز قابلِ التفات نہیں اس لیے بالکل نظرانداز کیا جاتا ہی۔ کوئی سمجھ دار ہندستانی ایک لمحے کے لیے بھی اس سے اتفاق نہیں کرے گا اور نہ کوئی سمجھ دار یورپین اس کا مؤید ہوگا۔ اس سے ہماری زبان دوغلی ہوجائے گی۔ ہم اس بات کا بہ آسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے ہمارے آیندہ پنڈت لاطینی نما ہندستانی لکھیں گے اور ہندی نما لاطینی بولیں گے۔ اس کا تصور ہی اس قدر مضحکہ خیز اور عجیب و غریب ہی کہ ذہنیات سے اس کو عملیات میں لانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ سوال فی الحقیقت صرف یہ رہ جاتا ہی کہ آیا ہمیں مغربی علوم کی تعلیم بہ واسطۂ انگریزی دینی چاہیے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہی تو سب الفاظ کا املا دیسی حروف میں لکھنے کے طریقے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہ دینا چاہیے۔

اب رہا ترجمے کا سوال۔ اس کے متعلق وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس اصول کو ایک بدیہی صداقت سمجھ کر ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ترجمے میں ہمیشہ سادگی یکسانی اور صحت کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ اب سوال یہ ہی کہ ان تینوں شرائط کو نہایت پابندی کے ساتھ پورا کرنے کے لیے ہمارے طریقِ عمل کے اُصولِ موضوعہ کیا ہوں اور ہماری رہبری کے لیے کیا قواعد مقرر کیے جائیں۔ اس سوال کا جواب شاید یہ ہوسکتا ہی:-

(۱) مفرد اشیا کے تعبیر کرنے میں مفرد الفاظ کو مرکّب الفاظ پر ترجیح دی جائے۔

(۲) وہ مصطلحات جو اشیاے متذکرہ کی کوئی خاصیت ظاہر کرتی ہیں ان اصطلاحات پر جو کوئی خاصیت ظاہر نہیں کرتیں، مرجّح ہیں۔

(۳) اگر ہنڈستانی متعلّم کے لیے انگریزی اصطلاح اور اس کے ترجمے میں برابر کا اشکال ہو اور ایک کو دوسرے پر کچھ بھی فوقیت نہ ہو تو یک سانی کی خاطر دیسی اصطلاح کی بجائے انگریزی اصطلاح قائم رکھنی چاہیے۔

(۴) مرکّب اشیا کے تعبیر کرنے میں مرکّب اصطلاحات کو ترجیح دینی چاہیے اور یہ اصطلاحات ایسی ہوں کہ مرکّب کے اجزا پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

(۵) ایک ہی قسم کی چیزوں کو ظاہر کرنے کے لیے ایک ہی قسم کے مرکّبات و مشتقات کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔

(۶) مروّجہ اصطلاحات میں خواہ یورپی ہوں یا ایشیائی کوئی ایسی اصطلاح قائم نہیں رکھنی چاہیے جو کسی شے کی نوعیت یا خاصیت کی نسبت غلط خیال پیدا کرتی ہو"

یہ قواعد بہت کارآمد اور جامع ہیں لیکن سب سے بڑا اور مشکل مسئلہ یہ ہے کہ ان پر عمل کیوں کر ہو یعنی ان قواعد کی رو سے اصطلاحات بنائی کس طرح جائیں۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ " ممکن ہے کہ یہ قواعد ناکافی ہوں اور شاید ان میں ردّ و بدل کی ضرورت ہو لیکن ان سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر ہم ایک قلیل مدت میں اپنی زبان کے لیے وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے مغربی زبانوں کے لیے کرنے میں عمریں صرف ہوگئی ہیں تو ہمارے طریقِ عمل کی حدوٗد ہونی چاہییں۔ ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارا اصول سادگی، یک سانی اور صحت ہونا چاہیے۔ سادگی اور صحت تو شاید پیدا کی جاسکتی ہے لیکن ہنڈستانی زبانوں کی اس کثرت کی صورت میں یک سانی کیوں کر پیدا کی جائے گی؟ ہم دور کیوں جائیں خود ہمارے چھوٹے سے صوبے میں اردو اور ہندی کے جھگڑے کا کیا تصفیہ ہوگا؟ کیا ایک صوبے کے لیے ہم دو قسم کی اصطلاحات مقرر کریں؟ اس مشکل کا پورا احساس ان دونوں فضلا میں سے جن کے تبصرے اس رسالے

کی اشاعت کے محرّک ہیں کسی کو بھی نہیں ہوا۔

اس کے بعد انھوں نے عربی اور سنسکرت کی ذاتی خوبیوں سے بڑی اچھی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان دونوں زبانوں کے ادبی ذخائر ناپیدا کنار ہیں۔ خوبیٔ کلام، وضاحتِ معانی، اور خالص فلسفیانہ نکات کی چھان بین کے لیے سوائے یونانی کے دُنیا کی باقی تمام زبانوں میں یہ اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ لیکن اگر ان دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ نوعِ انسانی کی ان دو بڑی آبائی نسلوں کے دماغ، خصائل، جذبات اور تاریخ میں ہے جن کے اجتماعی، اخلاقی، ذہنی اور تمدنی تجربے کی یہ منظہر ہیں۔ خیالات کے صحیح اظہار اور تعیّن کے لیے یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں ہیں۔ لیکن سنسکرت کو عربی پر یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس میں الفاظ کے بےشمار مرکّبات و مشتقات بن سکتے ہیں۔ اور آگے پیچھے الفاظ بڑھا کر ان میں کئی طرح سے تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ . . . عربی زبان اس اعتبار سے بہت کم مایہ ہے۔ اس میں صرف ایک سابقہ "ال" اور ایک لاحقہ "ی" ہے۔ اس میں مرکّب الفاظ بنانے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ یہ اس لیے کہ اس کے مرکّبات کی صرف چار قسمیں ہیں جن میں سے دو ہمارے اغراض کے لیے محض بےکار ہیں۔ مشتقات کے لیے تو یہ قاعدۂ کلیّہ مقرر ہے کہ داخلی حروفِ علّت کو بدل دیا جائے لیکن نئے الفاظ بنانے کے لیے اس میں کوئی ایسا لچک دار قاعدہ موجود نہیں جو ہر حالت میں کام دے۔ جو مرکّب الفاظ اس زبان میں بن سکتے ہیں انھیں ہم سوائے ایک مشتبہ استثنا کے واحد کلمۂ صرفی قرار ہی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ ان مرکّبات کے اجزا کی انفرادی و ابتدائی حیثیت بدستور قائم رہتی ہے اور انھیں الگ الگ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔"

عربی زبان کے اس نقص کو بتانے کے بعد انھوں نے از روئے انصاف اس کے دُوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور کم و بیش دو صفحے میں نہایت جامعیت، قابلیت اور اختصار کے ساتھ عربوں کے اُن حیرت انگیز کارناموں اور ایجادات کا ذکر کیا ہے جو سائنس کی ترقی اور اشاعت میں اُن سے ظہور میں آئیں اور کس کس طرح نئے الفاظ وضع کیے یا دُوسری زبانوں سے مستعار لیے۔

اس تذکرے کے بعد اصل مقصد کی طرف رجوع کی ہے کہ مغربی اصطلاحات کا اُردو ہندی بنگالی

میں بہترین ترجمہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ اس بارے میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ " نئی اصطلاحیں ایک دفعہ ہندی یا بنگالی میں داخل ہونے کے بعد ان زبانوں کا جزو بن جاتی ہیں۔ اُردو اس مداخلت کی اس وقت تک متحمل نہیں ہوسکتی جب تک اس کے موجودہ نظام میں اصولی انقلاب نہ پیدا کیا جائے اور اُردوداں حضرات ہندی کی طرف زیادہ مائل نہ ہوں۔ ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ تبدیلی ہمارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔ کیوں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اُردو اور ہندی میں جتنا زیادہ اتحاد و تطابق ہوگا اُتنا ہی اُردو کو فائدہ پہنچے گا۔" لیکن مُلک کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوے وہ بہت افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ " اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے لیے یک ساں اصطلاحات وضع کرنا فی الحال ناممکن ہے۔"

عربی سے اصطلاحی الفاظ لینے کے متعلق یہ وجہ بتائی ہے " ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اکثر بڑے علوم کی ابتدا جو ترجمے کے قابل ہیں عربی میں ہوئی ہے اور جس قدر اصطلاحیں ان علوم کے مبادیات کے لیے ضروری ہیں تحقیقات سے عربی میں معلوم ہوسکتی ہیں۔ عربی ماخذ سے ہمارے علمی لغت میں بہت بڑا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ اہلِ فرنگ بھی عربوں کے علمی انہماک کا اعتراف کرتے ہوے منفعل نہیں ہوتے اور الکحل، الکیمی (کیمیا) الجرا، زینتھ (سمت) ناڈر (نظیر) الیکسر (اکسیر)، سیرپ (شربت) جولپ (جلاّب) اور اسی قسم کے متعدد الفاظ بہ کثرت استعمال کرکے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں تو ہم اس ذخیرے کی تحصیل سے فائدہ اُٹھانے میں کیوں تامّل کریں۔"

اس کے علاوہ انھوں نے ایک دوسرے ماخذ کی طرف بھی توجّہ دلائی ہے کہ تمام یونانی الاصل لفظ جو طب اور دوسرے علوم میں مستعمل ہیں اس قدر ترمیم کے ساتھ جو ہماری ضروریات کے لحاظ سے لازم ہو، اختیار کرلینے چاہییں کیوں کہ قدیم زمانے کے عربوں نے یہ الفاظ مستعار لے کر ہمارے لیے ایک مثال قائم کردی ہے۔

ان زبانوں کے علاوہ وہ فارسی سے بھی مدد لینے کے بہت بڑے حامی ہیں کیوں کہ یہ زبان ہندی اور اُردو دونوں سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے اور اس میں مرکّبات اور مشتقات بنانے کا بھی بہت اچھا قاعدہ ہے۔ فارسی الفاظ اس غرض کے لیے بہت کارآمد ہوسکتے ہیں اور وہ نامانوس بھی نہ ہوں گے۔

اصطلاح کی غرض کے لیے انھوں نے حسبِ ذیل ماخذوں سے کام لینے کی رائے دی ہے:-

(۱) سنسکرت عربی فارسی اور ان مغربی الاصل الفاظ سے جو ہماری زبان میں مروّج ہیں ۔

(۲) مصطلحات سے جو عربی کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں ۔

(۳) عربی کے مرکبات و مشتقات جو خاص قواعد کی پابندی سے وضع کیے جائیں ۔

(۴) یونانی یا لاطینی اصل کی علمی اصطلاحوں سے جن میں بہ تقلید اہلِ عرب ہماری زبان کی صوتی خصوصیات کے موافق ترمیم ہوجائے ۔

(۵) مفرد مشتق یا مرکب الفاظ سے جو فارسی سے مستعار لیے جائیں ۔

ان سب الفاظ کی مثالیں بھی دی ہیں ۔ پہلی قسم کے الفاظ کی مثالیں جو عام ہیں مثلاً فلز یا دھات (Metal) قرع انبیق (Alembic or retort) ریہ، شش یا پھیپھڑا (Lungs) مُدر (Diuretic) ۔ بُحران (Crisis) وغیرہ

دوسری قسم کے الفاظ جیسے کیمیا میں ملحیات (Saline bodies)، دُہنیات (The firedoil) تخلخل (Porosity) مائع (Fluid)، سیال (Liquid)، مُخدّرات (Palliatives) غدود (Glands) تعدیل (Equilibrium) محور (Axis) طول بلد (Longitude) عرض بلد (Latitude) وغیرہ ۔

تیسری قسم کے الفاظ جیسے تکاثف (Density) معیار (Test) علم السکون (Statics) علم الحرکت (Dynamics) حرکتِ عمودی (Vertical motion) وضع افقی (Horizontal Position) وغیرہ ۔

چوتھی قسم کے الفاظ اُن نمونوں کے مطابق اختیار کیے جا سکتے ہیں جو پہلے ہی سے موجود ہیں ۔ جیسے Cornea کے لیے قرنیہ، Diabetes کے لیے ذیابیطس ۔ Astrolabe کے لیے اصطرلاب اور اسماے معرفہ میں Euclid کو اقلیدس ۔ Isagogue کو ایساغوجی ۔ Pythagoras کو فیثاغورث ۔ اسی تقلید میں Morphia کو مرفیہ ۔ Bromine کو برومن ، Iodine کو

یو دین کہہ سکتے ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس۔

ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن الفاظ کا صحیح تلفظ ہم نے بدل دیا ہے وہ بعینہٖ اسی صورت میں اختیار یا قبول کرلیا جائے اور نہ ہم قدرت رکھتے ہیں کہ مغربی الفاظ کا املا دیسی زبان میں صحیح طور سے لکھ سکیں۔ ہم نے رواروی میں چند مثالیں پیش کردی ہیں کہ مغربی الفاظ جو مستعار لیے جائیں ہماری صوتی ضروریات کے مطابق بدل دیے جائیں تاکہ دیسی زبان کے علما کے ہاتھوں اُن کی زیادہ دُرگت نہ بنے اور جہاں تک صحتِ لفظی کا تعلق ہے اُن کی بےشمار جُداگانہ شکلیں پیدا نہ ہوں۔

پانچویں قسم کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جیسے Air Pump کے لیے بادکش۔ Water Pump کے لیے آب‌کش۔ Calyx کے لیے بیرونی برگ۔ Corolla کے لیے اندرونی برگ Anthropomorphus کے لیے آدمی پیکر۔ Genustubuloina کے لیے قرنما وغیرہ الفاظ گھڑ سکتے ہیں۔

نواب صاحب کو مولوی تمیزخان بہادر کی اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں کہ "محض سنسکرت عربی فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اُس تصوّر سے کچھ بہتر تصوّر نہیں ہوسکتا جو اس کا انگریزی لاطینی یا یونانی نام سُننے اور طالب‌علم کو یہ بتادینے سے ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لیے نہیں بولا جاتا۔" اس پر انھوں نے نہایت معقول تنقید کی ہے اور لکھا ہے "ہمیں نفسیات کا کوئی ایسا قانون معلوم نہیں جس سے ثابت ہو کہ جامد اسما اور بےمعنی مصطلحات معنی خیز اصطلاحوں یا اُن الفاظ کے مقابلے میں آسانی سے یاد رکھی جاسکتی ہیں جن کے مفہوم سے متعلّم آگاہ ہو اور جنھیں وہ سلسلۂ خیالات کی کسی زنجیر میں منسلک کرکے اپنے حافظے کے اندر محفوظ رکھتا ہو۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ایک مشرقی متعلّم کے لیے جو بہ‌واسطۂ زبان اُردو طبعیات اور طب کا اکتساب کررہا ہو ہندستانی الفاظ ذات‌الراسین یا دوسِرا اور بادکش کی نسبت بای‌سپس اور ایرپپ کا یاد رکھنا زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ اگر بہ‌کثرت اختیار کیے جائیں تو اُن پر حافظے کو اتنی محنت کرنی پڑتی ہے جتنی اُس زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔ اس

کے علاوہ غیر معمولی طور پر کام کرنے کے باعث یہ قوت ضرورت سے زیادہ نشو و نما پائے گی جس سے دوسری ذہنی قوتوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کسی علم کی تحصیل میں اُس کی اصطلاحات کا سمجھ کر مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر کوئی متعلّم اصطلاحات کے اس طویل سلسلے کو جو ان علوم میں آتا ہے مختلف اشیا کے نام تصوّر کرنے کے سوا اور کچھ نہ سمجھے اور ان کے اشتقاقی مفہوم و مطالب سے آگاہ نہ ہو تو ہمیں خوف ہے کہ ان بےشمار الفاظ کو رٹ لینے کے بعد وہ ویسا ہی کورا رہے گا جیسا پہلے تھا۔"

تیسری تجویز رائے سوہن لال کی تھی۔ اُن کی رائے یہ تھی سائنس کی اصطلاحات عوام کی بول چال کی زبان سے بنائی جائیں۔ نواب صاحب نے رائے صاحب کی علمی واقفیت اور قابلیت کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کی رائے کے سخت مخالف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہم خود اس بات کے بہت بڑے مؤید ہیں کہ اُردو عبارت میں ہندی عنصر غالب رہنا چاہیے کیوں کہ طرزِ تحریر میں وضاحت زور لچک پیدا کرنے کا یہ ایک یقینی ذریعہ ہے۔ اور لکھنوی انشا پردازوں کی ایجاد کردہ ثقیل اُردو کو جس میں عربیت اور فارسیت زیادہ ہو ناپسند کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ رائے سوہن لال کی دہقانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں اور ایسی زبان کے رواج کی مخالفت کریں جو دیہات کے گنواروں ہی کو زیب دیتی ہے اور جسے ہندو مسلمان دونوں مہذب گفتگو میں کبھی استعمال نہیں کرتے . . . . ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ بعض الفاظ کا انھوں نے نہایت مناسب اور موزوں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اس بات پر حیرت بھی ہے کہ حسبِ ذیل الفاظ کا اس قدر غلط ناموزوں سوقیانہ عامیانہ اور علمی ضرورت کے لحاظ سے محض بےکار ترجمہ کرنے کی انھوں نے کیوں کر جسارت کی؟"

جو الفاظ انھوں نے اپنی تنقید میں اس قسم کے پیش کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :۔

ملے تلے ہوئے زور	System of forces in equilibrium
کھیت	Plane
جانی ہوئی بدیا	Exact science
جچی ہوئی بدیا	Experimental science

پہچان	Definition
برابر بازو تحط	Equilateral
جانی ہوئی بات	Axiom
دوڑتا بجلی بل	Voltaic electricity
رگڑا بجلی بل	Friction electricity

یہ ہے خلاصہ اُس مقالے کا جو مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) نے اُس زمانے میں لکھا تھا جب وہ لکھنؤ کے ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ جب جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی منظوری ہوئی تو اس کی افتتاح سے پہلے اور اس کی تیاری کے لیے دارالترجمہ (سررشتۂ تالیف و ترجمہ) قائم ہوا۔ سائنس کی کتابوں کے ترجمے کے لیے اصطلاحوں کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت میری استدعا پر اس مقالے کے ضمیمے کے طور پر ہماری رہنمائی کے لیے نواب صاحب نے وضع اصطلاحاتِ علمیہ کے لیے چند اصول قلم بند فرمائے، جو یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

۱۔ اصلِ اصول وضع مصطلحات کا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظے پر بار کم ڈالا جائے۔ اس لیے ایسے مصطلحات وضع کرنا جن میں لفظاً موضوع لہٗ سے کوئی مناسبت نہیں ہے بالکل نامناسب ہے، جہاں تک ممکن ہو اس سے احتراز کیا جائے۔

۲۔ زبانِ عربی میں جتنی مصطلحات قدیم زمانے سے موجود ہیں ان کو ترک نہ کیا جائے۔ اُن کے عوض جدید مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ہیئت، ہندسہ اور اس کے فروع حساب، جبرو مقابلہ، اقلیدس، مخروطات وغیرہ یا طب، تشریح، منطق وغیرہ میں ہمارے اساتذۂ فنون نے جو مصطلحات قدیم زمانے میں وضع یا کسی دوسری زبان سے اخذ کیں وہ بحالہا قائم رہیں۔ اُن کے عوض جدید مصطلحات تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ادنا توجہ سے معلوم ہوجائے گا کہ بعض فنون کی متعدد عربی مصطلحات آج یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں، پھر ہم کیوں اپنی مصطلحات ترک کردیں۔

۳۔ جو لغات غیر زبانوں سے لے کر قدیم زمانے میں معرب کرلیے گئے ہیں یا جو دخیل ہیں وہ اپنے

حال پر قائم رہیں، اصل کی طرف رجوع کرنا ضرور نہیں۔

۴۔ جدید مصطلحات اُردو زبان کے لیے وضع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو امورِ ذیل ملحوظ رہیں۔ حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی، انگریزی کے اُنھی لغات سے مدد لی جائے جو ہماری زبان اُردو میں مروّج ہیں۔ غیر مانوس جدید لغات سے احتراز کیا جائے۔

۵۔ ثقلِ تلفظ، رکاکت، تراکیب مغلق و غیر مانوس، توالئ اضافات وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔

۶۔ امالہ، ترخیم، فکِ اضافت اور دوسرے تصرفات سے بہ وقتِ ضرورت بے تامّل کام لیا جائے۔

۷۔ اسم سے فعل بنالینا ایک قسم کا تصرّف ہی جس کی بڑی ضرورت ہی۔ اس کو جائز رکھا جائے

۸۔ عربی اور ٹھیٹھ ہندی لفظوں کی ترکیب سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے۔

۹۔ جہاں دو یا تین یا زیادہ الفاظ کو ملاکر ایک مرکّب لفظ بنانا منظور ہو جس طرح فنِ کیمیا میں اکثر ضرورت پڑے گی تو اس قدر تصرّف جائز رکھا جائے کہ ہر لفظ مفرد میں دو ایک حرف حذف کرکے مرکّب اصطلاح میں اختصار پیدا کردیا جائے۔

۱۰۔ فنِ کیمیا میں سینکڑوں نام بسیط اور مرکّب مادّوں کے مستعمل ہوں گے جن کے واسطے علامات کا مقرر ہونا ضرور ہی۔ یورپین زبانوں کی کتابت میں حروف علاحدہ علاحدہ لکھے جاتے ہیں اس لیے یورپین لوگوں کو اس میں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔ اب سوال یہ ہی کہ اُردو میں مرکّب مادّوں کے ناموں میں حروف الگ الگ لکھے جائیں یا ملاکر مثلاً کبیکج اور ک ب ی ک ج پر غور کیجیے۔ حروف کے الگ الگ لکھنے میں آسانی یہ ہی کہ ان کی مقدار کے اظہار کے لیے ہندسے لگا دیے جاسکتے ہیں۔ ملاکر لکھے جائیں تو ہندسے لگانا مشکل ہوجائے گا گو حروف کے علاحدہ علاحدہ لکھے جانے میں طوالت بے شک ہی۔"

نواب عمادالملک نے اس مقالے کے لکھنے میں بڑی وسعت و دقتِ نظر سے کام لیا ہی اور موضوع کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہی۔ اس موضوع پر اس سے پہلے ایسا جامع رسالہ نہیں لکھا گیا تھا۔ اُن اصحاب کے لیے جو علمی کتابیں ترجمے کرنے یا تالیف کرنے کا ذوق رکھتے ہیں، یہ اب بھی

رہنمائی کا کام دے سکتا ہے۔

اِس ضمن میں بعض اُن اداروں کا ذِکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے اگرچہ علمی اصطلاحات کے متعلق کوئی اصول قائم نہیں کیے لیکن علمی اور ادَبی کتابیں ترجمہ یا تالیف کراکر شائع کیں۔ ان میں سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ خاص طور پر قابلِ ذِکر ہے۔ یہ سوسائٹی (سر) سید احمد خاں نے سنہ ۱۸۶۴ء میں قائم کی جسے اس وقت تقریبًا اسّی سال ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ علمی اور ادَبی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کراکر مغربی ادب اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے۔ اگرچہ سوسائٹی نے اصطلاحی الفاظ کے لیے کوئی اصول نہیں بنائے تھے لیکن اس نے مختلف علوم مثلًا علمِ طبعیات، فلاحت، ریاضیات، معاشیات وغیرہ پر جو کتابیں شائع کیں، ان میں بہت سی انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا۔ اسی طرح انجمنِ پنجاب اور اورینٹل کالج لاہور نے بھی علمی کتابیں شائع کرکے بہت مفید کام کیا۔

علاوہ اداروں کے بعض اہلِ علم نے انفرادی طور پر قابلِ قدر کام کیا۔ ان میں امیرِ کبیر نواب شمس الامرا محمد فخرالدین خان بہادر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی سرپرستی اور نگرانی میں سائنس کی مختلف شاخوں پر چھے رسالے شائع ہوئے۔ چوں کہ یہ چھے علوم پر مشتمل تھے اس لیے اس سلسلے کا نام ستۂ شمسیہ رکھا گیا۔ یہ رسالے ریورنڈ چارلس کی تالیف تھے جو سنہ ۱۸۱۸ء میں لندن میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا ترجمہ انگریزی سے میر امان علی دہلوی غلام محی الدّین حیدرآبادی اور مسٹر جونس اور موسیو تندوسی نے کیا۔ یہ رسالے علمِ جرِثقیل، علمِ ہیئت، علمِ آب، علمِ ہوا، علمِ انظار اور علمِ برق و مقناطیس پر ہیں۔ اصل انگریزی رسالے مبتدیوں کے لیے سوال و جواب کی صورت میں لکھے گئے تھے، ترجمے میں بھی اسی صورت کو برقرار رکھا ہے۔ زبان صاف ہے۔ اصطلاحات کے لیے عربی فارسی کے مروجہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور جہاں کہیں عربی فارسی لفظ نہیں ملے تو اصل انگریزی لفظ اختیار کر لیے گئے ہیں۔ یہ رسالے سنہ ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء و سنہ ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئے۔ ان رسالوں کے آخر میں حوالے کے ساتھ نقشے اور اشکال بھی دی ہیں تاکہ مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ تقریبًا وہی زمانہ ہے جب کہ دہلی کالج میں جدید علوم کی تعلیم اُردو کے ذریعے سے دی جا رہی تھی۔ وہاں کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

کے لیے جو چندہ جمع کیا گیا تھا، اس کی فہرست میں امیرِ کبیر نواب شمس الامرا بہادر کا نام بھی درج ہے اور ان کے نام کے سامنے ۱۴۳ آنے — ۸۰۲ روپے لکھے ہیں۔ نواب صاحب کے فرزند نواب عمدۃ الدولہ محمد رفیع الدین خاں بہادر نے جو اپنے فاضل باپ کی طرح علم و فن کا ذوق رکھتے تھے، ایک کتاب فارسی زبان میں رفیع البصر کے نام سے لکھی۔ یہ علمِ مناظر پر مبسوط کتاب تھی۔ اس کا خلاصہ نواب صاحب کے قدیم ملازم رتن لعل ولد چنیا لعل نے منتخب البصر کے نام سے اُردو میں کیا جو ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس میں بھی سوال و جواب کا ڈھنگ رکھا ہے اور متعدد نقشے اور شکلیں کتاب کے بیچ میں اور آخر میں دی ہیں۔ یہ کتابیں اُس زمانے میں مبتدیوں اور عام شائقین کے لیے بہت مفید تھیں۔ ان میں بہت سی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جن میں سے کچھ اب بھی کار آمد ہو سکتی ہیں۔

اُسی زمانے میں لکھنؤ کی رصدگاہ کے ایک معتمر کارکن مولوی کمال الدین نے رصدگاہ کے ناظم کرنل ولکاک کی نگرانی میں کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا جو قوائے آلیہ، ہیئت، علم الہوا، علم المناظر، حرارت، طبعیات، آلاتِ ریاضی، قوتِ مقناطیسی، کیمیا وغیرہ پر تھے۔ یہ رسالے بہت مختصر تھے۔ اِس زمانے میں زیادہ کار آمد نہیں ہو سکتے۔ اب یہ نایاب ہیں ورنہ ان میں بھی بعض کام کی اصطلاحیں مل سکتی تھیں۔

بہت دن ہوئے ڈاکٹر محمد شائق نے کیمیا پر ایک کتاب لکھی تھی اور بڑی محنت اور قابلیت سے کیمیائی اصطلاحات کے وضع کرنے کے خاص اصول قائم کیے تھے اور اُن اصول کے مطابق کیمیاوی اصطلاحیں بنائی تھیں۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں انگریزی کیمیاوی اصطلاحات کے لاحقوں اور سابقوں کے مطابق اُردو میں سابقے اور لاحقے معیّن کرکے اصطلاحات بنانے کا ڈھنگ ڈالا تھا۔ دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ کے سابق رکن چودھری برکت علی مرحوم نے بھی اسی ڈھنگ پر اپنے قاعدے معیّن کیے تھے۔

اس موقع پر میں مولانا کرامت حسین مرحوم کا ذکر بھی مناسب خیال کرتا ہوں وہ علومِ عربیہ کے جیّد عالم تھے اور ان کا دماغ حکیمانہ واقع ہوا تھا فلسفہ وغیرہ سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ بہت سی اصطلاحیں جو آج کل ہمارے ادب میں عام طور پر مروّج ہیں اُنھی کی وضع کی ہوئی یا دی ہوئی ہیں جو ان کی تحریروں اور کتابوں میں استعمال ہوئی تھیں۔

تقریباً پچیس برس کا عرصہ ہوا کہ میری درخواست پر مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ایک مضمون وضع اصطلاحاتِ علمیہ پر لکھا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اقوامِ عالم کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر نہایت مدلل طریقے سے یہ ثابت کیا تھا کہ جن قوموں نے غیروں کی زبان سیکھی اور اس کے ذریعے سے تحصیلِ علم کی کوشش کی وہ ہمیشہ زوال پذیر ہوئیں۔ کوئی قوم حقیقی علم اور آزادی حاصل نہیں کرسکتی جب تک وہ اپنی زبان کو ترقی نہ دے گی اور اس کے واسطے سے علم حاصل نہ کرے گی۔ اس کے بعد جدید و قدیم علوم، نصابِ تعلیم اور ترجمے کی اہمیت پر بحث کی ہے جو بہت دل چسپ ہے۔ آخر میں وضعِ اصطلاحات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مصطلحاتِ علمیہ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ان کے انتخاب یا وضع کرنے والے ماہرین ہونے چاہییں یعنی جس علم و فن کی مصطلحات مطلوب ہوں اُن کو اُسی علم یا فن کے ماہرین بنائیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ہمارے اکثر انگریزی یونی ورسٹیوں کے ہندستانی پروفیسر جو علومِ جدیدہ کی تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان میں مصطلحات سے بہت کم واقف ہیں بلکہ خود انگریزی زبان میں بھی علم اللسان کے نقطۂ نظر سے یونانی اور لاطینی مصطلحات کے معنے نہیں جانتے۔" اُن کی رائے میں "اُردو زبان کی اس خدمت کے لیے ایک ایسی جماعت کے تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، یونانی لاطینی انگریزی، فرنچ اور جرمن کے جاننے والے موجود ہوں۔"

ان کا خیال یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی تقلید میں یورپی زبانوں یا انگریزی زبان کی اصطلاحات کو بجنسہٖ اپنی زبان میں نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ جس قدر اصطلاحات ہمیں اپنی قدیم اُردو فارسی عربی زبانوں کی کتابوں میں مل سکتی ہیں تلاش کرکے لیں اور جن اصطلاحات کے لیے لفظ نہ ملیں، ان کو خود بنانا چاہیے اور اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ انگریزی یا جس یورپی زبان کا لفظ ہو اُس کے اجزا کی تحلیل کرلی جائے، پھر اس لاطینی یا یونانی وغیرہ مادے کے لحاظ سے اس کا ترجمہ کرلیا جائے جیسے Phono = آواز، Graph = نگار فونوگراف کے لیے آوازنگار اسی طرح ٹیلی فون کے لیے دوُرگو۔ آٹوموبیل کے لیے خودرواں وغیرہ۔

ان کی رائے میں جس طرح انگریزی لاطینی یا یونانی مصطلحات کا اختیار کرنا غلط ہے عربی مصطلحات کا اختیار کرنا بھی درست نہیں۔ عربی مصطلحات کے اختیار کرنے سے وہی قباحت جو انگریزوں کو لاطینی

مصطلحات کی وجہ سے عارض ہی باقی رہتی ہی اور وہ آسانی جو جرمنوں کو جرمن مصطلحات سے حاصل ہی پیدا نہیں ہوتی۔

ہندی الفاظ اور مصطلحات اختیار کرنے میں یہ دقت ہی کہ لطافتِ زبان بالکل جاتی رہتی ہی۔ مثلاً ایک منطق کے رسالے میں (Contrary(نقص اجمالی) اور Contradictory(نقصِ تفصیلی) کا ترجمہ آدھا توڑ اور پورا توڑ کیا گیا ہی۔ ڈاکٹر بجنوری کی رائے میں فارسی زبان کو اس بارے میں عربی اور ہندی زبانوں پر زیادہ ترجیح ہی۔ افراط تفریط سے بچنے کے لیے سب سے اوّل جہاں فارسی مصطلحات موزوں بن سکیں اُن کو سب پر ترجیح دینی چاہیے۔ مثلاً کثیرۃ الرجل کے لیے کثیرپا، مستقیم الاجنحہ کی بجاے راست پر زیادہ موزوں اور عام فہم ہیں۔

آخر میں مَیں ایک ایسے صاحبِ فکر شخص کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے اس موضوع پر سب سے زیادہ محققانہ کام کیا۔ اس کی حیثیت اس بارے میں مجتہدانہ ہی۔ مولوی وحیدالدین سلیم عربی فارسی کے جیّد عالم اور اُردو کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی نظر وسیع، ذوق سلیم اور طبع جدّت پسند تھی۔ وہ الفاظ کی حقیقت، اُن کے اشتقاق و ترکیب اور نشیب و فراز اور ان کی وصل و فصل کی اہلیت سے کامل طور پر واقف تھے۔ یہ ان کا عمر بھر کا مشغلہ تھا۔ وقتاً فوقتاً کئی اخبار اُن کی زیرِادارت رہے، ان میں وہ نئے نئے خیالات اور اسما کے لیے نئے الفاظ گھڑ گھڑ کر استعمال کرتے رہے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ زبان میں رائج ہوگئے۔ مَیں اُن کے اس لسانی ذوق سے واقف تھا، اس لیے جب دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا کام شروع ہوا اور اصطلاح سازی کی دُشواری پیش آئی تو میری تحریک پر مولوی صاحب نے وضعِ اصطلاحات پر ایک مستقل کتاب تالیف کی جو انجمنِ ترقیٔ اُردو کے سلسلۂ مطبوعات میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہماری زبان کے ادب میں خاص اور منفرد حیثیت رکھتی ہی اس سے قبل ہماری کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی جامع اور انقلاب انگیز کتاب نہیں لکھی گئی۔ اور اصطلاح سازی اور الفاظ سازی کے جو اصول و قواعد اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ اس نہج و ترتیب سے کبھی تحریر میں نہیں آئے تھے۔

ابتدا میں مولوی صاحب نے اصطلاح کی ضرورت، اصطلاح سازی کے دو مختلف نظریے اور اُن کے حامیوں کے دلائل وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد اس امر پر بحث کی ہو کہ اُردو کا زبانوں کے کس خاندان سے تعلق ہو۔ پھر اس خاندان کی زبانوں میں الفاظ سازی کے مشترک اصول بیان کیے ہیں۔ اِس تفصیلی بحث کے بعد جس میں اُردو زبان کی قدرتی بناوٹ کا خاکہ کھینچا ہو وضع اصطلاحات کی اصلی بحث شروع کی ہو۔ چناں چہ اوّل مفردِ اصطلاحیں وضع کرنے کے اُصول بتائے گئے ہیں، پھر عملی طور پر اس قسم کی اصطلاحیں وضع کرنے کے طریقے درج کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں اور طریقوں کے بیان کرنے کے بعد ایک نہایت اہم اور دِل چسپ بحث اس باب میں یہ کی گئی ہو کہ ہماری زبان میں ترکیبِ الفاظ کے کون کون سے طریقے پائے جاتے ہیں۔ اس بحث میں مرکب الفاظ کا جو بیش قدر ذخیرہ درج کیا گیا ہو وہ الفاظ اور اصطلاحات کے بنانے کے لیے نہایت کارآمد ہو۔ غرض کہ اوّل سابقوں اور لاحقوں کے ذکر ہیں، پھر نیم سابقوں اور لاحقوں کے بیان میں مفرد اور مرکب الفاظ کا ایک ایسا اچھا سرمایہ جمع کر دیا ہو جو کہیں ایک جگہ نہیں ملے گا۔ ترکیبِ الفاظ کے طریقے مندرج کرنے کے بعد مرکب اصطلاحیں وضع کرنے کے اصول بیان کیے ہیں۔ آخر میں ایک ذیل ہو جس میں مرکب اصطلاحات کے بعض اُصول کا استعمال مثالیں دے کر بتایا ہو۔ بڑی خوبی یہ ہو کہ جس قدر الفاظ اور اصطلاحیں انھوں نے بنائی ہیں وہ انھی قواعد کے مطابق ہیں جو پہلے سے ہماری زبان کے الفاظ میں پائے جاتے ہیں۔

ہر شخص کے لیے جو نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ اور نئے علوم کے لیے نئی اصطلاحات بنانا چاہتا ہو اس کا پڑھنا ناگزیر ہو۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں کس قدر وسعت، گنجایش اور لچک موجود ہو۔ مولانا مرحوم نے اس تین سو صفحے کی کتاب میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ چوں کہ کتاب چھپ چکی ہو اور بہ آسانی ملتی ہو اس لیے مَیں اس کی خصوصیات کے متعلق زیادہ تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا۔

اب وہ وقت آیا جب جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی منظوری ہوئی۔ جب کبھی اُردو یا دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ پیش ہوا تو یہ عذر کیا جاتا کہ جدید علوم کی تعلیم کے لیے کتابیں کہاں سے آئیں گی۔ اسی دشواری

کا سامنا اب بھی تھا۔ اس لیے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا کہ دو سال کے اندر انٹرمیڈیٹ کی ضروری کتابیں تیار کرکے جامعہ کا افتتاح کر دیا جائے۔ ان کتابوں اور خاص کر سائنس کی کتابوں کے لیے وہی پُرانی بحث اصطلاحات کی پیش آئی۔ اس مسئلے پر بہت بحث رہی۔ اس میں دو گروہ ہوگئے۔ ایک جماعت کا خیال تھا کہ انگریزی اصطلاحات بجنسہٖ اُردو میں اختیار کرلی جائیں، دوسری جماعت کی یہ رائے تھی کہ ہمیں خود اصطلاحات بنانی چاہییں۔ آخر کثرتِ رائے سے یہ طے پایا کہ ہمیں اُردو میں خود اپنی اصطلاحات وضع کرنی چاہییں۔ اُردو میں انگریزی کی تمام علمی اصطلاحات داخل کرنے سے جو خرابیاں واقع ہوتیں ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ خصوصاً نواب عماد الملک نے اس پر بہت مدلّل اور معقول بحث کی ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ہماری زبان عجیب قسم کا ملغوبا ہوجاتی اور اس کی ساری لطافت اور حُسن خاک میں مل جاتا۔ اس غرض سے وضع اصطلاحات کے لیے ایک مجلس بنائی گئی جس میں ماہرینِ فن اور ماہرینِ زبان دونوں شریک تھے۔

تقریبًا اسی زمانے میں انجمنِ ترقیٔ اُردو نے بھی یہ کام شروع کیا تھا چوں کہ دارالترجمے کا ناظم اور انجمن کا سکریٹری ایک ہی شخص تھا اس لیے باہمی اتحاد سے یہ کام بحُسن و خوبی انجام پایا اور سب سے اوّل انجمن نے فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ شائع کی۔ اس میں ہیئت اور نباتیات کی اصطلاحیں تو انجمن نے تیار کرائیں اور باقی علوم کی وہ تھیں جو دارالترجمے میں وضع کی گئی تھیں۔ چوں کہ یہ ابتدائی زمانہ تھا اور اُس وقت صرف انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے لیے کتابیں تیار کی جارہی تھیں اس لیے یہ اصطلاحات مکمل نہ تھیں۔ تاہم یہ پہلی کوشش تھی اور مستحسن کوشش تھی۔ ان اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ہم نے یہ اُصول قرار دیے تھے۔

۱۔ اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ماہرانِ زبان اور ماہرانِ فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے۔ اصطلاحات کے بنانے میں دونوں پہلوؤں کا خیال رکھنا لازم ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے سانچے میں بھی ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے بھی ناموزوں نہ ہو۔

۲۔ اصطلاحات بنانے کے لیے عربی فارسی ہندی میں سے کسی زبان کا بھی ایسا مادّہ لے سکتے ہیں جو سہل ہو یعنی جو مروّج اور موزوں ہو۔ الفاظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن ان الفاظ سے اشتقاق

یا ترکیب کے ذریعے جو الفاظ بنائے جائیں گے وہ اُردوٗ صَرف و نحو کے بہ موجب ہوں گے۔ یعنی لفظ دوٗسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن اس کے نحوی قاعدے نہیں لے سکتے۔

۳۔ حتی الامکان مختصر لفظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کرسکیں۔

۴۔ جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیر زبانوں کے اسماسے مصادر بنائے جاتے تھے (مثلاً بدلنا، قبولنا، بخشنا وغیرہ) اسی طرح اب بھی حسبِ ضرورت اسماسے افعال بنا لیے جائیں۔

۵۔ ترکیب میں انھی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جو اب تک ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ مثلاً ہندی لفظ کے ساتھ عربی فارسی کا جوڑ اور عربی فارسی سابقوں اور خصوصاً لاحقوں کا میل ہندی الفاظ کے ساتھ۔ مثلاً دھڑے بندی، اُگال دان بےکل وغیرہ۔ یا عربی قاعدے سے فارسی ہندی الفاظ کے اسمِ کیفیت جیسے رنگت، نزاکت کے طرز پر مزاجیت، ہردلیسیت وغیرہ۔

۶۔ ہماری زبان کی ایسی اصطلاحیں جو قدیم سے رائج ہیں اور اب بھی اُسی طرح کارآمد ہیں انھیں برقرار رکھا جائے۔ البتہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں اور رائج ہوگئی ہیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کی رُو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے انھیں ترک کرکے ان کی بجائے دوٗسرے مناسب لفظ وضع کرلیے جائیں۔

۷۔ ایسے انگریزی اصطلاحی لفظ جو عام طور پر رائج ہوگئے ہیں یا ایسے لفظ جن کے اشتقاق مشکوک ہیں یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں انھیں بہ دستور رہنے دیا جائے۔

۸۔ بعض انگریزی اصطلاحیں جو پہلے زمانے میں اُس وقت کی معلومات کی رُو سے تجویز کی گئی تھیں اور حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں اُن کی بجائے ایسے لفظ تجویز کیے جائیں جو جدید تحقیق کی رُو سے صحیح مفہوم ادا کرسکیں۔ اس میں انگریزی الفاظ کی تقلید نہ کی جائے۔

تقریباً چار سال ہوتے ہیں کہ یہ مسئلہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن میں آیا۔ باعث اس کا یہ ہوا کہ کچھ عرصے سے حکومتِ بمبئی کے سامنے مقامی زبانوں میں سائنس کی اصطلاحات کا مسئلہ پیش تھا۔ اس لیے حکومت نے مسٹر بی۔ این سیل ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ بمبئی سے خواہش کی کہ

وہ اس مسئلے پر ایک یادداشت پیش کریں۔ چوں کہ یہ کُل ہند مسئلہ تھا اس لیے حکومتِ بمبئی نے یہ یادداشت سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کو بھیج دی کہ وہ ایسی مشترک اصطلاحات کا تعین کرے جو تمام ہندستان کے لیے قابلِ قبول ہو۔

مسٹر سیل کے نوٹ کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ سارے ہندستان کے لیے سائنس کی مشترک اصطلاحات مقرر کی جائیں۔

۲۔ ان اصطلاحات کا مشترک اور بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات ہوں جو بجنسہ اختیار کرلی جائیں۔

۳۔ ان اصطلاحات کے لیے ہر ہندستانی زبان میں تین خاص درجے ہونے چاہییں:

(ا) بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات کا ہو جو عملاً سارے ہندستان کے لیے مشترک ہوگا۔

(ب) ہر ہندستانی زبان میں ایک بہت تھوڑی تعداد اُسی زبان کے ایسے الفاظ کی ہوگی جو اُس زبان سے مختص ہوں گے۔

(ج) سنسکرتی یا دراوڑی زبانوں کے لیے سنسکرت کی اصطلاحیں اختیار یا وضع کرلی جائیں اور پرسوعربک (فارسی عربی) زبانوں یعنی اُردو پشتو سندھی کے لیے عربی فارسی کی اصطلاحیں۔ لیکن یہ اصطلاحیں تعداد میں بہت تھوڑی ہوں گی۔

جب کبھی اُردو اور ہندی کے میل سے ہندستانی زبان وجود میں آئے اور وہ کُل ہند مشترک زبان مان لی جائے اور مروّج ہوجائے تو پھر بؔ اور جؔ کے حصّے ایک ہوجائیں گے۔ مسٹر سیل کی رائے ہے کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کو ایک مستقل مجلس اس غرض کے لیے بنانی چاہیے۔ ان کی یہ قطعی رائے ہے کہ ہمیں بلا تامّل تقریبًا تمام انگریزی اصطلاحات اپنی زبانوں میں اختیار کرلینی چاہییں۔ اور جس وقت اصطلاحیں مقرر ہوجائیں تو تمام نصابی کتابوں میں حکمًا وہی استعمال کی جائیں۔

اس غرض کے لیے ایڈوائزری بورڈ نے ایک کمیٹی بنائی جس کا اجلاس ۱۵ اور ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء کو سر اکبر حیدری مرحوم کی صدارت میں حیدرآباد میں ہوا۔ اس میں بعض صوبوں کے ڈائرکٹر تعلیمات، بعض یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر اور کچھ سائنس دان شریک تھے۔ مَیں نے اس کمیٹی میں ایک یادداشت

پیش کی جس میں یہ بیان کیا کہ سوائے حقیقی بین اقوامی اصطلاحات کے باقی اصطلاحات کا ترجمہ کیا جائے اور حسبِ ضرورت وضع کی جائیں۔ زبان کے لحاظ سے ان اصطلاحات کی دو قسمیں ہوں گی۔ایک آریائی زبانوں کے لیے جن کی اصطلاحیں ہندُستانی یعنی اُردو میں بنائی جائیں۔ دُوسری دراوڑی زبانوں کے لیے جو وہ آپس میں حل کر بنالیں۔یہ راے کمیٹی نے تسلیم کرلی۔جیساکہ اس کی رویداد سے جو ذیل میں درج کی جاتی ہی، معلوم ہوگا۔کمیٹی دو روز کے غور اور بحث کے بعد اِن نتائج پر پہنچی ؛۔

۱۔ بین قومی اصطلاحات (انگریزی الفاظ کی صورت میں) تمام ہنُدستان کے لیے استعمال کی جائیں گی۔

۲۔ عام تعلیم کی خاطر ہر ہنُدستانی زبان کی مخصوص اصطلاحات کا بہ وجہ معروف اور مروّج ہونے کے قائم رکھنا لازم ہوگا۔ لیکن تعلیم کے اعلا درجوں میں ع۱ و ع۲ کی اصطلاحوں کی بجاے وہ اصطلاحیں اختیار کی جائیں جن کا ذِکر ع۳ میں ہی۔

۳۔کل ہند بنیاد پر اصطلاحات میں یک سانی پیدا کرنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ایک سنٹرل بورڈ آف ریفرنس مع ذیلی کمیٹیوں کے ایسا قائم کیا جائے جس کے فیصلے ان مسائل کے متعلق صوبائی حکومتوں اور دُوسرے علاقوں میں قبول کیے جائیں۔

۴۔ اس خیال کی بنا پر کہ ہندُستانی زبانیں دو بڑی قسموں لیعنے (۱) ہنُدستانی اور (۲) دراوڑی میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، ہر قسم کے لیے بورڈ مقرر کیے جائیں تاکہ وہ ہر تقسیم کی زبانوں کے لیے مشترک اصطلاحات تیار کرے۔

۵۔یک سانی کی خاطر اُردو میں ریاضی کے سوالات اور مسئلے بائیں سے دائیں جانب کو لکھے جائیں۔

۶۔یک سانی کی مدِنظر نیز منظور شدہ اصطلاحات کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لیے اُن افسروں کو جو نصاب کی کتابوں کے منظور کرنے کے ذمّے دار ہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اُن کتابوں میں صرف وہی اصطلاحات استعمال کی جائیں جو منظور کی گئی ہیں۔

اس کے بعد ۱۲ر جنوری ۱۹۴۱ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کا اجلاس مدراس میں ہوا۔ اور کمیٹی

کے مذکورہ بالا فیصلے پیش کیے گئے۔ بورڈ نے کمیٹی کی سفارشوں کو مندرجۂ ذیل ترمیم کے ساتھ منظور کیا

۱۔ کمیٹی کی سفارش ع۲ خارج کردی جائے۔ کیوں کہ ع۳ کے ذریعے اس کی تکمیل ہوسکتی ہی۔

۲۔ ہندُستانی زبانوں کو ہندُستانی اور دراوڑی میں تقسیم کرنے کے بجائے انھیں سنسکرت اور پرسو عربک (فارسی عربی) میں تقسیم کیا جائے۔

۳۔ سفارش ع۵ میں ریاضی کے سوالات اور مسئلوں کی بجائے ریاضی کے عمل اور ضابطے لکھے جائیں۔

۱۵ر جنوری ۱۹۴۲ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کا ایک اور اجلاس ہُوا اور اس میں تمام صوبائی حکومتوں اور علاقوں اور ہندُستان کی یونی ورسٹیوں کی آراے دربارۂ اصطلاحاتِ سائنس پر غور کیا گیا۔ بورڈ نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ ان سب نے رپوٹ کی سفارشوں سے عام طور پر اتفاق ظاہر کیا ہی البتہ زبانوں کی تقسیم کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہی۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک سنٹرل بورڈ آف ریفرنس مقرر کیا جائے۔ اس بورڈ کو اختیار دیا جائے کہ وہ حسبِ ضرورت ماہرین کی ذیلی کمیٹیاں مقرر کرے۔ اور امید ظاہر کی گئی کہ ان کی رہ نمائی عام اصولوں کے متعلق اور ان کے فیصلے اُن مسائل پر جو ان کی رائے کے لیے پیش کیے جائیں گے، عام طور پر مقبول ہوں گے۔

نیز یہ طے پایا کہ ہندُستانی زبانوں کی تقسیم کے مسئلے سے متعلق تمام امور کا فیصلہ (جہاں تک کہ ان کا تعلق سائنس کی اصطلاحات سے ہی) بورڈ آف ریفرنس کے اختیار میں ہوگا۔ یہ بھی طے پایا کہ ریفرنس بورڈ ایک صدر (جو لازمًا سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کا ممبر ہوگا)، دو سائنس دانوں اور دو ماہرینِ السنہ پر مشتمل ہوگا۔

بورڈ کے فیصلوں میں دو امور قابلِ غور ہیں۔ ایک بینِ قومی اصطلاحات، دوسرا ہندُستان کی زبانوں کی تقسیم۔ بینِ قومی لفظ مبہم ہی۔ جب تک ماہرینِ سائنس (جن میں کچھ ایسے بھی ہوں جو انگریزی کے علاوہ دوسرے ممالک کی زبانوں اور وہاں کی سائنسی ترقی وحالات سے واقف ہوں) مل کر یہ فیصلہ نہ کریں کہ حقیقی طور پر بینِ قومی اصطلاحات کون کون سی ہیں اُس وقت تک یہ امر غور طلب اور غیر منفصل رہے گا۔ نیز جن ممالک نے (خواہ وہ یورپی ہوں یا ایشیائی) سائنس میں معقول ترقی کی ہی اُن کے متعلق کافی

معلومات مہیا کرنی پڑیں گی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ انھوں نے سائنس کی اصطلاحات کے متعلق کیا رویّہ اختیار کیا ہے اور وہ کن اصطلاحات کو بینِ قومی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ کثرت سے انگریزی اصطلاحات بینِ قومی نام سے ہماری زبانوں میں داخل ہوجائیں گی جو کسی حال میں دُرست نہیں۔

زبانوں کی تقسیم جس کی سفارش بورڈ نے اپنے فیصلے میں کی ہے اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ ہمارے مُلک میں کوئی زبان پرسو عربک نہیں۔ پرسو عربک سے بورڈ کی مُراد اُردو، سندھی اور پشتو ہے۔ اُردو زبان کی ساخت اور اس کی صرف و نحو بالکل ہندی ہے۔ الفاظ میں بھی کثرت تعداد ہندی لفظوں کی ہے۔ یہی حال سندھی اور پشتو کا ہے۔ عربی فارسی الفاظ کے آجانے سے کوئی زبان عربی یا فارسی نہیں ہوسکتی۔ باقی زبانوں کو سنسکرتی خیال کیا گیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ اس تقسیم سے بورڈ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو سندھی پشتو کی اصطلاحات عربی فارسی سے اور باقی زبانوں کی سنسکرت سے بنائی جائیں۔ اس سے ہمارا مقصد فوت ہوجاتا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اصطلاحیں سلیس اور عام فہم ہوں۔ اگر سنسکرت اور عربی سے اصطلاحیں بنائی گئیں تو وہ ہمارے طالب علموں کے لیے ایسی ہی مُشکل ہوں گی جیسی انگریزی اصطلاحیں جو زیادہ تر لاطینی اور یونانی مادّوں سے بنائی گئی ہیں۔ چوں کہ اس کا فیصلہ ریفرنس بورڈ پر چھوڑ دیا گیا ہے لہٰذا ہم اس پر اس وقت مفصّل بحث نہیں کرنا چاہتے۔

ابتدائے قیام دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے مجلسِ وضع اصطلاحات برابر کام کررہی ہے اور بصرفِ کثیر ہزارہا اصطلاحاتِ علوم و فنون بنائی جاچکی ہیں۔ سوا ایک مختصر فرہنگ اصطلاحات کے جو ابتدا میں شائع ہوئی تھی وہ سارا انبار یوں ہی پڑا ہے۔ شدید ضرورت ہے کہ یہ تمام اصطلاحیں نظرِ ثانی اور اصلاح کے بعد شائع کی جائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اگر یہی غفلت رہی تو ایک مدّت گزر جانے کے بعد یہ ساری محنت اکارت جائے گی۔

ایک مدّت تک ان اصطلاحوں کی اشاعت کا انتظار رہا۔ انتظار کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب اُس طرف سے مایوسی ہوئی تو آخر انجمنِ ترقیِ اُردو ہند نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور جامعۂ عثمانیہ کے بعض مستعد اور فاضل پروفیسروں کی مدد اور مشورے سے جہاں تک ممکن ہوا اس کام کو انجام دیا۔ چناں چہ کیمیا، طبعیات،

معاشیات، عمرانیات، تاریخ و سیاسیات کی اصطلاحیں شائع ہوچکی ہیں اور بعض دیگر علوم کی زیرِ ترتیب ہیں انجمن نے علاوہ اِن علمی اصطلاحات کے پیشہ وروں کی اصطلاحات کی لغات سات جلدوں میں شائع کی ہو جو اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہو۔ اس زمانے میں جب کہ حرفت و صنعت پر خاص توجہ کی جارہی ہو یہ لغات بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ اس طرح ہماری زبان کی ہزارہا خوب صورت، موزوں اور سبک اصطلاحیں فنا ہونے سے بچ گئیں۔

اصطلاحات کے معاملے میں ایک غلطی یہ ہوئی کہ جب کبھی اور جہاں کہیں یہ کام شروع ہوا، ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی۔ پچھلوں کے کام پر نظر نہ ڈالی۔ ضرورت اس بات کی تھی اور اب بھی ہو کہ جو اصطلاحی الفاظ ہماری قدیم کتابوں میں آئے ہیں وہ تلاش کرکے جمع کیے جائیں نیز گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس میں مختلف اداروں اور اشخاص نے جوکچھ کیا جو اُسے بہ نظرِ غور دیکھا جائے اور ان میں جتنے موزوں اور کام کے لفظ مِلیں انھیں اختیار کیا جائے۔ اکثر ایسا ہوا ہو کہ ایک لفظ جو پہلے سے مروّج تھا اس پر نظر نہیں پڑی اور نیا لفظ بنا لیا گیا جو پہلے کے مقابلے میں بھدّا اور ناموزوں تھا۔ یا مثلاً معاشیات میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کا تعلق تجارت سے ہو یا بازاروں منڈیوں اور ساہوکارے میں بولے جاتے ہیں اُن سے واقف نہ ہونے سے نئے لفظ بنا لیے جاتے ہیں جو مقبول نہیں ہوسکتے۔ انجمن یہ تمام سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کررہی ہو اور اس سے کام بھی لے رہی ہو۔

انگریزی زبان سے الفاظ مستعار لینے، قدیم الفاظ کے اختیار کرنے اور نئی اصطلاحات وضع کرنے کے اصول اور طریقے جو بیان کیے گئے ہیں اب مُسلّم ہوچکے ہیں۔ ماہرینِ فن اور ماہرینِ زبان کے اجتماع سے انجمنِ ترقیِ اُردو اور دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں کافی تجربہ ہوچکا ہو۔ لہٰذا اس تجربے کی بنا پر اور زیادہ تحقیق اور وسعتِ نظر سے کام لے کر جہاں تک جلد ممکن ہو اس کی تکمیل کی جائے۔ کیوں کہ علمی کتابوں کے پڑھنے اور لکھنے کا شوق روز بروز بڑھتا جاتا ہو اور اسی مناسبت سے مترجمین و مولفین کی ضرورتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ چناں چہ ہر مہینے انجمن کے سکریٹری کے نام

ایسے خطوط وصول ہوتے ہیں جن میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے مترادف دریافت کیے جاتے ہیں۔ جہاں تک ہوسکتا ہی ان کی تعمیل کی جاتی ہی لیکن اس طرح کب تک کام چل سکتا ہی۔ اگر اصطلاحات کے متعین کرنے اور ان کی اشاعت میں تاخیر کی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر مترجم اور مؤلف اپنے خیال اور قیاس کے مطابق الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوگا اور یک سانی باقی نہ رہےگی۔ اس انتشار سے اُردو ادب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی۔ یہ کام صرف دو ادارے ہی کرسکتے ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو ہند اور دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ۔ اگر دونوں کے تعاون سے یہ اہم اور ضروری کام انجام پا جائے تو اُردو زبان کے حق میں ایسی عظیم الشان ترقی کا موجب ہوگا جس کے دوررس نتائج کا اندازہ ہم اس وقت کافی طور پر نہیں کرسکتے۔

نئی کتابیں

فنِ صحافت اُردو زبان میں فنِ صحافت کے اصول وضوابط اور اخبار کی تیاری کے مختلف مراحل کے متعلق کوئی کتاب موجود نہ تھی اور اُردو صحافت کا شوق رکھنے والے نوجوانوں کو انگریزی کا دستِ نگر ہونا پڑتا تھا۔ اس ضرورت کو محسوس کرکے اور نیز اس خیال سے کہ فنِ صحافت کی باضابطہ ترتیب کی طرف ہندستان کی یونی ورسٹیوں کی توجہ ہو چکی ہی۔ جناب چودھری رحم علی الہاشمی صاحب بی۔ اے نے جنھیں اخبار نویسی کا پچیس سالہ تجربہ ہی اس فن پر پہلی کتاب تیار کی ہی جو انجمن کی طرف سے شائع ہو رہی ہی۔ قیمت مجلد تین رُپے چار آنے (سہ؎) بلا جلد دو رُپے چار آنے (عہ؎)

مقالاتِ گارساں دتاسی (حصۂ اول ودوم) گارساں دتاسی کے خطبات اس سے قبل انجمن شائع کرچکی ہی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اُردو ادب اور زبان کے متعلق ایسی بیش قیمت معلومات کا خزانہ ہی جو کہیں دوسری جگہ دست یاب نہیں ہوسکتیں۔ دتاسی نے خطبات کے بعد بھی اُردو زبان و ادب پر اپنے سالانہ تبصرے جاری رکھے اور انھی مقالات کا مجموعہ ہی۔ قیمت مجلد (صہ) بلا جلد (للعہ)

مینیجر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) ۱؍ دریا گنج، دہلی

اُردو شعر و ادب کا جائزہ

(جناب ڈاکٹر سید عبداللہ ... جناب ڈاکٹر م. حفیظ سید ام اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

ہر سال نیا سال شروع ہوکر ختم ہوجاتا ہے۔ اَن گنت سال ماضی کی تاریکیوں میں گُم ہو چکے ہیں۔ وقت کے آہنی ہاتھ مستقبل کے اوراق اُلٹ رہے ہیں۔ زندگی رواں دواں گزر رہی ہے۔ زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز۔ ہم لوگوں کے دُکھ درد، سُکھ چین سے بے پروا۔ ہم اگر چاہیں تو زندگی یا بہ لفظِ دیگر وقت کا ساتھ دے سکتے ہیں مگر وقت ہمارا ساتھ دینے کے لیے کبھی نہیں رُک سکتا۔ زندگی عبارت ہے حرکت سے اور اسی حرکت اور اسی روانی کو ہم وقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انقلابات، حادثات، داخلی اور خارجی، ذہنی اور جسمانی، تغیر و تبدل، ان سب کا نام وقت کی روانی ہے۔ حدیث شریف میں ہے وقت کو بُرا مت کہو۔ وقت ہی خدا ہے۔

زبان بھی انسانوں کی طرح مختلف ارتقائی مدارج طے کرتی رہی ہے اور طے کرتی رہے گی۔ میرؔ کی زبان وہ نہ تھی جو ولیؔ کی تھی۔ غالبؔ کی زبان میرؔ کی زبان سے قدرے مختلف تھی۔ ناسخؔ و آتشؔ نے زبان کو سنوارا اور نکھارا۔ انیسؔ نے زبان کو بڑی حد تک پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ داغؔ نے زبان سے کُھانا سکھایا۔ کبھو، کسو، تمئیں، جاگہ، ایدھر، جیدھر، ترٹ، پچھے وغیرہ الفاظ متروک قرار دیے گئے۔ غرض کہ یونہی مختلف اوقات میں ضروریات اور مقتضیات کے تحت، بہت سے الفاظ کی درآمد، برآمد رہی۔ ان الفاظ کو قبول کرنا یا رد کرنا، کسی ایک فرد یا کسی ایک ادارے کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک پوری ہیئتِ اجتماعی کے خارجی اور معنوی رُجحانات پر منحصر ہے۔ قدیم اور جدید کا سوال اس میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ ارتقائی مدارج ہیں اور بس۔

ماضی ایک حد تک ہماری موجودہ زندگی پر کچھ عرصے کے لیے حاوی رہتا ہے اور یہ ماضی، بہت

اہم اور مفید نتائج "حال" کے بنانے میں بہم پہنچاتا ہے۔ ہم مستقبل کی عمارت ماضی ہی پر کھڑی کرتے ہیں۔ "ارتقا" کا ہر قدم اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ آج کل نوجوان شعرا کے ساتھ ساتھ پُرانے لکھنے والوں کا ایک گروہ اپنی وضع داری کے ساتھ نغمہ سرا ہے۔ قدامت پرستی کا دَور جلد ختم ہونے والا ہے مگر اس ماضی کے اثرات موجودہ اور آیندہ دونوں زمانے کی تشکیل میں کافی مدد دیں گے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کلاسکی ادَب مٹ جائے گا یا اس کی قدر و قیمت گھٹ جائے گی۔ زندگی کی بعض حقیقتیں ہر ملک اور ہر قوم میں یک ساں ہیں اور یک ساں رہیں گی۔ محبّت، نفرت، خوشی اور غم کے جذبے انسانی زندگی سے وابستہ ہیں، ان جذبات کی کام یاب ترجمانی کرنے والا ادَب زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میرؔ و غالبؔ کو بھُول جانے کے معنی زندگی سے کنارہ کشی اور اُس کے حقائق کو جُھٹلانا ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر آج اِس دَورِ "آہن و بخار" میں کوئی شاعر مثنوی بدرِ منیر اور گُل زارِ نسیم لکھے تو اُسے شاید کبھی بھی مقبولیت حاصل نہ ہوگی۔ ہم جب ان مثنویوں کو پڑھتے ہیں تو اپنے ماحول کو، میرؔحسن اور نسیمؔ کے ماحول میں تھوڑی دیر کے لیے بدل دیتے ہیں۔ لیکن اگر آج کا ماحول، کوئی شاعر، میرؔحسن اور نسیمؔ کے ماحول بنا کر پیش کرے تو وہ یقیناً قابلِ اعتراض اور ناموزوں سمجھا جائے گا۔

زمانۂ حاضر میں بھی وہی اُردو بولی جاتی ہے اور لکھی جاتی ہے جو ہمارے بعض لکھنے والے بولتے ہیں۔ مگر جو چیز دَورِ جدید کی شاعری کو ممیّز و ممتاز کرتی ہے وہ جدید موضوعات اور مسائل ہیں۔ جن کو تاریخ، اقتصادیات، تمدن، سیاست، سائنس اور نفسیات نے ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔ اب عقل و شعور کی یہ گتھیاں محض "ناخنِ جنوں" سے نہیں سُلجھ سکتیں۔ ادَب اب خواص پسند اور تفریحی حدوُد سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ادب کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو ادَب، چند خیالی اور فرضی داستانوں کا مجموعہ بن کر "طلسمِ ہوش رُبا" اور "الف لیلہ" کی جلدوں میں مقیّد ہوکر رہ جائے گا۔ یہ تاریخ کا بطلان ہوگا۔ ہمارے قصائد، ہماری مثنویاں، ہماری قدیم غزلیں، سب اپنے اپنے دَور کے طبقاتی، سیاسی اور ذہنی رجحانات کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح اگر آج کا ادَب، موجوُدہ زندگی کے متعدّد شعبوں کو سمیٹ رہا ہے اور اس پر نئی روشنی ڈال رہا ہے تو اس میں "کف در دہاں" ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

موجودہ دَور میں بہت سے ایسے شاعر بھی مل جائیں گے جو شاعری کے بلند پایہ اُصول سے قطعًا بے بہرہ ہیں۔ جو شاعری نہیں کرتے بلکہ کسی دوا کا اشتہار لکھتے ہیں۔ اس طرز کے اَدب کو اَدب سے تعبیر کرنا بے اَدبی ہوگی۔ بعینہٖ عہدِ قدیم میں بھی اسی قسم کے کم مایہ شعرا گزرے ہیں جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

جہاں تک زبان اور عروض کا تعلق ہی، قدیم اور جدید شعرا دونوں اب تک اس پر عامل ہیں۔ اسی جگہ "نظمِ معرّا" (Blank verse) کا ذِکر نامناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ "نظمِ معرّا" نے جو اَدب ہم کو دیا ہی، وہ عقل و ہوش سے معرّا معلوم ہوتا ہی۔ ممکن ہی کوئی شاعر ایسا بھی اُٹھے جو ملٹن (Milton) اور شیکسپیر (Shakespeare) کی طرح اس میں بھی جان ڈال دے —— ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ "جدید موضوعات" نے آج اَدب کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا ہی۔ یہ "موضوعات" مفروضات نہیں ہیں اور نہ گھڑے گئے ہیں۔ کش مکشِ حیات نے بہت سی تلخ حقیقتوں کو عُریاں کر دیا ہی۔ ہم ان سے آنکھیں نہیں چُرا سکتے۔ ان سے آنکھیں چُرانے کے معنی ہیں خود غرضی، بُزدلی اور پست ہمتی۔ ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہی، سمجھنا ہی، سمجھانا ہی، اور ظاہر ہی کہ بغیر زبان کے نہ ہم سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ، نئی معنویت اور وسعت کے ساتھ نہ لائے جائیں تو معنی و مطالب، پُورے طور پر ادا نہیں ہوسکتے۔ ع

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

چکبست، اقبال اور جوش کی نظموں کے صِرف عنوانات ہی ہمیں یہ بتادیں گے کہ کس قدر نئے نئے مسائل اور کتنے جدید رُجحانات ہماری شاعری میں کام یابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ آچکے ہیں۔ ہماری شاعری اب حُسن و عِشق کے تجربات اور محسوسات ہی تک محدود ہوکر نہیں رہ گئی ہی۔ اس میں اب افلاس اور امارت کی ہول ناک داستانیں، طبقاتی کش مکش، جنسی اور نفسیاتی الجھنیں (Complexes) فلسفہ اور سائنس کا شعور آگیا ہی۔ اس اَدب میں کفر و الحاد بھی ہی اور مذہبی جذبات بھی۔ ہمیں کفر و الحاد کی شاعری سے چونک نہ پڑنا چاہیے اُردو کسی مذہبی زبان کا نام نہیں ہی۔ نہ یہ کسی مذہبی جماعت

کی ترجمان ہو۔ زبان کا مشرب ہمیشہ "صلح کل" ہوتا ہو۔ ہر جماعت کے افراد کو حق حاصل ہو کہ وہ اپنے نظریات اُردو کے ذریعے لوگوں تک پہنچائیں۔ مگر شرط یہ ہو کہ یہ نظریات سنجیدہ ہوں اور غور و فکر پر مبنی ہوں۔ وقتی اور ہنگامی نہ ہوں۔ دِل آزاری اور طنز و تضحیک سے بَری ہوں۔ کسی مرتب اور منظم فلسفے کے حامل ہوں اور سب سے آخری اور سب سے بڑی شرط یہ ہو کہ اعلا شاعری کے معیار پر پُورے اُترتے ہوں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ ابھی دوَرِ جدید کے شعرا کے کلام میں یہ باتیں کم مِلتی ہیں۔ پھر بھی ہمارا ادَب سچّا اور جان دار ہو اور مختلف النوع تحریکوں سے ہم آہنگ ہو ہمارا نوجوان شاعر آج یوں نہیں کہے گا ؎

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوے

وہ آج وقت کے ساتھ نغمہ سرا ہو ؎

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا — راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم — ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوے
جا بجا کوچہ و بازار میں بکتے ہوے جسم — خاک میں لتھڑے ہوے خون میں نہلائے ہوے
لوٹ جاتی ہو اِدھر کو بھی نظر کیا کیجیے — اب بھی دِل کش ہو ترا حُسن مگر کیا کیجیے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا — راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

(فیض احمد فیضؔ)

آج کا شاعر اپنے کو بڑا شاعر نہیں سمجھتا۔ جو دُنیا کے ہنگاموں سے بے پروا اپنی ایک الگ دنیا بنائے ہوئے مست رہے۔ وہ خود کو عالم گیر برادری کا ایک ذمّے دار فرد سمجھتا ہو۔ اُسے اپنے فرائض کا احساس ہو۔ وہ جانتا ہو کہ اس کے نغموں کا سب سے بڑا صِلہ یہی ہوسکتا ہو کہ افراد کے دِلوں میں خود شناسی کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ وہ خود فریبی سے نکلنا چاہتا ہو اور دوُسروں کو بھی یہی سکھاتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل جو کچھ لکھا جارہا ہو، وہ ایک حد تک ردِّ عمل کے طور پر بھی ہو۔ اور یہی وجہ ہو کہ بعض اوقات لہجہ تند اور ناگوار حد تک دُرشت ہوجاتا ہو۔ غیظ و غضب اور استہزا کی بے شمار مثالیں جوشؔ کے کلام

میں پیش کی جاسکتی ہیں مگر اس غیر متوازن زمانے میں جب کہ ہر لمحہ، ہر لحظہ ہندستانی جمود اور بے بسی میں اضافہ ہی کرتا چلا جاتا ہی، اس تند و کرخت لہجے کو "واردے تلخ" کہ کر برداشت ہی کرنا پڑے گا۔ یہ بھی صحیح ہی کہ ہماری شاعری میں تخریبی عنصر کی بھی ایک لہر دوڑ رہی ہی، جو عدمِ تفکر اور اعصابی ہیجان پر دلالت کرتی ہی۔ مگر سعدی کا یہ کلیہ بھی اپنی جگہ اٹل ہی ع "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" جوش جب یہ کہتا ہی ؎

نسلِ انسانی کھڑی تھی ششدر و آتش بجاں　　　اک عبوری موڑ پر۔ دو عالموں کے درمیاں
بے منیا پیمبری تھی، کافری تاریک و تار　　　کس غضب کی کش مکش تھی، کس بلا کا انتظار

تو یہ بھی بشارت دیتا ہی ؎

آج لیکن عصرِ حاضر کا سماں کچھ اور ہی　　　اب زمیں کچھ اور ہی اب آسماں کچھ اور ہی
اس شبِ جامد میں، صبح سیلِ احساسات ہی　　　اب بھی مانا رات ہی لیکن یہ پچھلی رات ہی
شب کے اس دھندلے اُفق سے، باہزاراں آب و تاب　　　امن و آسایش کا طالع ہو رہا ہی آفتاب

اس اقتباس سے یہ بھی پتا چلتا ہی کہ تاریخ کی قوتوں کا کتنا زبردست احساس ہمارے شعرا میں آچلا ہی اور نوعِ انسانی کی بہبودی اور بہتری میں کتنا اعتقاد پیدا ہوگیا ہی۔ اُردو شاعری میں "رجائی لہجہ" مستقل طور پر دورِ حاضر ہی میں آیا ہی۔ اس سلسلے میں ایک سوال اور اُٹھتا ہی۔ کیا ہر نام نہاد شاعر اس قابل ہی کہ اُسے محفلِ ادب میں جگہ دی جائے؟۔ اور اگر نہیں ہی تو شاعروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کیسے روکا جاسکتا ہی؟۔ اس کا ایک ہی جواب ہی کہ زمانہ شاعر اور متشاعر کا فیصلہ خود کردے گا:۔ حدیث شریف میں آیا ہی "اَلْوَقْتُ سَیْفٌ"۔ اس وقت ادب جس بحرانی دور سے گزر رہا ہی، اس میں سوچنا تو درکنار سانس لینے کی فرصت نہیں ملتی۔ خس و خاشاک کا آجانا لازم ہی مگر رفتہ رفتہ جب طوفان فرو ہوجائے گا، گرد و غبار چھٹ جائے گا، تو اس گلشن کے خوش نما پھول اپنی طرف متوجہ کرلیں گے۔

اسی کے ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہی کہ معیارِ تنقید بلند کردیا جائے۔ ——————

معیارِ تنقید کیوں کر بلند ہوگا، اصولِ تنقید کی ساخت کیوں کر ہو؟ یہ بحث بہت طولانی اور تفصیل طلب ہو۔ مَیں یہاں صرف چند اشارے کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہمیں ذاتیات سے قطعًا سروکار نہ ہونا چاہیے۔ افراط و تفریط اور پُرانے تقریظی رنگ سے دامن بچائے رکھنا چاہیے۔ نقاد کے واسطے ضروری ہو کہ نہ صرف وہ اُردو ادب پر عبور رکھتا ہو بلکہ متعدد زبانوں کے ادب کا رچا ہوا مذاق بھی رکھتا ہو: اس کا دماغ ایک سائنس داں کا دماغ ہو جو بغیر کسی تعصب کے نہایت اطمینان کے ساتھ ہر مسئلے کو علاحدہ علاحدہ تقسیم اور تحلیل کرسکے۔ اس کا دل شاعر کا دل ہو تاکہ وہ شاعر کے محسوسات میں حتی الامکان شریک ہوسکے۔ اشعار پر صرف خارجی لحاظ سے تنقید بے سود ہوگی۔ زبان کی خامیاں یا اچھائیاں، عروضی نکات اور مختلف صنعتوں کا جائزہ لینا ہی تنقید نہیں ہو بلکہ یہ بھی دیکھنا ہو کہ شاعر کے مضامین میں تنوّع کتنا ہو۔ عمق اور غور و فکر کتنا ملتا ہو۔ صداقتِ احساس اور معنویت ہو یا نہیں۔ محض ہنگامی جذبات ہی اس کے کلام میں ملتے ہیں یا آفاقی لہریں بھی دوڑ رہی ہیں۔ زندگی کے تجربات جو اس نے پیش کیے ہیں، وہ کس طرح اور کس زاویے سے محسوساتِ شعری میں منتقل کیے گئے ہیں اور ان تجربات کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہو۔ ذہنی کیفیات کے کس کس پہلو پر بحث کی گئی ہو۔ زندگی کے سرد و گرم پر اس کی نظر کیسے پڑی ہو۔ جب تک نقاد ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھ کر کلام پر نقد و تبصرہ نہ کرے گا، اُس کی تنقید مکمل نہیں کہلاسکتی۔ اس کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہو کہ اُردو کے بڑے بڑے اُدبا اشتراکِ عمل سے تنقیدی اصول وضع کرلیں۔ جو ضروریاتِ وقت کے ساتھ بدلتے بھی رہیں گے۔ مگر متفقہ آرا کی معیت میں۔ یوں نہیں کہ جس نے چاہا بدل دیا۔

ادب کا انفرادی دوْر ختم ہوچکا۔ اب ادب کے اجتماعی دوْر کا زمانہ ہو۔ اگر ہم ان تمام باتوں پر عامل ہوجائیں تو ادب کی بہنگم روش بہت کچھ سُدھر سکتی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے اُصول میں تغیّر و تبدّل کی کوئی گنجایش نہ ہونا چاہیے۔ ادب کو چند گنے اُصول کا پابند کردینا، ادب کی وسعتوں کو ختم کردینا ہو۔ بڑا شاعر یا نثّار چند اصول کے گھروندوں میں گھِر کر نہیں رہ سکتا۔ مگر پھر بھی بغیر اصول وضع کیے چارہ نہیں۔ مستثنیات سے یہاں بحث نہیں۔ شاعری اور افادیت کے موضوع کو ذرا اور واضح کردینا چاہتا

ہوں۔ مجھے خوب احساس ہے کہ انھی موضوعات پر بحث کرتے وقت بعض احباب مجھے رجعت پسند قرار دیں گے۔ اور بعض "ترقی پسند" کے خطاب سے سرافراز فرمائیں گے۔ مگر پھر بھی حقیقتِ امر کا اظہار نہ کرنا ادبی بد دیانتی ہوگی۔ بہ قول حضرت اقبال ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش　　　میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ شاعری کا کام چند لایعنی اور دُور از کار باتوں کا موزوں کردینا نہیں ہے۔ شاعری عوام پسندی اور خواص پسندی کی قید سے آزاد ہے۔ اس بارگاہ میں غریب اور امیر کا سوال نہیں اُٹھتا۔ یہاں تو صرف چشمِ بینا اور گوشِ شنوا کی ضرورت ہے۔ شاعری سازِ حیات کا وہ نغمہ ہے جس سے جھونپڑے اور محل دونوں گونج اُٹھتے ہیں۔ شاہانِ کج کلاہ، اور گدایانِ بے نوا، رندانِ خراب حال اور پیرانِ قباپوش سب ایک صف میں یہاں کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اس بارگاہ میں جس کی پذیرائی ہے، وہ حُسن ہے۔ کیٹس (KEATS) نے سچ کہا ہے۔ "حسین چیز ابدی مسرت کا باعث ہوتی ہے"

مگر اس نظریے نے غلط فہمی بھی بہت پھیلائی ہے۔ یہیں سے "ادب برائے ادب" کا گُم راہ کن نظریہ نکلا۔ جس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ حُسن کو اس نظریے کے حاملوں نے محض تصوّر کی پیدا کردہ لطافتوں تک محدود کردیا۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر "حُسن" ایک ابدی مسرت ہے تو اس کا وجود حقیقی ہے نہ کہ خیالی۔ زندگی سے بڑھ کر "حسین" شے کوئی نہیں ہوسکتی۔ "حُسن" محض رخسارِ حبیب کا نام نہیں ہے۔ "حُسن" ان آنسوؤں میں بھی جھلکتا ہے جو فاقوں کی شدّت سے نکل آتے ہیں۔ "حُسن" صرف پھولوں میں نہیں، کانٹوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ "حُسن" زرق برق لباس سے لدی ہوئی شہزادیوں میں بھی مل سکتا ہے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں چھپی ہوئی بھکارن میں بھی۔ "حُسن" قندِ مکرّر بھی ہے اور زہرِ ہلاہل بھی۔ کارخانوں کے مزدور اور محلوں کے رہنے والے، دونوں حُسن سے بہرہ مند ہیں۔ "حُسن" نرم اور لطیف حکایتوں کا نام بھی ہے اور تلخ حقیقتوں کا بھی۔ اسی کو ہیگل (HEGEL) جدلیات (DIALECTIES) سے تعبیر کرتا ہے۔ فلسفہ، منطق، سیاست، اقتصادیات، عمرانیات، مذہبیات، جُملہ چیزیں شاعری کے سانچے میں ڈھل کر حسین ہوسکتی ہیں۔ "رخسار و گیسو" تو شاعری میں کافی جگہ پاچکے اور پاتے رہیں گے۔ مگر ضرورت ہے کہ "رخسار و گیسو" سے

ہٹ کر بھی کچھ کہا جائے۔ مگر جو کچھ کہا جائے، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہو، شاعری کے دائرے سے باہر نہ ہو۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہو کہ ہم ہر قسم کے موضوع کے لیے محض غزل والی زبان سے کام کیسے چلا سکتے ہیں۔ میری مُراد غزل کی اُس زبان سے ہو جس میں صرف اِس پر عمل کیا جاتا ہو کہ غزل کے معنی عورتوں سے بات چیت کرنا ہو۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہو کہ موضوع کی نزاکت یا ثقالت کے لحاظ سے زبان، یا یوں کہیے لہجہ مختلف ہوتا چلا جائے گا ؎

رُخ پھیر کے یوں چلی جوانی   یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

جلیل کا یہ شعر بھی اپنی جگہ خوب ہو اور اقبال کا یہ شعر بھی دل کش ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں   کارِ جہاں دراز ہو، اب مِرا انتظار کر

میر کا استغنا ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

اور شاد عظیم آبادی کا دستِ طلب ؎

یہ بزمِ مَے ہو، یاں کوتاہ دستی میں ہو محرومی   جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہو

دونوں شعر اہم ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہو کہ اب تک ہم جمالِ یار ہی کے قائل رہے ہیں۔ اب ہمیں بدصورتی میں بھی حُسن دیکھنا ہو۔ جوش نے "سیاہ فام" سے مخاطب ہو کر کیا خوب کہا ہو ؎

اے کہ گیسو کی طرح نرم و سیہ فام ہو تو   چشمِ بد دُور کہ خالِ رخِ ایام ہو تو

ہمیں ادب میں حُسنِ خیال ہی نہیں ڈھونڈھنا ہو بلکہ حُسنِ عمل بھی ؎ اکبر الہ آبادی

قرآن یہ شاہد ہو خدا حُسن سے خوش ہو   کس حُسن سے یہ بھی تو سُنو حُسنِ عمل سے

یہیں سے ادب کا افادی رُخ سامنے آجاتا ہو

"ادب اگر زندگی کا ترجمان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔" زندگی کے تاریک اور روشن رُخ دونوں ادب کی جان ہیں۔ ادب مردہ اور افسردہ نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی طرح زندہ اور متحرک۔ ہم اپنے کو کسی طرح زمانے کے اثرات سے نہیں بچا سکتے۔

ہمیں ادب میں نئے امکانات ، نئی وسعتیں ، نئے نظریے داخل کرنے پڑیں گے ۔ ہم ان سے بچ نہیں سکتے ۔ سائنس ، فلسفہ ، روحانیت ، مادّیت ان تمام موضوعات کی ادب میں جگہ ہونی چاہیے ۔ ہم انسانی برادری سے باہر نہیں ۔ لہٰذا انسانی دُکھ درد ، مفلسی اور تنگ دستی ، تنگ نظری اور تنگ خیالی ، سرمایہ پرستی اور غلامانہ ذہنیت ، ان تمام امراض کا علاج ادب کے ذریعے سے کرنا پڑے گا۔ اگر ہم اِن فرائض سے غافل ہیں تو ہمارا ادب خودغرضی ، تنگ نظری مردم آزاری کی ہول ناک داستان بن کر رہ جائے گا اور دُنیا کے ادب میں اس کی کوئی جگہ نہ ہوگی ، کوئی وقعت نہ ہوگی ۔ یاد رکھیے یہ میری آواز نہیں ہے ، یہ وقت کی آواز ہے جو آج دُنیا کے ادب میں گونج رہی ہے جو توپوں کی گرج اور بموں کی دھمک کے ساتھ ہم تک پہنچ رہی ہے ۔

یہ زندگی کا مطالبہ ہے جسے زندہ رہنے کے لیے پوُرا کرنا پڑے گا ۔

سرسیّد خطوط کے آئینے میں

(بہ قلم جناب خواجہ احمد فاروقی ایم اے)

(بہ سلسلۂ سابق)

" ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندوؤں کے دِل میں جوش آیا ہے کہ زبانِ اُردو خطِ فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے

مٹادیا جائے ۔ میں نے سُنا ہو کہ انھوں نے سائینٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک لی ہو کہ بجائے اخبار اُردو کے ہندی میں ہو تو ترجمۂ کتب بھی ہندی میں ہو یہ ایک ایسی تدبیر ہو کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا ۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اُردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ مسلمان علاحدہ ہوجاویں گے ؛ [1]

بعض حضرات کا یہ خیال ہو کہ سرسید مرحوم نے انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کی اِس وجہ سے یہ جھگڑا پیدا ہوا لیکن یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہو ۔ اس وقت کانگرس کا کہیں وجود بھی نہ تھا ۔ سرسید نے علی گڑھ کے تعلیمی سروے میں بھی اِس نزاع پر روشنی ڈالی ہو ۔ " تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، خیال پیدا ہوا ہو اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مِل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور شہنشہی ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہو مٹا دیا جائے ۔ اس وقت مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہوکر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے ۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہو اس کی ابتدا اِسی سے ہوئی ۔"

جدید اُردو شاعری

اُردو شاعری کے جدید میلانات بھی ایک حد تک سرسید کے ممنونِ احسان ہیں ۔ انھوں نے نیچرل خیالات نظم کرنے کی ترغیب اور تحریص دلائی اور یہی ہماری جدید شاعری کا دورِ اوّل تھا ۔

جس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد پنجاب کے سررشتۂ تعلیم سے وابستہ تھے ان کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ کی تائید سے ایک بزمِ ادب پنجاب میں قائم ہوئی ۔ جس میں بجائے غزلوں کے نظمیں پڑھی جاتی تھیں ۔ اِس انجمن کا پہلا مشاعرہ آٹھ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا ۔ اور

[1] ، خطوطِ سرسید ، ص۱۶۱

اس بزمِ ادب کی سرگرمیاں گیارہ مہینے تک جاری رہیں۔ سرسید نے مولانا آزاد کو بنارس سے ایک خط ۲۹ر اکتوبر ۱۸۸۴ء کو لکھا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کا سنِ کتابت ۱۸۷۴ء ہونا چاہیے اس میں تحریر فرمایا ہے:۔

"میری نہایت قدیم تمنا اِس مجلسِ مشاعرہ سے برآئی ہے۔ مَیں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی خوابِ امن پہنچی۔ بہت دِل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زورِ سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اُردو زبان میں ادا کیے جاویں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم بیان کیا کرسکتے ہیں۔ بعد رمضاں انشاء اللہ تعالا ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔"[۵۱]

سرسید کا ایک اور خط جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مولانا الطاف حسین حالی کو لکھتے ہیں:۔

"جناب مخدوم و مکرم من عنایت نامہ جات مع پانچ جلد مسدّس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی۔ جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدّس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہاتِ دور ازکار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرّا ہے کیوں کہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے سے ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں، جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق یہ ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پُرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اِس نظم میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبّت کا اثر سمجھتا ہوں اگر

۵۱۔ خطوطِ سرسید، ص ۲۲

پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہو تو صرف ان ہی الفاظ میں ہو جن میں میری طرف اشارہ ہو۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔" [1]

یہ خط ۱۰ رجون ۱۸۷۹ء کا لکھا ہوا ہو۔

۳۔ اسلوبِ تحریر

(۱) سرسیّد کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور بے ساختگی ہو وہ Conrad کی طرح تمام ادیبوں میں سب سے زیادہ غیر ادیب واقع تھے ان کے یہاں فاضلانہ اور منشیانہ تراش خراش بہت کم نظر آتی ہو۔ تشبیہیں، تمثیلیں یا تلمیحیں جو کچھ ہیں وہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہو کہ بلا قصد و ارادہ مصنّف کے قلم سے نکلی ہیں۔ یہ تصنّع اگر ہو تو ایسا ہی ہو جیسے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:۔

"جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہو۔ وہ کوئی معما یا بدر چاچ کا شعر نہیں ہو جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسن معمائی درکار ہوں۔"

نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کو معلوم ہو کہ بھوپال اب تک ہمارے لیے کوفہ رہا ہو۔"

ایک اور خط میں نواب صاحب موصوف ہی کو لکھتے ہیں:

اپ کا عنایت نامہ بلا تاریخ پایا "اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی" جس قدر دل کو مسرت

---

[1] خطوطِ سرسیّد، ص ۱۲۵

آپ کے خط سے ہوئی ہو بیان نہیں کرسکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلہ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی۔ جس محبّت سے لکھا تھا وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا۔ میں محبّت سے آپ نے اشعار لکھے تھے۔ ان کو پڑھ کر میں ایسا محوِ محبّت ہوا کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدتِ وجود کے مسلے کا عقدہ حل ہوتا تھا ؎

میاں احمد و مہدی نہ ہیچ ہست حجاب		تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز [1]

نواب محسن الملک کو ۲۶ر نومبر ۱۸۶۹ء کو خط میں لکھتے ہیں :۔

"محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہو کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی اور کوئی اس کو نہیں توڑ سکتا۔ مگر وہ نازک بھی ایسی ہو کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہو۔ وہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی اور ایک ادنا سی خلافِ محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہو" [2]

(ب) انشائے سرسید کی دوسری خصوصیت دل نشینی اور تاثیر ہو۔ بہ قول مولانا حالی یہ اثر محض سادگی کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ "اُن کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھی" یہی خلوص ہو جو ان کے خطوط میں بھی جلوہ گر ہو۔

سرسیّد کو مولوی زین العابدین صاحب سے بڑی خصوصیت تھی اس لیے ان سے سب سے زیادہ خفگی اور ناراضگی بھی رہتی تھی۔ ان کو لکھتے ہیں :۔

"مکرمی زینو بھیّا ! ابھی تمھارا خط پہنچا کچھ شک نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہو جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے۔ مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہو وہ لکھا بھی نہیں جاسکتا زبان کھجلاتی ہو اور کوئی نہیں کہ اس کو بُرا کہوں۔ دِل میں غصّہ آتا ہو اور کوئی یہاں نہیں ہو جس پر غصّہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہو جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سُونا نہیں ہوا بلکہ دِل سونا ہوگیا۔ صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ "آں کہ ہرگز فراموشت نہ کنم" کا نقشہ ہوگیا" [3]

---

[1] "خطوطِ سرسید"، ص۲۳۔ [2] ایضاً ص۴۹۔ [3] ایضاً ص۱۱۸

سرسید کے خطوط بڑی حد تک سپاٹ ہیں۔ لیکن سچائی اور خلوص نے بے جان لفظوں میں جان ڈال دی ہے اور بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریگستان میں کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہے جو پورے جوش کے ساتھ اُبل رہا ہے۔ نواب وقارالملک کو لکھتے ہیں :۔

"میں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی۔ قیامت میں خدا کے سامنے رسول کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا، رسولِ خدا میں نے بغیر کسی غرضِ دینا و دنیوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہ رکھا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا من جملہ ان کے ایک یہ انتصار جنگ ہیں۔ آپ کہیے گا کہ میں نے نہایت نیک نیتی سے کیا تھا خدا یقینی آپ کو معاف کرے گا۔ گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہ ہوگی۔ باللہ نہ ہوگی۔ ثم باللہ نہ ہوگی۔ یہ میری رائے ہے آپ کی نسبت"۔[1]

حالی کا شملہ آنے کا ارادہ ہے ان کو لکھتے ہیں :۔

"آپ بلا تامل تشریف لائیں، مکان، دل، آنکھیں سب حاضر ہیں"

(ج) سرسید کے خطوط میں بول چال کا بھی لطف پوشیدہ ہے اور بعض جگہ صحیح اور غلط۔ فصیح اور غیر فصیح کا بھی لحاظ نہیں کیا ہے۔ بہ قول مولانا حالی "جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی" اغلاطِ سرسید سے ہم نے آگے بحث کی ہے۔

سرسید نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں :۔

"مسٹر مالک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنا پتا لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا وہ گھر پر نہ تھے۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ کرائے کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے۔ دس رُپے روز میں نے کہا "مرے" اس لئے دوبارہ نہیں گیا۔ پھر کسی دن جاؤں گا"۔[2]

خان بہادر مولوی ذکاءاللہ کو لکھتے ہیں "واہ جناب واہ آپ نے خواجہ وجیہ الدین سے فرمایا کہ گیارہ بجے کا وقت جو بجٹ میٹنگ کے لیے مقرر کیا ہے اچھا نہیں ہے۔ اگر ایک بجے

---

[1] خطوطِ سرسید ص ۱۰۰ و ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۲۹۔

کا وقت ہوتا تو اچھا تھا مطلب آپ کا یہ تھا کہ آپ نو بجے دلّی سے چلتے اور اجلاس میں شریک ہوکر اُسی دن واپس چلے جاتے ؟[۵۱]

(د) خطوط سرسیّد مصنّف کی افتادِ طبع کا آئینہ ہیں۔ ان میں ظرافت جو سرسیّد کی فطرت کا خمیر تھی جا بہ جا چمکتی ہے۔ نواب محسن الملک کے خط میں مولوی س۔خ پر خفگی کا اظہار ہے لیکن یہ عتاب اور ملال بھی ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں ہے :-

"وہ بچّے ہیں۔ انھوں نے دُنیا نہیں دیکھی۔ دوستی اور محبّت کے معاملات اور برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ وہ کسی رنڈی پر عاشق نہیں ہوئے۔ کسی لونڈے پر عاشق نہیں ہوئے ان کو مزہ دوستی اور محبّت کا مطلق معلوم نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ نہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے اور نہ انسان کی دوستی کا ۔"[۵۲]

اسی خط کے آخر میں لکھتے ہیں :-

"مجھ کو مطلق یاد نہیں ہے کہ وہ کون سا خط ہے اور اس میں کیا مضمون ہے جس کو پڑھ کر میاں احمد جان صاحب روئے، امید ہے کہ آپ مطلع فرمادیں تو اس بات کو اپنی معجزات کی کتاب میں لکھ لوں ۔"[۵۳]

نواب محسن الملک ہی کو لکھتے ہیں :-

"آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے آئمۂ کبار تو درکنار مولوی جبو کی بھی تقلید کافی ہے ۔"

نواب صاحب موصوف کو لکھتے ہیں، انگریزی وضع اختیار کرنے کی بحث ہے :-

"تبدیلِ وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب بجا ہے۔ بہ شرطے کہ میرا جادو، توبہ توبہ، میرا معجزہ، نعوذ باللہ۔ میری کرامت، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، میری حماقت، تم میں اثر نہ کرےگی۔ ذرا صبر کرو تین مہینے خیر سے گزر جائیں۔ جب الہ آباد کے اسٹیشن پر گلے ملوگے اور چھاتی سے چھاتی ملے گی۔ اس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من (معاف کیجیے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہے ۔"

---

۵۱ خطوطِ سرسیّد، ص۲۳۳۔ ۵۲ ایضاً ص۴۸۔ ۵۳ ایضاً ص۵۰۔

(۴) سرسید القاب مختصر لکھتے تھے۔ مثلاً جناب عالی، مخدومی، مکرمی، عزیزی، مشفقی۔ لیکن وہ جو کچھ لکھتے تھے رسمی طور پر نہیں بلکہ اس کی اہمیت پوری طرح سمجھتے تھے۔ نواب وقارالملک سے اختلاف رائے ہوا۔ اس لیے کچھ کشیدگی سی ہوگئی ۱۴ر اگست ۱۸۹۰ء کو سرسید لکھتے ہیں:۔

"عزیزی و مکرمی

نواب صاحب والا جاہ! ابھی تک میرے دل نے قرار نہیں پکڑا ہو کہ دونوں القابوں میں سے .. کون سا القاب رہے۔ اس لیے دونوں لکھ دیے ہیں۔"

جب یہ کشیدگی رفع ہوگئی تو ۳۰ر نومبر ۱۸۹۰ء کو لکھتے ہیں "اب میرا دل تم سے صاف ہوگیا۔ مہدی حسن کے سامنے میں نے تم کو بہت برا بھلا کہا اور بخارات نکال لیے اس لیے میں تم کو وہی القاب لکھتا ہوں جو پہلے لکھتا تھا۔ عزیزی و مکرمی! مولوی مشتاق حسین۔۔۔ ۔۔۔"

غایتِ محبت میں اس طرح کے بھی القاب ہیں۔ مثلاً "مکرمی زینو بھیا" یا نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:۔

"قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش اصطلاح عشق بسیار است و من دیوانہ ام
قبلہ میرے مخدوم میرے محبوب میرے محب میرے ۔۔۔۔۔ ۔۔ ۔۔۔۔۔۔ [1]

تصویر کا دوسرا رخ

(۱) خطوطِ سرسید کی یہ رنگینیاں بالکل ایسی ہیں جیسے کسی بے آب و گیاہ سرزمین میں کہیں کہیں نخلستان کے ٹکڑے نظر آجائیں۔ پوری کتاب کو پڑھنے کے لیے دل پر جبر کرنا پڑتا ہے ورڈز ورتھ کے مجموعۂ نظم کی طرح کُل سے زیادہ اُس کا انتخاب دلچسپ ہے۔

سرسید کے بعض خطوط میں وہی بے تکی ہے جو بالعموم ناصح اور واعظ کی گفتگو میں ہوتی ہے سراج الدین احمد بیرسٹر کے نام خطوط نمبر (۲) اور نمبر (۱۶) میں پند و نصیحت کے سوا اور کچھ نہیں

---

[1] خطوطِ سرسید صفحہ ۳۰

ہے منشی احمد جان عنایت اللہ اور نیاز محمد خاں کے نام بعض خطوط بالکل رسمی، اطلاعی اور کاروباری قسم کے ہیں جو خطوط پُر از معلومات ہیں وہ بیش تر خشک اور بے نمک ہیں۔ بعض خطوط بالکل کسی مضمون یا مقالۂ علمی کا اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔ میر واحد علی کو لکھتے ہیں :۔

"کامن سنس ایک دوسری چیز ہے۔ اس کو اس تقسیم سے کچھ علاقہ نہیں ہے فطرت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ انسان کی عقل کے لیے یہی ایک حد ہے اور خود عقل ثابت کرتی ہے کہ جو باتیں اس حد سے بالاتر ہیں وہ عقلِ انسانی سے مافوق ہیں بس عقل پر عقلِ انسانی کا اطلاق ہے۔ مگر یہ حد، عقلِ کامل کی ہے۔ بہت سے انسان ایسے ہیں جن کی عقل اِس حد تک نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کی عقل کے درجات متفاوت ہیں۔ بہ لحاظ ان درجاتِ متفاوتہ کے ہر شخص کی عقل کی نسبت عقل کا اطلاق کیا گیا ہے اور جب کہ اشخاص سے قطع نظر کی جاوے تو عقلِ کلّی کو عقلِ انسانی سے تعبیر کیا ہے۔ والسلام" [1]

اس کے علاوہ خطوطِ سرسیّد میں زبان اور قواعد زبان کی بعض بڑی غلطیاں ملتی ہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے " وہ قواعد اردو کی پابندی سے فطرتاً آزاد تھے . . . . . تحریر یا تقریر کی رو میں قواعد کی کچھ پروا نہ کرتے تھے . . . . اور ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں صحیح لفظ پر ترجیح دیتے تھے " ذیل میں ہم اغلاط کی ایک مختصر فہرست دیتے ہیں :

"میں نے یہاں بڑی غُل مچائی ہے" ص۲۲ غل مذکّر ہے مونّث نہیں۔ رشک کا مصرع ہے۔ ع

مے کدے میں غُل مچا آندھی سے چھپّر اُڑ گیا

ابراہیم ذوق فرماتے ہیں ع

بلبل کی منگ جو صلگی تھی کہ غُل ہوا

"آپ فی الفور صفحہ بھیج دو" ص۳۵ بھیج دیجیے ہونا چاہیے

"دل کو باغ باغ خوش کیا" ص ۸۴

"میں دیکھتا ہوں کہ جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ویسے ویسے نیکی بڑھتی گئی ہے" ص۶۵

---

[1] خطوطِ سرسیّد، ص۱۶۲

"پانی پت میں جو ذی وجاہت اور معزز مسلمان ہوں ان کے پاس سے میں رائے آنی چاہتا ہوں" ص ۱۲۴

"چٹھیات" ص ۱۹۸

"نیبو" ص ۲۰۰

سرسید نے بعض الفاظ ایسے ثقیل نامانوس اور غریب استعمال کیے ہیں جو جملے کی فصاحت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے جو الفاظ ٹھیٹھ اُردو میں کم مستعمل ہیں وہ بھونڈے طریقے سے استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان کی غرابت بدستور موجود ہو۔ مثلاً محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

"دو سو رُپے ماہواری خرچ قیام ایں جا نہایت کافی ہو" ص ۳۱

بعض جگہ فارسیت کا ناگوار غلبہ ہو مثلاً

"آپ اس قدر عذراتِ مغائرانہ در باب ادائے قیمت کیوں لکھتے ہیں" ص ۳۶

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔" ایک امر نہایت ضروری لکھتا ہوں۔ فی الفور بلا تامل ساعتے اس کی تعمیل فرمائیے۔" ص ۶۸

ص ۹۲۔ پر لکھتے ہیں۔" تعداد اسکالرشپ متعقب بتاؤں گا۔"

ص ۸۷، پر لکھتے ہیں " اس کو مسئلۂ شرعی ٹھیرانا اور اس کے مرتکبیں کو اکلِ حرام قرار دینا مضر اور اسلام کے پانو پر بدستِ خود تیشہ زدن ہو۔"

بعض جگہ اچھا خاصا اُردو میں خط لکھتے لکھتے فارسی کے جملے کے جملے شامل کردیتے ہیں۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :۔

"بعد چھاپہ چند نسخے (مواعظِ احمدیہ کے) آپ کے پاس بھیجوں گا تا دانم کہ مخدوم چہ می گوید۔ خدایا مخدومم مہدی اگر مرا کافرو مرتد داند باک نیست۔ زیرا کہ ایں معاملہ مرا باتست نہ با مخدوم من مہدی" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص ۳۴۔

اسی طرح خط نمبر ۸ (صفحہ ۳۷) کو فارسی میں شروع کرکے اُردو میں ختم کرتے ہیں :۔

اصل یہ ہے کہ سرسید نثرِ جدید کے پہلے رہنما تھے ۔ اس وقت کی پیہم تبدیلیوں اور نئی نئی ضرورتوں کے ہنگامے میں حُسن کاری اور نقش طرازی کا کسے ہوش تھا ۔ یہ دَور تو شکست و ریخت کا تھا ۔ حالیؔ ، آزاد اور شبلی نے البتہ اس زمین کی آب یاری کی اور اس میں چمن کھلائے ۔ سرسید کا صرف یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ظہوری اور بے دل کا طرز غیر مقبول اور ناپسندیدہ بنا دیا اور ثابت کر دیا کہ مافی الضمیر سادہ نثر میں بھی ادا ہوسکتا ہے ۔ سرسید نے جو باتیں اُردو میں پیدا کیں ان کا ذِکر خود انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے ایک مضمون میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :-

"جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اُردو زبان کے عِلم و ادب کی ترقی میں اپنے اِن ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی ۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا ۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات و استعاراتِ خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا ۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لُطف ہو مضمون کے ادا میں ہو ۔ جو اپنے دِل میں ہو وہی دوسرے کے دِل میں پڑے ۔ تاکہ دِل سے نکلے اور دِل میں بیٹھے ۔"

یہی انداز ان کا خطوط میں ہے ۔ پیرایے سے زیادہ مطلب کی فکر ہے اور اسلوب سے زیادہ مضمون کی جستجو ہے ۔ اور اس حد تک کہ بعض خطوط بالکل کاروباری اور رسمی سے معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن اس سے اِنکار نہیں ہوسکتا کہ یہ خطوط سرسید مرحوم کی تمام زندگی اور ان کی عملی جدوجہد کے بھی آئینہ دار ہیں ۔ انسان کے اندازِ طبیعت اور اس کے افکار کا صحیح پتا صرف خط و کتابت اور مراسلت ہی سے لگ سکتا ہے ۔ یہ مکتوبات ان کی سوانح عمری کا دِل چسپ اور مفید حصّہ بن سکتے ہیں

پنڈت گیا پرشاد شُکل سنیہی و ترشول

(از حضرت اقبال ورما سحرؔ ہتگامی مرحوم)

ناظرین کو شاعر کے دو تخلص دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوگی، مگر اس کی وجہ ہے۔ شاعر عرصے تک ضلع اناؤ کے اسکولوں میں ماسٹر رہا۔ دل میں قومی اور سیاسی نظمیں لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ادبی نظموں کا لکھنا تو برسوں پہلے سے جاری تھا اور اس سلسلے میں وہ اپنے پہلے تخلص کے ذریعے کافی مشہور و معروف ہو چکا تھا۔ پس اس کو اپنا دلی شوق پورا کرنے کے لیے مجبوراً دوسرا تخلص بھی اختیار کرنا پڑا۔ یہ مجبوری دراصل ملازمت کی تھی۔ اس وقت سے وہی روش جاری رہی اور اب سنیہی کے ساتھ ترشول سے بھی لوگ خوب واقف ہو گئے ہیں۔ ایک بات اور۔ ترشول کے تخلص سے نہ صرف مذکورہ بالا اقسام کی ہندی نظمیں لکھی جاتی ہیں بلکہ اکثر اردو نظمیں بھی، اگرچہ آخر الذکر کے لیے ہندی رسم الخط ہی سے کام لیا جاتا ہے۔

پنڈت جی اردو کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ اگرچہ ہندی رسم الخط کے سبب اردو کی ادبی دنیا اُن کے نام سے زیادہ تر ناواقف ہے۔ یوں تو زمانۂ حال میں ہندی کے کئی ایسے نامور شعرا ہو گزرے ہیں جو ابتداً اردو میں لکھتے تھے، مگر پنڈت جی میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی مشقِ سخن دونوں زبانوں میں اب بھی اسی طرح جاری ہے جیسی پہلے تھی۔ البتہ اردو میں وہ مسدس لکھتے ہیں جو بہت موثر، پُرزور اور زیادہ تر وقتی ہوتے ہیں اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ہر طرح موزوں۔ بندش کی چُستی کے ساتھ روانی اُن کا عام اور قدرتی خاصہ ہے۔ یہاں ہم اُن کے "آئینۂ ہند" نامی مسدس کے دو بند نمونتہً درج کرتے ہیں ؎

خوش بیاں ایسے تھے جادو کا اثر رکھتے تھے
کوئی فن باقی نہ تھا علم و ہُنر رکھتے تھے
ہم کسی کا نہ کبھی خوف و خطر رکھتے تھے
دِل بَلا کا تو قیامت کا جگر رکھتے تھے
کوئی شمشیر و قلم میں نہ تھا ثانی اپنا
پانی پانی ہوئے دُشمن وہ تھا پانی اپنا

ایک جاں قوم تھی آپس میں محبت وہ تھی فیض عالم کو پہنچتا تھا سخاوت وہ تھی
دلِ دشمن کو ہلا دیتے تھے قوت وہ تھی موت سے بھی نہیں ہم ڈرتے تھے ہمت وہ تھی
سر پھرا جس کا دِکھایا اُسے اکثر نیچا
سر کے رکھتے نہ کبھی ہم نے کیا سر نیچا

ایسی ہی نظموں سے متاثر ہوکر بانگرمئو ضلع اناؤ کے تعلقے دار راے بہادر چودھری سندر سنگھ آنریری منصف و مجسٹریٹ کہا کرتے تھے کہ "اُردو میں ہمارے سینہی ہمارے چکبست ہیں۔" موصوف نے ازراہِ قدردانی ۱۹۲۰ء میں ایک بڑا دربار منعقد کرکے پنڈت جی کو ایک طلائی تمغہ بھی نذر کیا تھا۔ اس وقت پنڈت جی وہیں ٹریننگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اپنی شاعرانہ قابلیت کی بدولت چودھری صاحب کے زمرۂ احباب میں داخل ہوگئے تھے۔

پنڈت جی سنسکرت اور بنگلہ سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں مگر چوں کہ اُردو ہندی سے خاص رغبت ہے، پس آپ زیادہ تر ہندستانی زبان کے قائل ہیں اور جو نظمیں آپ عوام کے لیے لکھتے ہیں انھیں عام فہم بنانے کے خیال سے اُسی زبان میں قلم بند کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ کان پور میں پنڈت مالوی جی کے ہاتھوں سودیشی بازار کا افتتاح ہوا تھا، اُس موقع پر ترشول صاحب نے ایک مُسدس پڑھی تھی جس کے اوّل و آخر میں یہ دو بند ہیں ؎

آئے ہیں آج کھولیں گے بازار مالوی دیں گے سبق، سودیشی کے اوتار مالوی
خادم وطن کے، قوم کے غم خوار مالوی سچے سپاہی سورما سردار مالوی
دھن دیش کی وہ چھیڑی ترانہ بدل دیا
وہ مرد ہیں جنھوں نے زمانہ بدل دیا

ایمان "دیش پریم" ہو حق اپنا دھرم ہو غیروں کے ہوں نہ دست نگر کچھ تو شرم ہو
حالت وطن کی دیکھ کے دِل اپنا نرم ہو ایشور کرے سودیشی کا بازار گرم ہو
پھیلا ہر ایک گھر میں سودیشی کا نور ہو
صدقے میں اس کے فخرِ وطن کان پور ہو

آپ کا "مارچ سانگ" (کوچ کا گیت) بھی اس زبان کا ایک دِل کش اور ترنم خیز نمونہ ہے۔ اوّل و آخر کے دو بند درجِ ذیل ہیں:۔ ؎

ہندُستان، ہندُستان!
پیارا پران، ہندُستان!
اُس کی آن اپنی آن — اُس کی شان اپنی شان
اُس کا تان اپنا تان — اُس کا گیت اپنا گان
پیاری تان پیارا پران — ہندُستان، ہندُستان!

وہ برباد، ہم برباد — وہ آباد، ہم آباد
وہ آزاد، ہم آزاد — زندہ باد، زندہ باد
ہندُستان، پیارا پران — ہندُستان، ہندُستان!

اِسی سلسلے میں ایک کبت بھی قابلِ ملاحظہ ہے:۔

سچّے عاشقوں کے مُقدّر میں سُولی لِکھی تم نہ دُکھاؤ دِل اُن کو دُکھانے دو
خم ابرو میں نہ تمھارے کبھی آنے پائے، ستم پہ ستم سنیہی اُنھیں ڈھانے دو
رو کے رہو آہیں یہ اپنی فلک سوز، اگر ستاتا ہے فلک تو ستانے دو
ہار دیا کہ جیتے رہو، آس پر جیتے رہو خونِ دل پیتے رہو، آنسو مت آنے دو

خواہ اِسے عشقیہ سمجھیے یا سیاسی، آپ کو اختیار ہے، مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ سنیہی جی نے اپنے خیالات کو کبت کا جامہ پہنا کر اُن میں ایک عجیب دِل آویزی پیدا کردی ہے۔

یوں تو آپ برسوں سے کان پور میں مقیم ہیں، مگر وطن قصبہ ہڑہا ضلع اوناؤ ہے۔ جہاں آپ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد پنڈت اوسیری لال شُکل تھے جن کا سنیہی جی کے بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا پس آپ کی پرورش و پرداخت کا سارا بار آپ کے چچازاد بھائی پنڈت لال پرشاد شکل پر پڑا۔

جنھوں نے اپنے فرض کو بڑی محبت و فراخ دِلی سے ادا کیا۔ پنڈت جی کی ابتدائی اُردو و ہندی تعلیم قصبے کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ پھر ۱۸۹۶ء میں ٹاؤن اسکول پوروہ ضلع اوناؤ سے اُردو مڈل کا امتحان اوّل نمبر میں پاس کیا۔ وہیں آپ کے دِل میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت سدا سکھ مِشر تھے، جو خود سخن سنج و سخن فہم تھے۔ انھوں نے ہونہار شاعر کے طبعی رجحان کو تاڑ لیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

مڈل پاس کرلینے پر پنڈت کو پھر مناسب ماحول مِلا۔ وہ اپنے گاؤں میں رہ کر فارسی پڑھ رہے تھے کہ اسی اثنا میں لالہ گردھاری لال شری واستو جو فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے، اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوکر گاؤں تشریف لائے۔ ان کی محبت نے سینَہی جی کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ اکتسابِ فن کے ساتھ مشقِ سخن بھی زور پکڑتی گئی۔ نوعمر شاعر نے ہندی عروض کی باقاعدہ تعلیم بھی لالہ صاحب ہی سے حاصل کی۔ یہ سب کام تین برس تک ہوتا رہا۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں منشی رام سہائے تمنّا مرحوم ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع اوناؤ نے آپ کو ورناکیولر اسکول کی ماسٹری پر مقرر کردیا۔ مرحوم بھی آپ کے بڑے قدرشناس تھے انھی نے سنہ ۱۹۰۲ء میں نارمل اسکول لکھنؤ بھیج دیا۔ وہاں سیّد ابراہیم حسین ناظم مدرّس فارسی تھے جن کی صحبت سے سینَہی جی کو مستفیض ہونے کا موقع مِلا۔ وہی ان کی اُردو نظموں کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ شعر و شاعری کا مشغلہ بھی برابر جاری رہا، اور نوجوان شاعر کے کلام میں روز بروز پختگی آتی گئی۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں نارمل اسکول کا امتحان پاس کرلینے پر آپ کو صفی پور میں سکنڈ ماسٹری کی جگہ مِلی، اور پھر مختلف مقامات میں رہنے کے بعد سنہ ۱۹۰۶ء میں اوناؤ آگئے جہاں تمنّا صاحب کے ساتھ ہر وقت کی نشست برخاست ہونے لگی۔ یہ دَور آپ کی اُردو شاعری کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا، اور اس میں خاطرخواہ ترقّی و کامیابی ہوتی گئی۔ ایک مفید نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جہاں اُردو اور ہندی میں ساتھ ساتھ لکھتے رہنے سے آپ کی زبان نے فی الجملہ ہندستانی زبان کی صورت اختیار کی وہاں آپ کی ہندی شاعری بھی اُردو سے متاثر ہوکر کھڑی بولی کا ایک لاجواب نمونہ بن گئی۔ مگر اوّل اوّل یہ بات اس وقت ظاہر ہوئی جب سنہ ۱۹۱۳ء میں کان پور سے

شری جیت گنیش شنکر ودیارتھی مرحوم کی ادارت میں ہفتہ وار ہندی 'پرتاپ' جاری ہوا اور سنیہی جی نے اپنی کھڑی بولی کی پہلی نظم "کرشک کرندن" (کسان کی فریاد) اس میں چھپنے کے لیے بھیجی۔ قابل اڈیٹر نے نظم کی قرار واقعی داد دیتے ہوئے اُسے اپنے اخبار میں جگہ دی۔ نظم بہت طویل ہو اور کتابی صورت میں بھی چھپ چکی ہو۔ اس میں کئی ابواب و بحور ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

چوری یا چھل کروں یہ میرا کام نہیں ہو — دھندا کوئی کروں گانٹھ میں دام نہیں ہو
جاؤں اب میں کہاں، کہیں وشرامؔ[1] نہیں ہو — جینا دوبھر ہوا، کبھی آرام نہیں ہو

تھی جو معافی ایک سو وہ بھی ضبط ہوتی ہو
سبھی طرح سے عقل ہائے رے خبط ہوتی ہو

کیوں ہوتی یہ دشا اگر میں کرشکؔ[2] نہ ہوتا — ہوتا میں مزدور جوتتا اور نہ بوتا
سہتا کیوں یوں مار آبرو مفت نہ کھوتا — دن بھر کرتا کام رات میں سُکھ سے سوتا

کیوں بکتی یوں ہائے مفت میں لوٹا تھالی؟
کیوں کھاتا یوں بات بات پر ہر دم گالی؟

جسے دیکھیے ہو وہ آنکھیں دکھاتا — پیادہ بھی ہو شاہ بن بن کے آتا
نہ دو کچھ تو ہو دھمکیاں دے کے جاتا — "ابھی دیکھ اس کا مزہ تو، ہو پاتا"

ہو خالی ہوا ٹینٹ ہی دیتے دیتے
چڑھے بھینٹ ہم بھینٹ ہی دیتے دیتے

زمیں داروں کے پیٹ بھرتے نہیں ہیں — یہ کھاتے ہیں اتنا اپھرتے نہیں ہیں
کسانوں پہ کیا ظلم کرتے نہیں ہیں — ابھاگے ہیں ہم ہائے مرتے نہیں ہیں

ضلع دار جی بھر ہمیں لوٹتے ہیں
نہ پٹواریوں سے بھی ہم چھوٹتے ہیں

---

[1] راحت
[2] کاشت کار

اس کے قبل تو سنیہی جی اپنی نظمیں زیادہ تر برج بھاشا یعنی پُرانی ہندی میں لکھتے تھے، جو اُسی قسم کے ہندی رسالوں میں شائع بھی ہُوا کرتی تھیں۔

'پرتاپ' میں اور بھی وقتی نظمیں چھپیں اور اُنھیں دیکھ کر رفتہ رفتہ پنڈت مہابیر پرشاد دْویدی کی توجّہ اُدھر مائل ہوئی جو اُس وقت انڈین پریس الہ آباد کے مشہور ہندی رسالے 'سرسوتی' کے ایڈیٹر تھے اور پُرانی ہندی کو نئی ہندی یا کھڑی بولی میں تبدیل کرنے کے زبردست حامی۔ انھوں نے سنیہی جی سے 'سرسوتی' کے لیے بھی نظمیں طلب کیں اور اگست ۱۹۱۴ء میں ان کی پہلی نظم جہیز کی مذمّت پر 'سرسوتی' میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی۔ پھر تو یہ سلسلہ جاری ہوگیا، اور اس کے لیے شاعر کو اڈیٹر صاحب سے معقول معاوضہ بھی ملتا رہا۔ مختصر یہ کہ اس طرح 'پرتاپ' اور 'سرسوتی' کے ذریعے سنیہی جی جدید ہندی شعرا کی صف میں آگئے اور آپ کے وہ خیالات تیزی کے ساتھ نظموں کی شکل میں نمایاں ہونے لگے جو ابتدا میں سالہا سال تک ہندی اور اُردو کے مخلوط سانچے میں ڈھالے جا چکے تھے۔ اشاعت کے ساتھ شہرت و عزّت میں اضافہ ہوتا گیا، جس نے بالآخر آپ کو اُستادی کی مسند پر بھی لا بٹھایا۔ اب پنڈت انوپ شرما ایم۔اے۔ ال۔ٹی۔ اور ہتیشی جی جیسے نامور ہندی شعرا کو آپ سے فخرِ تلمذ حاصل ہے۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ پُرانی ہندی کی جس بسیط فضا میں آپ کی نشو و نما ہوئی تھی اس کا اثر دِل سے بالکل زائل نہیں ہوگیا۔ چناں چہ آپ اب بھی کبھی کبھی برج بھاشا میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ایک عشقیہ کبت ملاحظہ ہو ؎

سنکِت رہیے سے پیا انکِت سندیسو وارے آنسو موتی آس پُوری انکھین کی
نیلم اَدھر لال ہوے کے دَمکن لاگے کھینچ گئی مدھو ریکھا مدھر ہنسن کی
شیام گھن[1] سُرت سُرس برسن لاگی آئی ہاتھ تھاتھی سی سنیہی پریم پن کی
ماتھ سوں چھواتی ہیراتی لاے لاے چھاتی پاتی آگمن[2] کی بجھاتی آگ من کی

ہجراں نصیب سکھی کو اپنے پیارے کا خط ملتا ہے، جس میں آمد کی خبر درج ہے۔ اُسے پاکر سکھی کی جو حالت ہوتی ہے

[1] "شیام گھن" کے لغوی معنی "کالی گھٹا" مگر یہی اُلٹ کر پڑھنے سے گھنشیام ہوجاتا ہے جو کرشن جی کا اصطلاحی نام ہے۔ جن کا گوپیوں سے عشق ہونا مشہور بات ہے۔ اِسی عشق کو لے کر قدیم ہندی شعرا نے خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ سحر'

[2] آمد

اُسے شاعر نے شاعرانہ طرز پر بیان کرتے ہوئے دِل کے مختلف جذبات کا ایک دل کش مرقع پیش کر دیا ہے،
جسے محاکات کا مجسمہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہتا ہے کہ "سکھی ڈرتے ہوئے دِل کے ساتھ اپنے پیارے کے تحریری
پیغام کو پڑھتی ہے اور اُس پر آنسو کے موتی نچھاور کرتی ہے (کیوں کہ) اُس کی آس پوری ہو جاتی ہے۔ اُس
کے نیلے ہونٹ سُرخ ہو کر چمکنے لگتے ہیں اور اُن پر شیریں تبسم کا خوش نما خط کھنچ جاتا ہے۔ گھنشیام کی
یاد سُندر رس بن کر برسنے لگتی ہے اور اسے سینیہی محبت کی دولت سی ہاتھ لگ جاتی ہے۔ (خط) کو ماتھے سے
لگاتی ہوئی پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔ (گویا اس طرح وہ) خطِ دل کی آگ کو بجھا رہا ہے۔ [اگمن اور آگ من
میں صنعتِ تجنیسِ تام ہے۔] اضطراب و مسرت، ادب و محبت، حیا اور تسکین کا ایک نقشہ سا آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے"

سینیہی جی نے ۱۹۲۱ء میں تحریکِ ترکِ موالات سے متاثر ہو کر ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ اُس وقت آپ
ٹاؤن اسکول اُوناؤ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ کان پور کے مشہور روزنامہ 'ورتمان' کی ملکیت میں آپ پنڈت رماشنکر اوستھی
کے ساتھ اُسی وقت شریک ہو گئے تھے، جب پنڈت جی نے اخبار مذکور کا اجرا کیا تھا۔ اس کے علاوہ کان پور کے
مشہور کانگریسی کارکن سیٹھ پھول چند آپ کے دیرینہ قدر دانوں میں ہیں۔ بہرحال 'ورتمان' کی شرکت اور سیٹھ جی کے پیہم اصرار
نے آپ کو ملازمت چھوڑتے ہی کان پور جانے پر مجبور کیا، اور تب سے آپ کا قیام کان پور میں رہتا ہے۔ یہ سکونت اس قدر
مستقل ہو گئی ہے کہ ہم بلا خوف تردید آپ کا شمار کان پور ہی کے مشہور ہندی شاعروں میں کر سکتے ہیں۔ وہاں رہتے ہوئے
آپ صدہا "کوی سمیلنوں" (ہندی مشاعروں) کے صدر ہوئے، اور آپ کی ادبی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔
۱۹۲۸ء سے آپ "سوکوی" نامی ہندی ماہ وار رسالہ بھی نکال رہے ہیں۔ جو اسی نام کے پریس سے شائع بھی ہوتا
ہے۔ رسالے کا تقریباً کُل حصہ ہندی نظموں ہی کے لیے وقف ہے اور اس میں بہ قول سینیہی جی مبتدی اور منتہی دونوں
کے کلام کی گنجایش ہے۔ اس کے علاوہ رسالۂ مذکورہ میں ہندی کے ساتھ اُردو نظمیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی
ہیں، البتہ اشاعت تو ہندی رسم الخط ہی میں ہوا کرتی ہے۔ آپ نئے شعرا کی نظمیں اشاعت کے قبل درست بھی
کر دیتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی پر ہر طرح آمادہ رہتے ہیں۔ آپ کا اخلاق بہت قابلِ تعریف ہے۔ مزاج اور وضع
میں اس قدر سادگی ہے کہ گفتگو کرنے والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہندی کے بڑے شاعر سے باتیں کر رہا ہے۔

آپ کی ذہانت و طباعی کا کیا کہنا۔ نظم لکھنے کے لیے زیادہ وقت یا تیاری کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ تیاری
اور لکھنا، یہ دونوں کام ایک ساتھ ہی ہوتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے رسالے کے مرتب کرنے کی ذمے داری

رکھتے ہوئے بھی مُلک کے دیگر رسالوں کو اپنا کلام برابر بھیجتے رہتے ہیں۔ آپ کا رسالہ بہ اعتبارِ ضخامت بہت بڑا نہیں، پھر بھی چھپنے والی نظموں کی اصلاح کافی وقت لے لیتی ہے۔

اب ہم اخیر میں آپ کے جدید ہندی کلام کا بھی ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ بھگت کی ابھلاشا[1] کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

تو ہی مہاسِندھ تلیہ[2] تو مَیں ایک بوند سماں[3] ہوں
تو ہی منوہر گیت تو میں ایک سُندر تان ہوں

تو ہی سُکھد رِت راج تو مَیں ایک چھوٹا پھول ہوں
تو ہی اگر دکشن پَوَن تو مَیں کسم کی دھول ہوں

تو ہی اگر سروِیش[4] تو مَیں ایک تیرا داس ہوں
تجھ کو نہیں مَیں بھولتا ہوں، دُور ہوں یا پاس ہوں

تو جانتا من کی دشا، رکھتا نہ تجھ سے بیچ[5] ہوں
جو کچھ کہ ہوں تیرا کیا ہوں اُچ[6] ہوں یا نیچ ہوں

اپنا[7] مجھے اپنا سمجھ تپنا نہ اب مجھ کو پڑے
تج کر تجھے یہ داس جاکر دوار[8] اب کس کے اڑے؟

تجھ میں سما جا اس طرح تن پران کا جو طَور ہے
جس میں نہ یہ کوئی کہے مَیں اور ہوں تو اور ہے

شرح :-

پہلا شعر۔ (اے ایشور!) تو سمندر اور مَیں ایک قطرہ ہوں، تو ایک دل کش گیت اور مَیں اس کی ایک سُندر تان ہوں۔

دوسرا شعر۔ تو سکھ دینے والا موسموں کا راجا (بسنت) اور مَیں ایک چھوٹا پھول ہوں، تو اگر بادِ جنوب ہے تو مَیں زرِ گُل۔

دونوں اشعار میں شاعر نے ہمہ اوست کے نظریے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایشور سے اپنا تعلق ظاہر کیا ہے اور بڑی شاعرانہ حقیقت و لطافت کے ساتھ۔ ہر مصرع میں تشبیہ کی غرض سے دو ایسی چیزیں لی گئی ہیں جو خدا اور رُوح کے لحاظ سے بڑی اور چھوٹی ہوکر بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ساتھ ہی اسی لحاظ سے اپنا اپنا جلال یا جمال بھی رکھتی ہیں ——— آخری شعر کو تو ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کا ترجمہ ہی کہنا چاہیے جو بڑی صفائی اور سادگی سے کیا گیا ہے۔

(۱) خواہش۔ (۲) سمندر۔ (۳) سا۔ (۴) سب کا مالک۔ (۵) علاحدگی (۶) اونچا۔ (۷) اپنا بنالے۔ (۸) دروازہ۔

ہمارے گانو کی مثلیں

(از جناب چودھری رحم علی الہاشمی صاحب)

ا*ا

اسلامی اور ہندی تمدن کے ہندستان میں اختلاط پر بعض عالمانہ مقالات و تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس بحث پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہی خاص کر ملک کے اندرونی حصوں اور دور افتادہ دیہاتوں میں اسلامی تمدن کے اثرات جو آج پائے جاتے ہیں اُن پر اس وقت تک بہت کم لکھا گیا ہی۔ شہریوں کے رہن سہن بول چال اور طرزِ معاشرت پر اسلامی تمدن کے جو اثرات پڑے اور ذات پات کی بندھنوں کو ان اثرات سے جو جھٹکا لگا وہ متعصب لوگوں کی تمام تر کوشش مغائرت کے باوجود دُنیا کے پیشِ نظر ہی۔ لیکن وہ مقامات جہاں آج ڈیڑھ سو سال کی انگریزی حکومت کے باوجود مغربی تمدن کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پایا جاتا اور جو موجودہ دورِ ترقی کی رسل و رسائل کی سہولتوں اور آسائشوں سے بھی بہت دور بستے ہیں اُن کے حالات گُم نامی سے نکال کر منظرِ عام پر لائے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ اسلامی تمدن کے اثرات کتنے دور رس عمیق اور دیرپا ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمان بھی ہندی تمدن اور رسم و رواج سے بہت متاثر ہوئے ہیں جن کا ذکر بہت ہو چکا ہی۔

اس سلسلے میں آج میں ایک ایسے گانو کے کچھ حالات بیان کرتا ہوں جس سے میرا قریبی تعلق ہی۔ یہ گانو جس کا نام تھلوارہ ہی ضلع بارہ بنکی کی تحصیل حیدرگڑھ میں ضلع کے صدر مقام سے ۲۴ میل اور لکھنؤ سے ۴۰ میل کے فاصلے پر دریائے گومتی کے قریب واقع ہی۔ سب سے قریب ریلوے اسٹیشن یہاں کا دریاباد ہی جو اس موضع سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہی۔ کچھ دِن ہوے ای۔آئی۔ار کی ایک شاخ لکھنؤ سلطان پور ریلوے نکالی گئی تھی جو حیدرگڑھ ہوتی ہوئی گئی تھی اور اس سے کچھ دنوں تک یہاں کے لوگوں کو ریل سے نسبتہً کچھ قُرب حاصل ہوگیا تھا لیکن موجودہ جنگ میں اس کی پٹریاں اُکھاڑ لی گئیں اور اب تھلوارہ تمدنی آسایش کی اُس منزل سے پھر اُتنا ہی دور ہو گیا جتنا پہلے تھا۔

قبل ازیں کہ اس دوُر افتادہ علاقے میں اسلامی تمدّن کے نفوذ کا حال بیان کیا جائے مختصر تاریخی پس منظر پیش کرنے کی ضرورت ہو تاکہ اس نفوذ کے اسباب بہ آسانی سمجھ میں آجائیں۔ یہ موضع چودھریانِ سلیحہ کی تعلقےداری میں واقع ہو جن کے اجداد سیّد سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے قرابت دار تھے اور ان کے ساتھ ہندُستان آئے تھے۔ اُس وقت اس علاقے میں بھر قوم کی حکومت تھی جنھیں مسخر کرکے انھوں نے یہاں اسلامی حکومت قائم کی اور قصبہ سلیمان پور آباد کرکے اُسے اپنا صدر مقام بنایا۔ غدر ۵۷ء سے کچھ پہلے اس خاندان کے مورثِ اعلا چودھری حسین بخش چار بھائی تھے جن میں سب سے چھوٹے چودھری اعظم علی (راقم الحرُوف کے دادا) جو انتظامی امُور میں سب سے زیادہ ہوشیار تھے تعلقے کے منتظم تھے مگر بعض خاندانی مناقشات کی بنا پر تعلقے کے انتظام سے دست بردار ہوگئے اور تھلوارہ میں آکر مقیم ہوگئے۔ یہاں ٹھاکروں کا غلبہ تھا جنھیں موصوُف نے اپنی شجاعت اور حُسنِ تدبیر سے مسخر کرلیا۔ اور ایک مزرعہ اپنے چھوٹے لڑکے (راقم الحروف کے والد ماجد) کے نام پر پوُرہ چودھری ناظر علی آباد کیا جس میں یوسف زئی پٹھان اور بعض دیگر مسلمان اور ہندو قوم کے لوگ بستے ہیں۔ چودھری اعظم علی کی اولاد اب بھی تھلوارہ میں آباد ہو اور بہ حیثیت گزارے دار ماتحت دار کے کچھ اراضی پر قابض ہو۔

چودھری اعظم علی صاحب جب تعلقے کے انتظام سے دست بردار ہوکر تھلوارہ میں مقیم ہوئے تو ان کو شروع شروع میں بڑی مشکلات سے سابقہ پڑا اور قرب و جوار کے ٹھاکروں سے جن کا اس جوار میں غلبہ تھا آئے دن ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں جن کی وجہ سے چودھری صاحب موصوف کو چالیس مسلح جوانوں کا ایک دستہ ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھنا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی شجاعت۔ سخاوت اور حُسنِ تدبیر سے تمام مشکلات پر قابوُ حاصل کرلیا اور اس خطّے کے باشندوں کو اس طرح مسخر کر لیا کہ یہ جوار کے ٹھاکروں کی رعایا کو ان الفاظ میں طعنے دینے لگے:۔

"تمرے گانو کے ٹھاکر تماکوُ ٹل ٹل کھائیں، تھلوارہ کے چودھری ڈھولن پان چبائیں"
(تمھارے)　(تماکو)　(ڈھولیوں)

اس سیاسی تسلط کا نتیجہ قدرتی طور پر تمدّنی ماحول پر بھی پڑا اور چودھری اعظم علی صاحب چوں کہ تھلوارہ میں مستقل سکونت کے خیال سے آئے تھے اس لیے جنگی فتوحات کی تکمیل کے بعد انھوں نے باشندوں سے برادرانہ

تعلقات بڑھانے شروع کیے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام سیاسی اور فرقے وار مناقشات کے باوجود جو تقریباً سارے ہندستان پر مسلط ہیں، اس چھوٹے سے خطّے کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہیں اور چودھری اعظم علی کی اولاد سے آج بھی منھ بولی رشتے داریاں ہندو آبادی کے ساتھ قائم ہیں۔

سب سے پہلے اس سلسلے میں چند ایسے الفاظ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس خطّے کے باشندوں میں رائج ہیں اور ان کے روزمرہ میں شامل ہیں۔ ان سے عربی فارسی زبان اور اسلامی تمدن کا اثر صاف نمایاں ہے:۔

الفاظ	معنی	قیاسی ماخذ
باٹ پری	ذِلّت کی بات ہوئی	باط ۔ تحقیر کی
مُرہا	شریر	مُرح ۔ حد سے تجاوز کیا
مکّر	فریب	مکر
رب	رب	رب
باگ	باغ	باغ
مرجات	حیثیت ۔ زمینداری	مزجاۃ ۔ حیثیت
مسال	مشعل	مشعل
مہرارُو	عورت	ماہ رُو ۔ مہر رُو
گریب	غریب	غریب
برکت	برکت	برکت
جورے	بیوی	زوج
جات	فرقہ	ذات (ہندی جاتی)
نوج	اللہ نہ کرے	نعوذ باللہ
پھجہت	ذلیل کرنا	فضیحت
بستر	کپڑا ۔ پوشش	ستر

الفاظ	معنی	قیاسی ماخذ
کُدرت	قدرت	قدرت
کسائی	قصائی	قصائی
ہُسیار	ہُشیار	ہُشیار
کریم	مہربان	کریم

یہ چند الفاظ میں نے یونہی سرسری طور پر لے کر لکھ دیے ہیں، لیکن اگر ذرا تحقیق اور کوشش کی جائے تو ایسے بہت سے الفاظ ملیں گے جو اس خطّے کے لوگ روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور وہ فارسی یا عربی سے ماخوذ ہیں یا اسلامی تمدّن سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ چوں کہ یہاں کی تمام زبان تقریباً وہی ہے جو اودھ کے دیگر اضلاع کے دیہاتوں میں بھی بولی جاتی ہے اس لیے اس مضمون میں جو ایک خاص خطّے کے زبان و تمدّن سے متعلق ہے، زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب میں چند مثلیں پیش کرتا ہوں جو اس خطّے میں عموماً رائج ہیں، اور جن میں سے بعض تو جزواً فارسی ہی میں ہیں۔[ع] ان مثلوں سے اُس ذہانت اور روشنی کا بھی اندازہ ہوسکے گا جو اس خطّے میں اسلامی تمدّن ہی کی رہینِ منت ہیں:-

۱۔ ادھ جل گگری (گھڑا) چھلکت جائے

یعنی جو برتن پورا نہ بھرا ہوگا وہ چھلکتا جائے گا۔ مطلب یہ کہ ادھورا علم یا نیم دولتی چھچھورا بنا دیتی ہے۔

۲۔ ایسک (عشق) نہ جانے جات (ذات) کوجات (بے ذات)   بھوکھ نہ جانے جھوٹا بھات (چاول)
نیند نہ جانے ٹوٹی کھاٹ (چارپائی)   پیاس نہ جانے دھوبی گھاٹ (میلی جگہ کا پانی)

یعنی عشق ذات پات کی قید کا پابند نہیں۔ بھوکھ اچھے بُرے کھانے میں امتیاز نہیں کرتی۔ نیند ٹوٹی چارپائی پر بھی آجاتی ہے اور پیاس لگی ہو تو میلی جگہ کا پانی بھی پی لیا جاتا ہے۔

ع۔ ان مثلوں کے جمع کرنے میں حکیم چودھری افضل علی صاحب (برادرِ راقم الحروف) نے جو کوشش کی وہ مستحقِ تشکر ہے۔

۳۔ اہیر کے ساتھ گڈریے پاتا بھیڑی کھائیں سیار
چرواہا متوالا گیدڑ
یعنی گوالے کے ساتھ چرواہا بھی بدمستیوں میں لگ گیا تو اس کے گلّے کی بھیڑیں گیدڑ کھا جائیں گے۔

۴۔ آم کے آم گٹھلی کے دام۔ یہ مثل عام ہے لیکن اس کی ساخت ہندی سے بالکل نہیں ملتی۔

۵۔ ایک داڑھی کوا لوکا دن ایک داڑھی بھبھو ایک داڑھی کھلک بھچبہت ایک داڑھی ٹھڈھو۔
خلق فضیحت
داڑھیوں کی چار قسمیں یعنی بے انداز لمبی جس میں کوّا چھپ جائے، بے انداز گھنی، منتشر اور بے ڈول اور چھدّی۔

۶۔ ایک تو بونی بندریا دوجے کان اُترے۔
دوسرے کٹے
یعنی بدصورتی کی حد ہوگئی۔

۷۔ ایک تو کڑوا کریلا دوجے چڑھا نیم
دوسرے
یہ مثل عام ہے مگر اس کے مقدم و موخر سے مماثلت دکھانے کے لیے اسے درج کیا گیا۔

۸۔ ایک تو باگھ دوجے بندوک باندھے۔
شیر دوسرے بندوق
یعنی ایک تو آدمی طاقت ور اور پھر مسلح۔ اس کا مقابلہ کون کرے۔

۹۔ بولے کہوں کان منّائے کاٹے کہوں گوڑ کھجوائے
کہیں منمنائے کہیں پیر کھجلائے
یہ مچھّر کے متعلق مثل ہے کہ کہیں بھی وہ بولے مگر معلوم ہوگا کہ کان میں منمنا رہا ہے اور کہیں بھی کاٹے پیر میں کھجلی معلوم ہوگی۔

۱۰۔ بھوکے بیرا گھانے گنّا۔
بعد غذا
یعنی بیر بھوک کے وقت کھانے چاہییں اور گنّا غذا کے بعد۔

۱۱۔ بھوجن کو بھوجن اُپاسے بھلا
غذا ناقص فاقہ
سنگت کو سنگت اکیلے بھلا
صحبت بری
بستر کو لستر سے ننگے بھلا
کپڑا خراب

یعنی ناقص غذا کھانے سے فاقہ کرنا بہتر ہے، بُری صحبت میں بیٹھنے سے اکیلا رہنا بہتر ہے، خراب کپڑا پہننے سے ننگا رہنا بہتر ہے۔

۱۲۔ باپت پوت پراپت گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑے تھوڑا
باپ سے لڑکا ماں سے

۱۳۔ بوڑھی بلّی مکر کریں نیچے کے دیدے اوُپر کریں
آنکھیں

یعنی بڑھاپے کے نخرے اور صورت بگاڑ دیتے ہیں۔

۱۴۔ بابا کی بھینسی بھتیجے کا توند۔۔ یعنی عزیز کی جایداد پر پھُولنا۔

۱۵۔ پاپ بڑیڑی چڑھ پکارت۔ یعنی گناہ کی بات مشتہر ہوکر رہتی ہے۔
چھت پکارے گا

۱۶۔ پانڈے جی پچھتائیں گے۔ پھر چنے کی روٹی کھائیں گے۔ یعنی چار ناچار یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔

۱۷۔ پر کا گھوڑا بھوسیلے ٹھاڑھ۔
کل کھڑا

۱۸۔ پڑھیں پھارسی بیچیں تیل یہ دیکھو کدرت کے کھیل۔
فارسی قدرت کرشمے

۱۹۔ تپے مرگسرا بلکیں چار بن بالک اور پونچھ اوچھار
تڑپیں جنگل بچّہ مور بھینسیں

شروع برسات کے نچھتر مرگسرا میں جو شدید گرمی ہوتی ہے اُس میں جنگل، بچّہ، مور اور بھینس کو سب سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔

۲۰۔ تن پہ نہیں لتّا پان کھائیں البتّا۔ یعنی مفلسی میں شوقینی اور بھی نازیب ہے۔
کپڑا البتّہ

۲۱۔ تیرہ کاتک تین اساڑھ۔ ان دِنوں میں ہل نہ چلانا چاہیے۔

۲۲۔ تناتنی، بگدابگدی، دگادگی۔ لڑائی کے تین درجے یعنی چشمک، تند گفتگو اور پھر دست و گریباں ہوجانا۔
سخت کلامی مارپیٹ

۲۳۔ جِکے متر بھانٹ بھکاری دہکی باٹ گوسیاں پاری یعنی جو ذلیل لوگوں سے دوستی کرے گا وہ خود بھی ذلیل ہوجائے گا۔
جن کے دوست اُسے خدا ہی نے ذلیل کر دیا

۲۴- جب بھوئیں لوٹ چلے پُروائی تب جانو برکھا رُت آئی ۔
زمین گیر / برشگال موسم
یعنی جب زمین سے لپٹتی ہوئی پُروا ہَوا چلنے لگے تو سمجھ لو کہ برسات کا موسم آگیا۔

۲۵- جوَن گلی گئے دھان دھنا وہی گلی گئے ماس چنا
جس ماہ ماش
یعنی جس طرح دھان کی فصل تباہ ہوئی اسی طرح ماش اور چنے کی فصل بھی گئی ۔یعنی مصیبت تنہا نہیں آتی ۔

۲۶- جیسی لوکی ویسے کدوا ہردو برادر الٹی کا پلوا ۔
بے ڈھنگے
اس مثل میں ہردو برادر کے خالص فارسی الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں اور یہ تھلوارہ کے قرب و جوار میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔

۲۷- جہاں چار کسائی ہواں کہاں کبیر ساہی ۔ سنگ دلوں کے مجمع میں نیکی کی بات نہیں سُنی جاتی ۔
قصائی وہاں شاہی

۲۸- جو گرجا سو برسا نہیں ۔ لفظی تغیّر کے ساتھ یہ مثل عام ہے۔

۲۹- جھنکا نکھت سوکھ گا اوسر دودھ بھات مان پڑگا موسر
خشک ہوا پھتر گیا کھیت چاول میں پڑگیا کیڑا
یعنی بارش کے موسم میں پانی نہیں برسا جس سے کھیتی خشک ہوگئی اور گھر میں جو کھانا رکھا تھا وہ بھی خراب ہوگیا۔

۳۰- چمڑی جائے دمڑی نہ جائے ۔ یعنی کھال کھنچ جائے مگر پیسہ پاس سے نہ جائے ۔
کھال پیسہ

۳۱- چرواہن مان چھونکوا ہرواہن مان موٹکوا
یعنی مویشی چرانے کے کام پر ہلکا پھلکا آدمی ہونا چاہیے اور ہل چلانے کے لیے موٹا تازہ ۔

۳۲- چور سے کہیں چوری کر ساہ سے کہیں ہُسیار۔ تبدیلِ الفاظ کے ساتھ یہ مثل عام ہے۔
شاہ ہُشیار

۳۳- دن کا بدّر رات نبدّر پردیا چلے لپّر لپّر یا ہے جھورا کی نسانی ۔
بدلی صاف پروا تیز تیز خشک سالی
یعنی جب دن کو بدلی رہے اور رات کو مطلع صاف رہے اور پُروا ہَوا تیز تیز چلتی رہے تو یہ خشک سالی کی علامت ہے۔

۳۴- ڈھول کے بھیتر پول ۔ تقریبًا انھی الفاظ کے ساتھ یہ مثل عام ہے۔صرف درمیانی لفظ مقامی بولی کے
اندر
لحاظ سے بدلتا ہے۔

۳۵- ڈھول پر ڈھول بھوٹی روٹی کی کانکڑا اوٹھو نہ لوٹی۔یعنی بجاتے بجاتے یکے بعد دیگرے کئی ڈھولکیں

پھٹ گئیں مگر کھانے کو ایک لُقمہ نہ مِلا ۔

۳۶ ۔ ڈیڑھ بگائن میاں باگ تلے ۔ یعنی بگائن کے ڈیڑھ درخت کے پاس بیٹھ کر میاں اُسے باغ کہیں۔
باغ

۳۷ ۔ رسری جل گئی اینٹھن نہ گئی ۔ یعنی ساری گتیں بن جانے پر بھی تکبّر نہ گیا ۔ تبدیلِ الفاظ کے ساتھ
رسّی
یہ مثل عام ہے ۔

۳۸ ۔ سات پانچ کی لاٹھی ایک جنے کا بوجھ ۔ یعنی ہر آدمی ایک لکڑی لے لے تو چھڑی کا کام دے گی
آدمی
لیکن کئی آدمیوں کی چھڑیاں یک جا کردی جائیں تو ایک آدمی کا بوجھ ہوجائے گا ۔ مقصد یہ کہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے سے کام ہلکا ہوجاتا ہے ۔

۳۹ ۔ سنگت ہی سے گن آوے اور سنگت ہی سے جائے ۔ بانس پھانس مصری ایک بھاؤ بکائے
صحبت ہُنر
یعنی صحبت ہی سے ہُنر آتا ہے اور صحبت ہی سے بے ہُنری ۔ بانس کی تیلیاں جن پر مصری چڑھی ہوتی ہے مصری ہی کے بھاؤ بکتی ہیں ۔

سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالع ترا طالع کند

۴۰ ۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی کا بولے جی ماں بہتّر چھید
کیا جس میں سوراخ

۴۱ ۔ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا ۔ یعنی بے بات کی جھک جھک ۔
دھاگا روئی پارچہ باف جھگڑا تکرار

۴۲ ۔ سوکھونا سوکھے جائے کوا رٹے جائے ۔

یعنی کوّا چیختا ہی رہتا ہے اور جو چیز دھوپ میں رکھی جائے وہ سوکھتی رہتی ہے ۔

۴۳ ۔ سنور کی ٹوٹی جوے کاتک کا ٹوٹا بیل کبھی نہ پنپے ۔ یعنی زچگی کے دِنوں میں جو عورت کم زور
کم زور عورت قوت پائے
ہوجائے اور کاتک کے مہینے میں جو بیل کم زور ہوجائے وہ کبھی تن درست و طاقت ور نہ ہوسکیں گے ۔

۴۴ ۔ سیر سیر گھی ملیٹی کھائیں لڑے بیر تلائے جائیں ۔ یعنی ملیٹی کھانا تو خوب مرغن کھائیں مگر جب
لڑنے کے وقت رفع حاجت

لڑائی کا موقع آئے تو بہانہ کرکے کترا جائیں۔

۴۵۔ سترکھیل بساون کھیلے جن کا سکھاویں چندا۔ یعنی سیکھے سکھائے ہوئے لوگوں کو نو آموز کیا سکھائے گا۔

۴۶۔ سر چڑھی ڈومنی گاوے تال بے تال

۴۷۔ سونا جانے کَسے مَنُس جانے بسے۔ یعنی سونے کا عیب و ہنر کسوٹی پر معلوم ہوتا ہے اور آدمی کا عیب و ہنر ساتھ رہنے سہنے سے۔

۴۸۔ کھری بات کہیں ساؤلا کھان سب کے من سے اُترے رہیں۔
سعداللہ خاں

۴۹۔ کریا بانبھن گوریا سود کنجا ترک بھورا رجپوت۔ یعنی یہ لوگ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔
کالا برہمن گورا مسلمان

۵۰۔ کہاں راجا راؤ کہاں گجوا باری۔ یعنی دونوں کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۵۱۔ کھاؤں گا گھی سے نہیں جاؤں گا جی سے۔ یعنی چاہے جان جائے یا رہے مرغن کھائے بغیر نہ رہوں گا۔

۵۲۔ کوئی جلئے سڑک سڑک بندہ جائے بے دھڑک۔ بندے کا لفظ اس مثل میں قابلِ غور ہے جو خالص فارسی لفظ ہے۔

۵۳۔ لمبا گھونگھٹ چاپے پاؤ گھونگھٹ بھیتر بڑا اُپاؤ۔ یعنی شرم و حیا کی نمائش ہی مکر و فریب کا پتا دیتی ہے۔
دبیئے اندر فریب

۵۴۔ کرکھا چھوڑ تما سے جلے ناہک چوٹ مُلاہا کھاے
ناحق

۵۵۔ گا وہ تال جی ماں پڑ گئی کائی گا وہ کنواں جی پر لاگ اتھائی
گیا جس میں جس پر لگی

گئی وہ بہور جو پر گھر جائی گئی وہ جائی جو دانت بائی
بیوی پرائے لڑکی نکالے

یعنی یہ چیزیں بے کار ہو گئیں۔

۵۶۔ لڑکوری کا لڑکا نہ پکڑے اور ہرواہے کا ہل۔ یعنی ان باتوں سے لڑائی ہو جائے گی۔
لڑکے والی

۵۷۔ مندھا مرد دورکتی جوئے وی گھر برکت کبھو نہ ہوئے
مدھم

یعنی جس گھر میں مرد کی طبیعت مدھم ہو اور عورت بدکلام ہو اُس میں کبھی برکت نہ ہوگی۔

۵۸۔ مگھا کے برسے ماتا کے پرسے

یعنی مگھا نچھتر برستا ہے تو خوب کھُل کر برستا ہے اور ماں کھانا دیتی ہے تو جی کھول کر دیتی ہے۔

۵۹۔ ماگھ پوس کی بادری اور کنوارا گھام جو سہے یہ دونوں وہ کرے پرایا کام
بدلی کنوار کی دھوپ دوسرے کا

یعنی دوسرے کی ملازمت کرنے کے لیے گرم و سرد برداشت کرنے کی قوت ہونی چاہیے۔ ماگھ پوس کی بدلی اور کنوار کی دھوپ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

۶۰۔ نرہے گانو اونٹ آوا لوگ کہن پرمیسر آوا
دورافتادہ آیا لوگوں نے کہا پرمیشور آیا

۶۱۔ نیمرے کی جورے سب کی سرہج۔ یعنی کم زور آدمی کی عورت سے سبھی مذاق کرتے ہیں۔

۶۲۔ نئی نادن بانس کا نہنا۔ یعنی نوآموز کاری گر کے اوزار بھی بے ڈول اور کُند ہوتے ہیں۔
ناخون گیر

۶۳۔ پتہ کھڑکا بندہ سٹرکا۔ یعنی خطرے کا زرا بھی اشارہ ملنے پر میں بھاگ جاؤں گا۔
کھسکا

۶۴۔ ہاتھی گھوڑا پالکی جو کنھیّا لال کی۔

بارات کی دھوم دھام کے موقع پر بولتے ہیں۔ تین چیزیں اس میں خاص کر قابلِ غور ہیں۔ ایک تو قافیے و ردیف کا اہتمام بالکل فارسی طرز کا اور دوسرے "پالکی" جو مسلمانوں کے تمدّن کی خصوصیت ہے، تیسرے پھر اس کے ساتھ کنھیّالال کی جے، یعنی ہندو مسلم تمدّنی امتزاج کی جے۔

بہت سی مثلیں جو اس علاقے کے علاوہ اور جگہ بھی بولی جاتی ہیں اور اُردو زبان کے محاوروں میں داخل ہوگئی ہیں وہ میں نے اس سلسلے میں درج نہیں کی ہیں مثلاً سونے پر سہاگہ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی۔ ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا۔ ہونہار بروا کے چکنے پات۔ سر منڈاتے اولے پڑے وغیرہ وغیرہ بہت سی مثلیں جو خالص مقامی حیثیت کی ہیں وہ بھی نظر انداز کردی گئیں اس لیے کہ ان سے متعلق کچھ مقامی واقعات بھی ہیں جن کی تفصیل بہت طویل ہوجاتی۔ تاہم جتنی مثالیں اوپر دی گئی ہیں اُن سے بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ زبان اور خیالات میں یہاں کے لوگ کس حد تک اسلامی تمدّن سے متاثر ہوئے لیکن یہ اثر محض زبان اور خیالات تک محدود نہیں ہے بلکہ اُس نے رہن سہن اور رسم و رواج میں

بھی نفوذ کیا ہو۔ مثلاً شادی کے بُلاوے کے ساتھ دو عدد پان اور دو پیسے زمیں دار کو بھیجنا اور شادی پر بکرا اور دو رُپے کی نذر دینا، جس کے عوض میں زمیں دار انھیں انعام اکرام سے خوش کرتا ہو اور رسمی ضروریات و اخراجات میں مدد بھی دیتا ہو۔

بعض رسموں نے مسلمانوں کی معاشرت سے مخلوط ہوکر بہت ہی مذموم صورت بھی اختیار کرلی ہو جس کی اصلاح مسلمان زمیں دار اپنی مذہبی رواداری کے اصول کے پیشِ نظر نہیں کرسکے اور ہندو اصلاحی تحریکات کا چرچا زیادہ تر ایسے ہی شہروں تک محدود ہو جو کسی حکومتِ صوبہ کے صدر مقام ہیں۔ ان کا دُور افتادہ دیہاتوں تک پہنچنا کہاں خیال میں آسکتا ہو۔ ایک اہم رواج جو فوری توجّہ کا محتاج ہو وہ یہ ہو کہ ہندوؤں میں عقدِ بیوگان ممنوع ہو لیکن مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس کی یہ شکل پیدا کی گئی ہو کہ بیوہ عورت بلا عقد کے کسی مرد کے ساتھ رہنے سہنے لگے اور اس ارتباط سے جو اولاد پیدا ہو وہ مثل جائز اولاد کے متصور ہوتی ہو۔ عقدِ بیوگان کے متعلق ہندو مذہبی رواج میں جو قانونی ترمیم ہوئی ہو اس سے دُور افتادہ مواضع کے باشندوں کو روشناس کرنے کی ضرورت ہو۔

تیرھویں صدی کا اُردو ادب

(قسط سوم)

(جناب عقیل احمد صاحب جعفری ، خیر آبادی)

-۱۰*۱-

[ریاض الاخبار گورکھ پور کے فکاہی ضمیمے " فتنہ " کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندستان کے اس دور کی یادگار تھا جب ہمارا ہر اختلاف " نزاعِ لفظی " کے حدود میں تھا ۔

" فتنہ " بہ الفاظِ دیگر حضرتِ ریاض کی سیرت کا ایک آئینہ تھا ۔ وہ ایک رند کی طرح باہمہ و بےہمہ تھا ۔ اس کا دِل سب سے صاف تھا اس کو محبّت سب سے تھی مگر وہ منھ پر آئی ہوئی بات کہے بغیر نہیں رہتا تھا ۔ دکھتی ہوئی رگ پکڑے بغیر نہیں چھوڑتا تھا ۔

وہ سر سیّد ، حالی وغیرہ کی دِل سے قدر کرتا تھا مگر ان کی لغزشوں پر ٹوکنا بھی اپنا فرض سمجھتا تھا اس کی پالیسی صلحِ کُل تھی مگر مذہب ، سیاسیات اور ادب میں بے راہ روی اس کی برداشت سے باہر تھی وہ ایک نقّاد تھا ادب کا بھی اور صاحبانِ ادب کا بھی ۔

وہ ہنس ہنس کے رُلانے اور رُلا رُلا کے ہنسانے کے کمال میں اپنا ثانی آپ تھا ۔

پُرانے زمانے کا ہندو ، مذہب کے قواعد چھوت چھات وغیرہ کا تو سختی کے ساتھ پابند تھا لیکن اس کے دِل میں غیر مذہب والوں کی طرف سے کوئی حقیقی بغض نہیں تھا بالکل یہی ذہنیت " فتنہ " کی بھی تھی وہ لالہ شاہی اُردو اور مولویانہ اُردو دونوں کا یکساں مضحکہ اُڑاتا تھا ۔ " فتنہ " کے اوراق ہمیں اس مرقع کی سیر کراتے ہیں جب ہندو مسلمان مصلحتاً نہیں قلباً متحد تھے اور جب اُردو کسی سیاسی بنا پر نہیں بلکہ قدرتاً ان کی اپنی زبان تھی ۔

ہم " فتنہ " کی ان خصوصیات کے بعض نمونے متفرق عنوانوں کے ماتحت ایک سلسلے سے پیش کرتے ہیں تاکہ آپ ہمارے اخذ و اقتباس اور تنقید سے الگ ہوکر اپنے طور پر یہ تصویریں دیکھ سکیں ۔

" فتنہ " کے ان ہلکے پُھلکے منتخب مضامین کو من وعن شائع کردینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ اس سے اس زمانے کا اندازِ تحریر نظر کے سامنے آجائے گا ۔]

الف - نزاعِ لفظی

پہلے زبان و ادب اور لغت سے متعلق کچھ ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں :-

۱ - دہنِ عندلیب

جناب ضیا دہلوی کو حضرتِ جلیل جانشینِ جناب امیر مینائی مرحوم کے اس مصرع پر ؎

کچھ پھول جھڑ گئے دہنِ عندلیب سے

اعتراض ہی - ہم کو انھوں نے لکھا تھا مگر ہم نے یہ کہہ کر قصہ ختم کر دیا کہ جناب جلیل نے کچھ سمجھ کر کہا ہوگا. اب 'اودھ پنچ' میں وہی نوٹ شائع ہوا ہی اس لیے ہم کو اپنے دوست کو سمجھانا پڑا۔

ان کا خیال ہی کہ طائروں کے لیے منقار موزوں ہی مگر اس کا کوئی سبب نہیں لکھا کہ بچارے طیور نے کیا قصور کیا ہی تلاش سے فارسی اور اُردو میں ایسے اشعار مل سکیں گے مگر ہم کو اتنی فرصت نہیں ہی کہ دیوان اُلٹیں اس لیے ہم اپنے دوست کی تسلی کے لیے حضرت سودا مرحوم کا ایک شعر لکھے دیتے ہیں جس سے طوطی کا دہن ثابت ہوتا ہی پھر اگر جنابِ جلیل نے بلبل کا دہن فرمایا تو کیا قباحت لازم آئی.

مرزا سودا ؎ نہیں ہی بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے
سخن تو دیکھ، ہی رنگیں ترا چمن مجھ سے

اگر یہ بھی نہ ہوتا جب بھی اعتراض بے جا تھا۔

(۲)

جناب ضیا دہلوی کو ہمارے یہاں سے تسکین نہیں ہوئی انھوں نے 'اودھ پنچ' میں مکرر لکھا ہی - اب بحث دوسرا رنگ بدل رہی ہی اس لیے ہم اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے - عام رائیں ملک کے شعرا کی جلیل کے موافق ہیں یہاں تک کہ جناب داغ کے شاگرد ہی فرماتے ہیں کہ جلیل کا مطلع بے مثل اور نہایت صاف ہی خود حضرتِ جلیل نے ہی ہم کو لکھا ہی کہ 'فتنہ' میں جو لکھا گیا وہی درست ہی -

اب جناب ضیا کو اس بات پر اعتراض ہی کہ پھول جھڑنا محاورہ ہی جلیل نے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال

کیا، اُس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے تصرفات جائز ہیں اور لکھنؤ اور دہلی کے اہلِ زبان روزمرہ اس قسم کے محاورے استعمال کرتے رہتے ہیں ہم سے چاہا گیا ہے کہ ہم جنابِ جلیل جنابِ تسلیم اور جناب داغ سے استفسا کریں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ لوگ اس سے زیادہ کیا لکھیں گے جو ہم لکھ چکے ہیں ــــ متاخرین و متقدمینِ شعرا کے اسناد سے زیادہ اور کون ثبوت درکار ہے۔

۲۔ ایجاد

ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بنگال۔ پنجاب۔ مدراس۔ بمبئی اور دکن کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ کے اخبار نویس بھی اس لغت کو تانیث ہی لکھتے ہیں ــــ برسوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اساتذہ کے خلاف یہ رنگ ان روشن خیالوں نے اختیار کر رکھا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے ثقات کی صحبت یا تو ان کو نصیب نہیں ہوتی یا انھوں نے اس لغت کی تحقیق نہیں کی۔ کم سے کم اگر شعرائے دہلی و لکھنؤ کا کلام ہی ان حضرات نے دیکھا ہوتا تو بھی غلط فہمی رفع ہوجاتی۔

ایک دھوکہ ان لوگوں کو اس لغت کی جمع بنانے میں ہوا کرتا ہے اور اس وجہ سے یہ ہمیشہ ''ایجادیں'' تحریر کیا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جن لغات کی تذکیر قائم ہوچکی ہے ان کی جمع بنانے کا قاعدہ ان کو نہیں معلوم ہے ــــ اکثر وقت تو واحد اور جمع بہ حالِ خود ہی رہتے ہیں مثلاً

اچھے اچھے ایجاد امریکہ والے کر رہے ہیں

ہم اپنے دوستوں سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آیندہ وہ اس غلطی کو رفع فرمادیں گے اور یہی گزارش روشن خیال پنجابیوں سے بھی ہے۔

نواب مرزا خاں داغ فرماتے ہیں ؎

ایجادِ ستم سے ہمیں برباد کریں گے
گر تین دن ایسے ہی وہ ایجاد کریں گے

شاید لوگ کہیں کہ داغ کی زبان پر لکھنؤ والوں کا زیادہ تر اثر ہے۔ وہ ''فکر'' کو مونث باندھتے ہیں اور قلم کو مذکر لکھتے ہیں ــــ اس لیے ہم پُرانے شاعر نسیم مرحوم کا ایک شعر بھی درج کیے دیتے ہیں ؎

قبر پر آیا ہو دینے کو مبارک بادِ مرگ
یہ نیا ایجاد ہو میرے ستم ایجاد کا

اختراع بھی مثل ایجاد کے تذکیر ہو اس کو بھی اکثر احباب مونث لکھتے ہیں۔

(۲)

ایجاد کی بحث کے سلسلے میں خود "فتنہ" کی ایک صاحب نے ان الفاظ میں گرفت کی۔

ڈیر ایڈیٹر۔ آپ نے ایجاد کی بحث میں یہ فقرہ لکھا ہو کہ "ایجاد کو تانیث باندھتے ہیں" یہ صحیح نہیں ہو۔ یہ موقع تانیث کا نہیں بلکہ "مونث" کا ہو، فقرہ اس طرح ہونا چاہیے:۔

اس وقت ایجاد کو مونث باندھتے اور لکھتے ہیں

تانیث مصدر ہو اور موقع استعمال صیغۂ مفعول کو چاہتا ہو راقم مقبول

(۳)

مقبول صاحب کی یہ اصلاح دیکھ کر ایک فاضلِ گرامی کا مہربان نامہ آیا "ایجاد کو تانیث باندھتے ہیں" اس پر جو شک ظاہر کیا گیا ہو وہ خلاف ہو۔ اگر مونث ہو تو بھی صحیح ہو تانیث ہو تو بھی صحیح۔ نثر و نظم میں برابر مستعمل ہو۔ آتش کہتے ہیں۔ ؎

لکھے گئے بیاضوں میں اشعارِ انتخاب
جاری رہے وہی کہ جو سکّے کھرے ہوے

انتخاب کی جگہ "منتخب" چاہیے۔

اس پر "فتنہ" نے جو مقبول صاحب کی رائے کو درست مان کر شکریہ ادا کر چکا تھا۔ لکھا۔

احتیاط اور صحت کا یہ حکم ہو کہ زبان شایستہ بنائی جائے اور غلط الفاظ زبان سے نکال ڈالے جائیں اس لیے ہم کو اعتراضِ مقبول سے اتفاق ہو۔

ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو اپنے عیب پر خیال نہیں کرتے ــــــ زبانِ اُردو علمی زبان اُسی وقت ہوگی جب وہ شایستہ بنائی جائے گی اور صرف و نحو کے قواعد زبان کے مطابق ٹھیک

کرلیے جائیں گے۔

۳۔ سچّا لطیفہ

ایک منشی جی کسی "محرّرِ خانہ" کے "مویشی" مقرر ہوکر تشریف لے گئے ایک رپوٹ بھیجی ہو جو اصلاحِ زبانِ اُردو کے سلسلے میں قابلِ ملاحظہ ہو:۔

جناب عالی سلامت۔ خاک سار زرّہَ بے مقدار عرض گزار ہو کہ بہ اقبال سرکار دولت مدار کل شبِ تیرہ و تار میں مادہٗ گاؤ خوش گوار کے جس کو حمل تھا نورچشمی تولد ہوئی تھی، فقط دو گھنٹے تک بہ قیدِ حیات رہ کر جورِ فلکِ کج رفتار و بہ قضاے پروردگار انتقال کرکے راہی ملکِ بقا ہوئی نہایت ہی حسین و فصیح و بلیغ تھی۔ —— اطلاعاً عرض ہو۔

۴۔ بھوپالی زبان

ارے خاں خط کا جواب نہیں پہنچایا، کھٹلہ تو اچھا ہو موڑا موڑی ڈوکرا ڈوکری کیسے ہیں بیا [illegible] کی دعا کہنا —— بول چال سُن لی اب وضع پر نظر فرمایئے —— رنگین کپڑے غلافی پاجامہ منھ میں گٹکا ہاتھ میں ہتھیار اینڈ یہ کہ ہم پٹھان ہیں۔

۵۔ قبولیت۔ مقبولیت

"خدنگِ نظر" میں قبولیت پر اعتراض جمایا گیا تھا کہ غلط ہو اور مقبولیت کی نضیلت ثابت کی گئی تھی 'ریاض الاخبار' نے لکھا دونوں لفظ عربی قاعدے سے غلط ہیں اور واقعی دونوں غلط ہیں مگر لالہ صاحب نے اس کو نہ مانا بلکہ اپنی ضد پر قائم رہے۔

اب نظر صاحب نے 'اودھ پنچ' میں زورِ طبع دکھایا ہو اور فرمایا ہو کہ

دیہاتی سکّے ابھی ایک صدی تک رائج نہیں ہوسکتے۔

مگر ان کو یہ یاد نہ رہا کہ دیہاتیوں کو آپ شہنشاہِ سخن اور خاقانی اور انوری اور خدا جانے کیا کیا لکھ چکے ہیں اگر خوشامدانہ طور پر یہ بیان تھا تو حالی اقبال ریاض جلیل اختر مضطر اور آہ وغیرہ کو آپ کے بیان سے تنبیہ ہوجائے گی اور اگر دراصل صحیح بیان ہو تو آپ ہم کو لکھنؤ کے کسی مستند شاعر کی تحریر سے ثابت کردیں

کہ مقبولیت عربی قاعدے کے دائرے میں ہے۔ سید جلال ہی سے دریافت کرلیجئے۔ جناب امیر مرحوم کے چھوٹے صاحب زادے سے رفع شک کرلیجئے۔ فرنگی محل بھی قریب ہے۔

دیہاتیوں سے تو آپ گھبراتے ہیں مگر اودھ پنچ کو پشت پناہ بناتے ہیں جو ایک دیہاتی ایڈیٹر کا اخبار ہے اور کسی طرح ریاض الاخبار سے زیادہ شہری ہونے کا دعوا نہیں کرسکتا۔ مجدد السنۂ شرقیہ نے بھی لکھ دیا ہے کہ دونوں لفظ بالکل غلط ہیں۔

قبولیت کا اُردو میں وہی درجہ ہے جو مقبولیت کا اور برابر اسی طرح مستعمل ہے جیسے مقبولیت۔ اور لوگوں کو تو آپ مانیں گے نہیں، مگر آج ہم ایسا معقول جواب دیتے ہیں کہ آپ کو سکوت ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ "اجابت" پر آپ نے بڑا زور دیا ہے اور وجاہت کو اپنے زعم میں بنایا ہے لہٰذا ہم آپ کی اجابت ہی سے ایک جواب دے کر اس بحث کا خاتمہ کرتے ہیں۔

امیر اللغات حصۂ دوم صفحہ ۶۹ کالم اوّل سطر ۲ میں لکھا ہے۔

اجابت۔ ع۔ مونث۔ معنیٰ "قبولیت"

اس کے بعد منشی صاحب نے سند میں شعر دیے ہیں۔

کیوں جناب لالہ صاحب! منشی صاحب تو دیہاتی نہ تھے انھوں نے اجابت کے معنی مقبولیت کیوں نہ لکھے قبولیت کیوں تحریر فرمائے۔

منشی صاحب کا پایۂ تحقیقات صاحبِ غیاث وغیرہ سے بہت بڑھا ہوا تھا اس کو دُنیا مانتی ہے

۶۔ کھیل

کھیل بہ اتفاق دہلی و لکھنؤ مذکر ہے مگر پنجاب میں اس کی جمع کھیلیں لکھی جاتی ہے یہ صریح غلطی ہے۔ یہ لفظ مفرد استعمال ہوکر بھی جمع کا فائدہ دیتا ہے مثلاً ہم نے بہت کھیل کھیلے ہیں۔ ع عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل — جمع اگر بنائی جاتی ہے تو — و — ن۔ سے بنتی ہے مثلاً اب کھیلوں اور تماشوں میں جی نہیں لگتا۔ پنجابی اخباروں میں زبان داں اور اہلِ زبان اڈیٹر بھی ہیں مگر ان کی نظر ان مضامین پر نہیں پڑتی ورنہ اصلاح ممکن ہے۔

۷۔ غشّی

جناب حفیظ نے اپنی غزل کے مطلع میں غشّی کو باتشدید استعمال فرمایا ہو اور پروفیسر اقبال نے اپنے ایک شعر میں بہ اخفائے نون "یوناں" نظم فرمایا ہو۔ حقیر نے اس وقت تک اساتذہ کے کلام میں کسی جگہ یہ الفاظ اس طرح نہیں دیکھے کیا ایسا ممکن ہو کہ ہر دو اصحاب اس معروضے پہ غور فرما کے اساتذہ کے کلام سے کوئی مثال دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ اگر واقعی اُردو نظم سے دلچسپی ہو تو بہ قول حضرت تسلیم لکھنوی محاورات پر عبور و خلاف محاورہ سے اجتناب لازمی ہو۔ حسن افضل بدر بدایونی

(۲)

جناب حفیظ کے ایک شعر پر اعتراض ہوا تھا کہ غشّی کی ے باتشدید پڑھی جاتی ہو۔

غشّی سے جب ہوش میں آتے ہیں ہم

اس مصرع میں اگر خیال کیا جاے تو "میں" اور "ی" دونوں ساکن ہیں۔

جناب حفیظ ہم کو اطلاع دیتے ہیں کہ مصرع یوں بھی ہوسکتا ہو ؎ جب غشی سے ہوش میں آتے ہیں ہم

"یونان" کے نون کا اعلان فصاحت میں ضرور داخل ہو اور ہمارے خیال میں اس سے جناب اقبال کو بھی اتفاق ہوگا۔

(۳)

غشی کے متعلق جناب مولوی محمد ظفر حسن خاں صاحب رئیس رسول پور تحریر فرماتے ہیں:۔

"جناب بدر بدایونی کو غشی باتشدید کا دھوکا ہوا ہو غشی کا لفظ عربی ہو اس کا تلفظ بہ سکون شین بہ فتح عین معجمہ ہو اُردو دانوں نے تصرف کرکے شین کو حرکتِ کسرہ دے دی ہو

؎ نبضیں چھوٹی ہوئی غشی طاری ایک فرقت ہزار بیماری

جناب پروفیسر اقبال نے بھی غشی کے متعلق سحت پر زور دیا ہو اور یونان کی نسبت دہ کنعان، بدخشان کی مثال پیش کرتے ہیں مگر ان بحثوں کی نسبت ہماری یہ راے ہو کہ دیکھو اہلِ زبان کیا کہتے ہیں۔

۸۔ زنّار ۔ بوچھار

نہ ہوتی سلسلہ جنباں اگر زنّار تھوڑی سی

تعجب ہے کہ جنابِ شہیرؔ نے زنّار کو مونث کیوں باندھا حالاں کہ فصحائے حال زنّار کو مذکر بولتے ہیں اور اس کے مذکر ہونے میں دلّی و لکھنؤ میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ دیکھیے لکھنؤ کے سب سے بڑے محقق اُستاد امیر مینائی مرحوم فرماتے ہیں ع ”نئی صورت کا آکر دیر میں زنّار پہنایا“ اور حضرت داغؔ دہلوی بھی رقم طراز ہیں کہ زنّار مذکر ہے چناں چہ ایک شاگرد کے مصرع کو ع

شیخ تسبیح، برہمن کرے زنّار نئی

مونث ہی ہونے کی وجہ سے غزل سے علاحدہ کر دیا۔

رہی یہ بات کہ پہلے کسی نے مونث باندھا ہو جیسا کہ ناسخؔ مرحوم فرما گئے ہیں تو وہ سند اب کافی نہیں ہے یوں تو کسی نے حشر کو مونث اور بُلبل کو مذکر بھی لکھا ہے

دوسرا لفظ بوچھار ہے۔ ع اِدھر بھی گاہیوں کی آگئی بوچھار تھوڑی سی

یہ لفظ زنّار و دستار کے قافیے میں استعمال کیا گیا ہے مگر اہلِ زبان کے کلام میں رائے ثقیلہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ اگر کوئی خاص تحقیق جنابِ شہیرؔ کو ہو یا اور اصحاب کو تو آگاہ فرمائیں۔

۹ ۔ ایک عربی داں دوست کا خط

مخدوم المجالس الرطب والیابس ہوالاوّل والوساوس سلمہ اللہ القادر المجالس

بعد گوناگوں سلام مقرّرات مافی الضمیر معلوم می گردانم کہ نہ دست بہ دست کتاب آمدے نہ نعمت را چنہاڑ شدے معلوم باد درتکاہل اُفتاد۔ سحرگاہ می روم نصف النہار ماحضر نوش می فرمائم۔ بی بی اڑواڑ مکاف دیوار بہ دیوار ملصق شدہ۔ ادھار والبیوہار فرمودہ است۔ حیی باد۔ فقط۔

۱۰۔ نواویل

ایک تصنیف میں ناول کی یہ جمع دیکھ کر ہم کو ”پیسہ اخبار“ کا ”مشرق الاقصاے“ یاد آگیا جب تک یہ نہ ثابت کیا جائے کہ ناول عربی زبان کا کوئی لغت ہے اس وقت تک اس کے تسلیم کرنے میں ہم کو تامّل ہے

شاید مصنف کو

الا یا ایہا الساقی ادر کاسو و ناولہا

نے دھوکا دیا۔ یا اودھ پنچ کے مذاق کو وہ نہیں سمجھے ہیں جو اکثر اس قسم کے الفاظ محض ظرافتِ طبع کے لیے لکھ جاتا ہو مثلاً نیچر کی جمع نیاچر۔ لالہ کی جمع لوالیل۔

ناول زبانوں پر مذکر اور مونث دونوں طرح ہو مگر ایک قاعدے کے موافق مذکر کو ترجیح ہو اس لیے اس کی جمع ناولیں بھی غلط ہوگی ــ یہ لفظ جمع کے موقع پر مفرد ہی استعمال ہوگا مثلاً

"شرر کے جتنے ناول ہیں سب اپنے حُسنِ بیان میں لاجواب ہیں"

اور موقع پر " و۔ ن" سے جمع بنائی جائے گی مثلاً

"آج کل ناولوں کی بہتات ہو۔"

(۲)

جناب اڈیٹر صاحب۔ ۲۸ر نومبر کے 'فتنہ' میں ناول کی جمع نواویل کے متعلق آپ نے جو نوٹ دیا ہو اس میں لکھا ہو کہ وزن تو فعالیل کا ہو۔ اگر میں نے آپ کے الفاظ سمجھنے میں غلطی نہیں کی، تو اس کا مطلب یہ ہو کہ جو الفاظ ٹھیٹ عربی کے نہ ہوں یا اس میں بہ ذریعے تعریب نہ آئے ہوں ان پر عربی کے قواعد جاری نہیں ہوسکتے حالاں کہ ایسا نہیں ہو۔ خاص لفظِ ناول کی نسبت تو مجھے تحقیق نہیں ہو کہ حال کی عربی میں مستعمل ہو یا نہیں لیکن قطع نظر ناول کے دُوسرے عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں جو اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ عربی میں مستعمل ہیں۔ مُشتے از نمونۂ خروارے ایک انگریزی لغت "اسکول" ہو ـــــ رسالہ تمرین الادب فی ترقین العرب میں اس کی جمع "اساکیل" مستعمل ہو۔ اگر مسٹر فتنہ خاں بہادر کی نازک بدنی اس بھاری بوجھ کی متحمل ہوسکے تو سرسری تلاش سے اور بھی الفاظ پیش کرسکتا ہوں۔ باقی حصۂ مضمون سے بہ لفظہٖ متفق ہوں ـــــ محمد مقتدا خاں شروانی بلوئوی۔

(۳)

نواویل کی نسبت صاحب مراسلہ کے تفحص وتلاش کی ہم داد دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ

گزارش کرتے ہیں کہ عرب، عجم اور ہند کے باشندوں کو تعریب۔ تفریس اور تہنید کا اختیار ہو اگر عرب نے اسکول کی جمع اساکیل بنالی تو اردو والوں کے لیے یہ لازم نہیں ہو۔ اردو انشاپرداز تو اپنے قاعدے سے جمع بنائے گا۔ اسی طرح ہم غیر زبان کے الفاظ میں جو تصرّف کرتے ہیں دوسروں کو اس کا تتبع لازم نہیں ہو۔

ہم نے جب ایک قاعدہ غیر زبانوں کے الفاظ کے لیے بنا لیا ہو تو ناول کی جمع نواویل لکھنا صرف ہنسی کی بات نہیں ہو بلکہ رونے کا مقام ہو۔

۱۱۔ ایک شعر

ناظرینِ 'فتنہ' سے کوئی صاحب اس شعر کے حسن و قبح پر روشنی ڈالیں۔ ؎

ناز تقدیر پہ جن کو کہ ابھی کل تک تھا آج بیٹھے ہیں وہ روئے کو مقدر اپنا

تقدیر کا رونا رو رہے ہیں، مقدر کا رونا رو رہے ہیں، قسمت کو رو رہے ہیں۔ سیکڑوں پہلو سے اس محاورے کا استعمال ہو مگر بیٹھے ہیں رونے کو مقدر اپنا۔ ہیچ مداں کا خیال ہو کہ ردیف محاورے کے محلِ استعمال کو پہاڑ سے انگھڑ بنا رہی ہو۔ راقم ایک نووارد۔ جون پور

۱۲۔ مارواڑی

ایک مارواڑی کے ایک خاں صاحب مقروض تھے۔ سامنا نہیں کرتے تھے ایک دن مقابلہ ہوگیا۔ سیٹھ صاحب نے لال پیلی آنکھیں نکال دھوتی کو توند پر چڑھا آگے سے دبا کہا:۔

"کھاں شاب۔ حشوب شے جو تمھارا نکسے شو لے، اب حشوب سُن۔ تیئرے ڈیڑیں شاٹھ۔ آدھے دئے نائیں۔ باکی تیئش اس میں سے دش دیں گے دش دلائیں گے دش کو دنیڑوں (دینا) ہی کیا۔

۱۳۔ الاپ اور آگ کے پھول

جب بزمِ عیش وطرب میں شاہدانِ ناز "الاپ" کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے خوش نما اور دل فریب رخسارِ تاباں اور لبِ نازک کی قدرتی بناوٹ میں فرق آجاتا ہو اور چہرہ بگڑنے لگتا ہو بلکہ نازک نازک لب تو الاپ کی پیہم جنبش سے کچھ عجب نہیں کہ چھِل جاتے ہوں۔ چھِلتے نہ ہوں گے تو لمبی لمبی تانوں کے

مارے دب ضرور جاتے ہوں گے مگر اس سے زیادہ بدمزگی اور کراہت جب پیدا ہوتی ہی کہ "الاپ" کو کوئی صاحب مذکر باندھتے ہیں۔

آج کل اس پر بحث ہو رہی ہی کہ الاپ مذکر ہی اور سند میں ایک شعر قدرت شاعر قدیم کا پڑھا جاتا ہی قدرت دہلی کے شاعر تھے اور میر حسن وغیرہ بھی دہلی کے شاعر تھے انھوں نے اور لکھنؤ کے تمام شعرا نے مونث باندھا ہی۔ جناب امیر مرحوم نے بھی اس کو مونث ہی لکھا ہی۔

دوسری بحث حروفِ علت کی ہی۔ شعرا حروفِ علت کو گرا دینے میں قدرت رکھتے ہیں اور ان حرفوں کا دب کر نکلنا ان کے نزدیک کوئی عیب نہیں مگر جن لوگوں نے ثقات شعرائے زبانِ اُردو کا کلام دیکھا ہی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ الف کا یا کسی حرف کا دب کر نکلنا مکروہ ہی۔ جو صاحبِ کمال ہیں وہ اس قسم کے عیوب پر نظر رکھتے ہیں اور شعر کے حُسن و خوبی کو نہیں مٹاتے۔

آگ کے پھول ہیں یہ باغ کے کچھ پھول نہیں
شمع کو چور بنانا ہی بنا لے بلبل

ڈیر فتنہ۔ مَیں نے شعرِ بالا پر اعتراض دیکھا مگر میری سمجھ میں مطلب نہ آیا کہ معزز کرم فرما جنابِ معترض کا مطلب کیا ہی شاید وہ خود بھی اعتراض نہیں سمجھے بہرحال اگر ان کو صرف مطلب کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو مطلب شعر کا یہ ہی :-

"بلبل تلاشِ گُل میں نکلی شمع کے پھولوں کو دیکھ کر اسی کو چور بنانے لگی شاعر کہتا ہی کہ ای بُلبلِ عشق کی مدہوشی میں تو یہ بھی نہیں سمجھی کہ یہ آگ کے پھول ہیں تیرے باغ کے پھول نہیں ہیں۔"

اگر شمع کے پھول پر اعتراض ہی تو سُنیے جناب امیر مرحوم فرماتے ہیں ؎ یہ گرتے ہیں لگن میں شمع سے پھول ——— ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

جھونکا اِدھر نہ آئے نسیمِ بہار کا　　　　نازک بہت ہی پھول چراغِ مزار کا

معترض صاحب کو اپنے گرامی پایہ اُستاد سے دریافت کرلینا چاہیے ـــــــــ ا۔ ع۔ لکھنؤ

فتنہ:۔ ہمارے دوست معترض صاحب کو "آگ کے پھوٗل" پر شک ہوا ہو۔ دہلی کے شاعر شاہ نصیر مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

بلبل ترے جلیں گے خس و خارِ آشیاں
اُڑکر پڑا جو آگ کا اس گُل ستاں سے پھوٗل

ظفر مرحوم ؎

لگ گئی جوشِ گُل و لالہ سے گلشن کو جو آگ
کہیں اس آتشِ رخسار کا کیا پھوٗل پڑا

۱۴۔ آب دست

ہزہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور کے دربارِ دُربار میں آج کل شعرائے زبانِ اُردو کا اچھا خاصہ مجمع ہو ان شعرا میں لکھنؤ و دہلی کے مقلّد و غیر مقلّد دونوں شامل ہیں۔

جہاں مجمعِ اربابِ کمال ہوتا ہو ہر قسم کی تحقیق ہوتی رہتی ہو۔ شعرا کا بے کار گروہ صرف زبان کی بحث میں اگر وقت صرف کرے تو بڑا کام نکل جائے مگر بحث ہو سلیقے کی۔ تہذیب کی اور زبان کی اصلاح کی نیت سے ہو اس بحث میں ذاتی رنجش اور عداوت کا شائبہ نہ آنے پائے، اگر بدقسمت زبانِ اُردوٗ کے لیے یہ مسٔلہ اِتنا مشکل ہوگیا ہو کہ اب کوئی صورت اس کے سنبھلنے کی نظر نہیں آتی۔

ریاست رام پور ہمیشہ زبان اور علم کی حفاظت کرتی رہی ہو۔ نواب خلد آشیاں کی پوری پیروی اس معاملے میں ہزہائی نس بہ القابہ فرمارہے ہیں۔ اِس موقع کو غنیمت جان کر اُردوٗ کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیے تھی مگر ہم دیکھتے ہیں شعرائے لکھنؤ میں اختلاف ہوگیا ہو۔

میر مہدی کمال اور آغا منظہر میں یہ بحث چھڑی۔ ایک صاحب آب دست کی تذکیر کے دعوے دار ہوئے دوٗسرے صاحب تانیث کے۔ ایک محضر بنا کر لکھنؤ بھیجا گیا۔ لکھنؤ میں کوشش کی گئی کہ آغا منظہر کی بات جانے نہ پائے۔ جنابِ فصاحت اور جنابِ عارف سے بھی تانیث ہی پر سند لکھوائی گئی۔

کیا یہ صریحی اندھیر نہیں ہو کہ آب دست کو اب تک کسی گنوار سے گنوار نے بھی مونث نہیں لکھا ہو۔

جلال اور امیر جو زبانِ اُردو کے بڑے معلّم اور ادیب ہیں وہ بھی تذکیر کے قائل تھے۔

میر انیس کے خاندان سے ایسی آواز تعجب ہے جو اس بات کا فخر کرتا ہے کہ ہمارا گھر زبان کی ٹکسال ہے دلّی اور لکھنؤ میں آب دست بلا اختلاف مذکر ہی بولا جاتا ہے اگر لکھنؤ کے کسی گھر میں یہ مونث استعمال ہوتا تو امیر و جلال ضرور اس پر نوٹ دیتے یا امانت مرحوم اور انیس مرحوم کے کلام میں کہیں مونث نظر آتا ——— ہم کو جناب فصاحت و جنابِ عارف سے تعجب ہے کہ محض پاسِ خاطر سے ایسا فتوا دیا جس سے بہت بڑا اختلاف پیدا ہوگیا۔

اگر آب دست مونث ہے تو پیشاب اور پاخانہ بدرجۂ اولا مونث ہے۔ میں نے پیشاب کی۔ میں نے پاخانہ پھری فرمائیے۔

یہ صحیح ہے کہ دلّی اور لکھنؤ میں قدیم زمانے سے یہ اختلاف رہا ہے کہ دونوں شہروں میں دو دو تین تین زبانیں استعمال ہوا کی ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ متفق علیہ الفاظ اور محاوروں میں اختلاف کیا گیا ہو پانی کو ہمیشہ دونوں جگہ ہر فرقے نے مذکر ہی کہا۔ ہاتھ کو مذکر ہی کہا۔ یہ اور بات ہے کہ خاندانِ انیس و خاندانِ امانت میں جب آب۔ دست۔ مل جائیں تو مونث ہو جائے حالاں کہ اب ڈبل تذکیر ہو جانا چاہیے۔

۱۵۔ داغی

جس پھل میں بوسیدگی کے آثار پیدا ہو چلے ہوں اسے کہتے ہیں۔ جس کے چال چلن پر کوئی حرف آگیا ہو اس کے لیے بولتے ہیں۔ کپڑے کاغذ یا دوسری چیز پر دھبہ پڑ جانے کے موقع پر مستعمل ہے۔ سزا یافتہ مجرم کی نسبت کہا جاتا ہے غرض کہ اس کا ہر ایک استعمال انھی معنوں میں دیکھا گیا ——— یہ ذکر ہو رہا تھا تو ایک دوست بول اُٹھے کہ مشفق اس میں یائے نسبتی ہے اس کا بھی خیال رہے۔

۱۶۔ بنگلہ اردو

ابھی ایک سمن جو یوپی سے جاری ہوا تھا بنگال احاطہ سے تعمیل ہو کر آیا ہے قابلِ ملاحظہ ناظرین ہے۔

"لکھ امرت بہو یا ساکن منوہر پور اسٹیشن سربدا پر آگے سادھو چرن دو سو سولہ نمبر دیوانی مقدمہ کے سمن پروانہ لے کے آنے سے مدعا علیہ آل دھریا صاحب ساکن منوہر پور

سرزمین پہنچ کر تلاش کر لینے پایا نہیں کیا جانے کہاں گیا ہو۔ کون جگہ میں رہتا ہو۔ اس کا گھر دروازہ دیکھا نہیں۔ بول کر تلاش کیا پایا نہیں ہمن پروانہ مدعا علیہ ڈہریا صاحب کے نام کا عدالت کو واپس کیا اس لیے گواہاں مقابلے میں اقرار لکھ دیا۔ ذریعے ڈاک خانہ حضور میں عرض پرداز پہنچایا۔ حضور خاوند ہو۔

۱۷۔ وجہِ تسمیہ

عموماً طوائفوں کے سازندوں کو کئی نام سے سرفراز کیا جاتا ہو جن میں سے بغیر خیالِ مدارج و امتیاز چند حسبِ ذیل ہیں۔ مثلاً بھڑوے۔ قرم ساق۔ سازندے اور ”سفروا“ یا سفروائی۔ بالخصوص آخری نام کی بابت لوگوں کو خیال ہوگا کہ شاید عربی یا فارسی کا لفظ ہو سو جناب بندہ عرب میں اس کا وجود ہی نہیں وہاں تو صرف اسی کی گنجایش ہو

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت

اور ایران میں امرد پرستی نے بھڑودں وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رکھی اس لیے یہ لفظ نہ عربی ہو نہ فارسی بلکہ بہ قول میاں جی بنارسی خاص الخاص سنسکرت ہو جس کا صحیح تلفظ ”سمپھروا“ ہو۔

اس کے معنی ہیں جماعت، فرقہ، گروہ اور ٹولی اسی لیے گانے بجانے والی رنڈیوں کو مع نالہ و فغاں طائفہ، طوائف اور ڈیرہ کہتے ہیں۔ آخری لفظ ڈیرے کا اطلاق خیمہ و خرگاہ یعنی ٹھیرنے کی جگہ اور جاے قیام پر ہوتا ہو۔

۱۸۔ دکھنی زبان کا مخمس

کھنگے کی ناتھ تھامیے کچرا اٹھائے　　سیل کو لیجے ہاتھ میں گتا اٹھائے
یہ بھی نکو نکو اجی جوتا اٹھائے　　مزدور بنیے خلق کا بوجھا اٹھائے
احساں کسی کا سر پہ نہ اصلا اٹھائیے

راقم ہر کہیں اصلاح نہ فرمائے گا

۱۹ "کو"، "سے"

آج کل ان دو حرفوں پر "اُردوے معلّا" نے بحث چھیڑ رکھی ہے۔ پروفیسر اقبال جو اُردو زبان کے ایک سچے بہی خواہ بلکہ عاشق ہیں انھوں نے ایک شعر میں یوں کہہ دیا ع

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے

اعتراض ہوا کہ کہنا کا صلہ "سے" آتا ہے۔ پروفیسر اقبال نے مصحفی مرحوم اور امیر مرحوم کے شعروں سے سند دی۔ جناب حسرت نے مصحفی کے شعر کو غلط اور امیر کے شعر کو مستند مانتے ہوئے یہ کہا کہ جملۂ خبریہ میں کو صلے میں نہیں آتا ہے انشائیہ میں آتا ہے۔ اس طرح جناب امیر کا شعر صحیح ہوگیا اور مصحفی کا غلط رہا مگر اس پر مفصل اور معقول بحث یکم اپریل کے "تالیف و اشاعت" میں کی گئی ہے اور پروفیسر اقبال کی غلطی تسلیم کرکے محلِ استعمال بتایا گیا ہے۔

اس ساری بحث کی پیچیدگیوں اور قواعد کے حوالوں سے تو بہتر یہ تھا کہ اہلِ زبان کے روزمرہ کو دیکھا جاتا کہ ان کی زبان پر کیا ہے ـــــ جو مثالیں دی گئی ہیں وہ سب غلط ہیں اور دہلی لکھنؤ کے ثقات و خواص ہرگز کو کا استعمال ایسے محل و موقع پر نہیں کرتے، چاہے وہ جملہ انشائیہ ہو چاہے خبریہ۔ اور اسی بنا پر جناب امیر نے آخر زمانے میں اس سے ابا کیا ہے دوسرے دیوان میں اس کو کا کہیں پتا بھی نہیں ملے گا۔ کہاروں کو کہو ڈولی لگائیں۔ بالکل غلط ہے، جناب حسرت کو منشی صاحب مرحوم کے شعر کے واسطے اگر یہ دردسری کرنا پڑی تو صرف وقت ہی نہیں ضائع ہوا بلکہ اور لوگ شک میں پڑگئے۔ ہر شخص کے لیے اہلِ زبان کا روزمرہ عمدہ رہ نما ہے اور ہر شخص خود بھی دیکھ سکتا ہے کہ ہم کیا بولتے ہیں۔ اڈیٹر تالیف و اشاعت نے بہ پابندی قواعد جو کچھ لکھا ہے وہ بہت کچھ قابلِ قدر ہے اور ہم شکر کرتے ہیں کہ ابھی مُلک میں ایسے محقق موجود ہیں لیکن ہم اپنے دوست سے بہ ادب عرض کرتے ہیں کہ زبان کو قاعدے کا پابند کرنے سے یہ بہتر ہے کہ قاعدہ زبان کا پابند کیا جائے۔ آخر میں ہم اس امر کا بھی شکر ادا کرتے ہیں کہ جناب اقبال نہایت منصف مزاج اور نیک دل ہیں اور جہاں تک ہم کو خط و کتابت سے دریافت ہوا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہر اچھی بات کے تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمارے دوست حسرت کا مُلک پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے زبان کی اِصلاح

کا قصد کیا مگر ہم اپنے دوست سے یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ وہ بھی قدیم متروکات سے ابا فرمائیں تو اچھا ہو۔

۲۰۔ تار

ہمارے پنجابی اخبارات جس طرح مُلک میں اُردو کی اشاعت کر رہے ہیں اگر زبان پر بھی کچھ توجہ کرتے چلیں تو بہت جلد اُردو کی اصلاح ممکن ہو مگر مشکل یہ آپڑی ہو کہ ہمارے دوست زرا ٹوکنے پر بگڑ جاتے ہیں اور اُلٹی سیدھی سُنانے لگتے ہیں۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال کی ہم تعریف کریں گے جو اس معاملے میں نہایت معتدل پالیسی رکھتے ہیں اور کبھی اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔یہی وجہ ہو کہ ان کی زبان صاف ہوگئی ہو اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں ایک ماہرِ زبان ہوجائیں گے۔ہم چاہتے ہیں کہ یہ بات پنجاب اور بنگال کے رہنے والے حاصل کرلیں اس کے لیے کسی اُستاد کی بھی ضرورت نہیں ہو۔شعرا کا کلام عمدہ آتالیق ہو۔

تار کا لفظ عام طور پر مذکر بولا جاتا ہو مگر یہ عجیب بات ہو کہ پنجاب کے اخبار اس کو مونث لکھتے ہیں برقی تار ہو یا لوہے پیتل کا تار ہو یا شربت اور چاشنی کا تار ہو یا تارِ عنکبوت ہو یا سوت کا تار ہو۔سب دہلی اور لکھنؤ میں مذکر کے دائرے میں ہیں معلوم نہیں پنجاب کے روشن خیالوں نے تانیث کا لباس اس کو کیوں پہنایا؟

ہم کو امید ہو کہ ہمارے پنجابی احباب اس قسم کے الفاظ پر خیال فرمائیں گے اور لگے ہاتھوں "طاعون" پر بھی ایک نظر ڈالیں گے۔

پروفیسر اقبال سے خاص طور پر ہم یہ استدعا کرتے ہیں کہ آپ اس غلط فہمی کو دور فرمانے کی کوشش کریں اور اڈیٹر صاحب "مخزن" سے یہ التماس ہو کہ 'مخزن' کے صفحات میں غزلوں اور نظموں سے اس قسم کی ضروری اصلاحیں زیادہ مفید ہیں۔

۲۱۔ غزلِ محمود

مرزا غلام احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے فرزند مرزا محمود احمد صاحب کی غزل پر ہم کو قلم اٹھانے کی ضرورت نہ تھی مگر ہم کو پرائیویٹ طور سے معلوم ہوا ہے کہ صاحب زادے صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں اہلِ زبان بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ گستاخی معاف ہو خود جناب کے والد صاحب کی تحریرات زبان کی لطافت سے خالی ہیں جن کی اس وقت اسّی کتابیں موجود ہیں اور جن میں سے ہر ایک مخالفینِ اسلام کے لیے ذوالفقار کا کام دیتی ہے۔

شاید آپ کو اور آپ کی سوسائٹی والوں کو اس امر میں شبہہ ہو کہ میرا بیان غلط ہے تو ایک غزل کی اصلاح پیش کرتا ہوں اور یہ مشتے نمونہ ہے۔

وہو ہذا

قصۂ ہجر ذرا ہوش میں آلوں تو کہوں
بات لمبی ہے یہ سر پیر جو پالوں تو کہوں

واللہ دہلی اور لکھنؤ دونوں مات ہیں۔ حضرت "یہ" دوسرے مصرع میں زائد ہے اور اہلِ زبان پیر نہیں بولا کرتے ہیں آج آپ نے پیر لکھا ہے کل "لات" لکھیں گے اور خیال فرمائیں گے کہ یہی زبان ہے۔ اہلِ زبان پیر کی جگہ پانو بولتے ہیں۔ معاف فرمائیے گا آپ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ آپ کی والدہ دلّی کی ضرور ہیں مگر آپ نے پرورش پائی ہے پنجاب میں — یہ شعر یوں ہونا چاہیے ؎

قصۂ ہجر ذرا ہوش میں آلوں تو کہوں
بات لمبی ہے سرا اس کا جو پالوں تو کہوں

ملاحظہ فرمائیے ذراسی اصلاح سے شعر کا پایہ کس قدر بلند ہوگیا۔

دوسرا شعر ؎ عشق میں اک گلِ نازک کے ہوا ہوں مجنوں　　دھجیاں جامۂ تن کی میں اُڑا لوں تو کہوں

بندہ نواز اس شعر میں بھی ٹھوکر کھائی۔ دونوں مصرعوں میں تناسب نہیں ہے۔ بلبل "گلِ نازک" پر عاشق ہوتی ہے اور مجنوں لیلیٰ کے عشق میں ہوا کرتے ہیں — علاوہ اس کے آپ پہلے مصرع میں اپنا حالِ زار بیان کر رہے

ہیں۔ پھر دوسرے مصرع میں "اڑالوں تو کہوں" کیوں لائے ہیں؟ لیجئے ہم آپ کے شعر کو بنائے دیتے ہیں۔

ایک لیلہ کی محبت میں ہوا کیوں مجنوں
دھجیاں جامۂ تن کی میں اڑالوں تو کہوں

تیسرا شعر ؎ حالِ دل کہنے نہیں دیتی یہ بےتابیٔ دِل — آؤ سینے سے تمھیں اپنے لگالوں تو کہوں

بندہ نواز آپ اپنے کلام کو زوائد سے جب پاک نہیں کرسکتے تو شاعری کیوں کرتے ہیں۔ حضرت کسی کو آپ نے اپنا کلام بھی دکھایا ہو یا آپ خودرَو شاعر ہیں۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیے ؎

حالِ دل کہنے نہیں دیتی ہے بےتابیٔ دل
آؤ سینے سے تمھیں اپنے لگالوں تو کہوں

ایک اور شعر ؎ رازداں اس کی شکایت ہو اسی کے آگے — اس کی تصویر کو آنکھوں سے ہٹالوں تو کہوں

بندہ پرور، بے حرفِ ندا کے رازداں بے جوڑ ہو یہ شعر یوں ہونا چاہیے ؎

کس طرح اس کی شکایت ہو اسی کے آگے
اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگالوں تو کہوں

۲۲۔ اردو لشکر پر یورش

ہم نے اس سے پہلے کئی مضامین تحریر کیے ہیں جو 'کمال' دہلی 'زبانِ اردو' اور 'جلوۂ یار' میں شائع ہو چکے ہیں، پبلک کی نظر سے گزرے ہوں گے ان میں سوائے معلومات فنِ شعر و سخن کوئی دل لگی کی بات نہ تھی طبیعتیں خوش نہ ہوئی ہوں گی۔ غور و فکر سے کام لیا گیا ہوگا کبھی کتب لغات و محاورات کبھی کلامِ فصحا کو دیکھنا پڑا ہوگا اس لیے ہم اپنے پیارے ناظرین کو اس اردو لشکر کے جس کے اشعار پر پہلے بحث کی گئی ہے چند ایسے اشعار دکھاتے ہیں کہ جن کو ملاحظہ فرما کر حظ حاصل ہوگا دس پانچ منٹ طبیعت خوش رہے گی بے ساختہ ہنسی آئے گی۔

ہمارے مشفق سید علی احسن صاحب احسن مارہروی نے شاید اپنے ترکیب بند میں اسی غرض سے ایسے اشعار لکھے ہوں گے۔ آل انڈیا اردو کانفرنس واقع بدایوں کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ طولانی مضمون کا

ترکیب بند پڑھنا مدِ نظر تھا ضرور خیال ہوا ہوگا کہ سامعین گھبرا جائیں گے کچھ اشعار ایسے بھی لکھے جائیں کہ سُن کر طبیعتیں خوش ہوں ہنسی مذاق میں طوالت بارِ خاطر نہ ہو۔

ایک رئیس اور باورچی کا مشہور قصہ جو اور بھی ایک جگہ کتاب میں لکھا ہوا ہے ناسخ التواریخ کے اس پورے قصے کا انگریزی ریڈر میں نصف ترجمہ دیکھ کر اسے نظم فرمایا ہے باورچی نے ایک دن بہت اچھی اور ایک دن بہت بُری غذا کی فرمایش پر دونوں دن زبان پکائی۔ رئیس نے باورچی کی دانائی کی داد مرحمت فرماکر کچھ انعام بھی مرحمت فرمایا۔ اس موقع پر جنابِ احسن فرماتے ہیں ؎

کہ کے یہ مصروف اپنے کام میں وہ ہوگیا　　　　کام کرتے کرتے آخر دن ڈھلا اور آئی رات

اس شعر میں کس مزے کا مضمون ہے۔ جانؔ صاحب لکھنوی کی تقلید فرمائی ہے باورچی کیا تھا سراپا . . . . تھا۔ اپنے کام میں مصروف ہوئے ہوئے دن ڈھلا اور آئی رات مزے کی بات ہے۔ ان کھلے ہوئے ذم کے پہلوؤں کے علاوہ لفظ کام پہلے اور دوسرے، دونوں مصرعوں میں ہے۔ ایک ہی لفظ کا دونوں مصرعوں میں ہونا معیوب ہے اور پھر کہنہ مشق کے لیے۔

اس کے بعد جنابِ احسن نے زبانِ اُردو کو ایک عورت مثلِ بیسوا کے بناکر اس کی زبان سے اس کے حالات ظاہر کیے ہیں جن کو سُن کر ناظرین بہت محظوظ ہوں گے۔ سُنیے ؎

سب سے ملتی رہتی ہوں سب کو بلاتی رہتی ہوں　　　　میں کسی سے بھی نہیں کرتی ذرا بھی احتراز

کیا انکسار ہے اور کیا اخلاق ہے۔ ہر شخص کی خوشی پر خوش ؎

جس نے مجھ کو منھ لگایا میں اسی کی ہوگئی　　　　دوست ہوں دشمن ہوں سب سے مجھ کو حاصل ہے نیاز

جب یہ صورت تھی تو پھر مجھ کو نہ ہوتا کیوں عروج　　　　جب یہ حالت تھی تو پھر کیوں کر نہ ہوتی سرفراز

کس خوبی اور کس مزے سے سرفراز ہوئی ہے کیا کہنا ہے "سرفراز ہونا" کس قدر پُر لطف ہے ؎

آج سے کل تک مناسب ہے نہ ہو کچھ اور کام　　　　میرے کاموں کے لیے ہیں وقف یہ ایامِ خاص

آج سے کل تک اور کاموں کا التوا "ایامِ خاص" کے باعث ایامِ معمولی کو ظاہر کرتا ہے۔ لفظِ خاص جو ردیف

ہی اس نے اور بھی مضمون کو رنگین کر دیا ہی ۔

اصل مطلب آپا دھاپی میں ہوا جاتا ہی فوت   کیا مصیبت میں پھنسی ہی میری بے چاری غرض

کیا مزے کی بات پیدا ہوتی ہی۔ آپا دھاپی ، بے چاری ، غرض سب الفاظ قابلِ غور ہیں اور قابلِ رحم ہونے کی صورت دِکھاتے ہیں ۔ ع

کون ہی دُنیا میں وہ جس سے نہیں کچھ میری بات   ہر مسن سے رسم مجھ کو ہر جواں سے ربط ضبط

اس مدح کی زبانِ اُردو حضرتِ احسن کو بہت داد دے گی ۔ مصرعِ ثانی میں بجائے (میرا) کے مجھ کو غلط ہی ع

کام کرنے والا ہونا چاہیے قابل کوئی   اس کی کچھ پروا نہیں سید ہو یا ہو نور باف

یہ شعر ہی یا راہِ مولا پر سبیل لگا رکھی ہی ثواب لینا منظور ہی۔ ہر ایک کے لیے وقف تکیہ کا کنواں ۔۔ دیکھیے اب زمانے میں ایسے کلام کو بے مثل و لاجواب کہتے ہیں اور بہ صد ناز تحریر کیا جاتا ہی کہ یہ کلام جملہ عیوب سے پاک ہی جس میں ترکیب فارسی عطف و اضافت بھی نہیں ہی ۔ ہمیشہ بُری بات سے مطلع کرنے والا دوست ہی پھر اس پر طرّہ یہ کہ ہم کوئی احسان نہیں جتاتے ——— بلبلِ تسلیم صبر رام پوری

۲۳ - نیچرل شعر

ہمارے مولانا حالی صاحب ایک تو فصاحت سے خالی دُوسرے آپ کی نیچرلٹی بھی انوکھی نرالی ہی۔ فرماتے ہیں ۔ ع

فصلِ خزاں ہی تس پر پھولی نہیں سماتی   مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سُنایا

"تس پر" کی فصاحت قابلِ داد ہی جس پر بے ساختہ ہنسی آتی ہی ۔ فصلِ خزاں میں صبا کا ہونا گویا قانونِ فطرت میں اصلاح دینا ہی ۔ بہار کو صبا سے اب کوئی لگاؤ نہیں رہا شاید پانی پت کی آب و ہوا نے اس اصول کو بدل دیا واقعی نیچرل شعر نیچر کے ٹھیکم ٹھیک مطابق اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا ۔

راقم خزاں بقلم بہار

۲۴ - "مت" روکات

خواجہ حالی صاحب کی عنایت سے یہ بات قریب تسلیم کے ہوئی جاتی ہی کہ متروکات کا استعمال زبانوں پر

رہے گا یہ ھندی مزاج فخرِ قوم و فخرِ پنجاب کبھی دوسرے کی رائے پر عمل نہیں کرتے۔ اس میں کچھ گناہ نہیں ہو اگر کسی کی رائے مان لی جائے مگر تفوق اور برتری میں ضرور فرق آتا ہو

"مت" کو آتش۔ ناسخ۔ نسیم، مومن، ذوق، غالب نے اپنے آخر دور میں ترک کر دیا تھا مگر جناب حالی کی اُپج اور زبان دانی کی بدولت ابھی اس کا ذکر باقی ہو اور بڑے افسوس کے ساتھ ہم کو لکھنا پڑتا ہو کہ "مصباح القواعد" میں بھی اس کو اونچی کرسی نصیب ہوئی۔ فاضل مصنف نے اپنی انشا پردازی کے سلسلے میں جہاں جہاں اس کو کھپایا ہو وہ لائقِ توجہ نہیں ہو مگر لطف یہ ہو کہ اس کتاب کو بڑے بڑے روشن خیالوں نے دیکھا ہو اور کسی سے تو ہم کو پوچھنا نہیں ہو ہاں مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی سے ہم ضرور درخواست کریں گے کہ انھوں نے اس کو کس طرح جائز رکھا۔

ایک لفظ جب نکال دیا گیا تو اب اس کو داخلِ قواعد کرنا کیا ضرور تھا اور اگر یہ جائز ہو تو قدیم زبان کے کل الفاظ قابلِ تسلیم اور داخلِ زبان کرنا لازم آئے گا اس میں مولوی فتح محمد صاحب جالندھری کا کچھ قصور نہیں صرف حالی صاحب کے کلام کی برکت نے زبان کو یہ دِن دکھایا ہو۔

۲۵۔ بہت کہی

ہمارے جلے تن سر سید نے ایک خاص مضمون لکھا ہو۔

"سُن لو ای دور و نزدیک کے دوستو سُن لو۔ ای دکن کے اور اُتر کے دوستو سُن لو۔ ای پورب اور پچھم کے دوستو سُن لو۔ ای آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والو سُن لو وغیرہ وغیرہ"

ہم اس پر کچھ لکھا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے دوست 'اودھ پنچ' نے ہمارے منھ سے بات اس طرح چھین لی جیسے مولوی سمیع اللہ خاں نے مسٹر محمود کے لائف سکریٹری ہونے کا خیال ——

اب مندرجۂ بالا فقروں کی نسبت چہ میگوئی ملاحظہ ہو :۔

"یہ تہذیب الاخلاق والے ریفارمر کی تحریر ہو یا کوئی سفلی عمل پڑھا جا رہا ہو کہ پورب باندھوں پچھم باندھوں اُتر باندھوں دکھن باندھوں۔ زمین آسمان باندھوں۔ پَوَن پانی باندھوں —— اگر کسر ہی تو صرف لونا چماری اور اسماعیل جوگی کی دہائی کی اس کے بعد یہ فقرہ ہو کہ :۔

" سیّد صاحب اپنے مخالفوں کو فرانس چلنے کی اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے بازاری گالی گلوج میں بک اُٹھتے ہیں کہ چلو سڑک پر آؤ تو ہم تم سمجھ لیں "

ب ۔ معاصرینِ عہد

"نزاعِ لفظی" کے ماتحت حالی اور سرسید کے ضمنی تذکرے کے سلسلے میں آئے اس وقت کے کچھ اور معاصرینِ 'فتنہ' سے بھی ملتے چلیں ۔

۱۔ چندولال

مہاراجہ چندولال دکن میں شعروسخن کا بہت شوق رکھتے تھے اور ان کا کلام، کلام الملوک ملوک الکلام سمجھا جاتا تھا بلا ناغہ شب کو ایک طبع زاد غزل سُناکر حاضرین سے داد لیا کرتے تھے ۔ ایک دن حسبِ اتفاق لالہ صاحب کی طبیعت بگڑی رہی کچھ فکر نہ ہو سکی ۔ شوقین خوشامدی حسبِ معمول شام ہی سے بم کے گولے اور مدح کی آتش بازی لے کر آدھمکے ۔ لالہ صاحب نے حسبِ معمول دربار کیا دیر تک جب لوگوں نے سکوت دیکھا اور اُکتا گئے تو لالہ صاحب بھی تاڑ گئے ۔ لالہ صاحب نے فرمایا :-

حاضرین آج بہ سبب ناچاقیٔ طبع

یہاں تک فرما چکے تھے کہ واہ وا سبحان اللہ ماشاءاللہ شعر اس کو کہتے ہیں کیا ذہن رسا ہے واللہ کیا طبیعت پائی ہے کے نعرے بلند ہونے لگے ـــــ لالہ صاحب خفیف ہوئے کہ آج تک کن کڑھ مغزوں کو میں کلام سُناتا رہا اور فرمایا چُپ رہو، نالائقو تم خاک نہیں سمجھتے افسوس مُفت اپنا دماغ آج تک تمھارے سامنے خالی کیا ۔

لالہ صاحب نے اس دن سے عہد کیا کہ اب ان بد دماغوں کو کچھ نہ سُناؤں گا بلکہ شاعری کا مشغلہ ہی ترک کردیا ۔ ؎

تحسینِ ناشناس کا صائب ہے شکوہ سنج ۔ نفرینِ ناشناس کا ہم کیوں گلہ کریں (ریاض)

۲۔ دشمنوں کے کان بہرے

سُننے میں آیا ہے سمیع اللہ خاں صاحب بہادر سرسید پر واشمنے والے ہیں ارے بھئی کیا؟ ہاں شاید فرانس میں

جاکر ڈوئل ہوگی۔ نہیں نہیں صاحب من کیا بندوق پستول سمجھے۔ بھائی جان، نالش داغنے والے ہیں۔ ارے میاں کہو توکس بات کی۔ بات کیا وہی مدرسۃ العلوم کا ٹرسٹیز بل دعوا یہ ہوگا کہ جو قانون بے ضابطہ منظور کرالیا ہو خارج کیا جائے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب خاموش ہو رہے اور اس کے ساتھ ہی ممدوح زرا ہماری نظر سے کچھ اُتر سے گئے تھے کیوں کہ جب اس طرح چُپ ہو رہنے کا ارادہ تھا تو ٹھائیں ٹھائیں کیوں کی تھی۔ گھر جانی من مانی باتیں سید صاحب جو کچھ چاہتے کرتے آپ خبر نہ ہوتے مگر نہیں، معلوم ہوا کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر بھی دُھن کے آدمی ہیں اور دُھن کیا انصاف بھی ہو۔ ارے بھائی سید محمود ہزار بار سکریٹری مقرر ہوں عمر بھر کے لیے نہیں قیامت تک کے لیے۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر بھی تو کہتے ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سب سے پہلے سید محمود کی نسبت رائے دینے والا میں ہی ہوں گا ــــ گفتگو تو یہ ہو کہ جو کچھ تصفیہ ہو وہ باضابطہ ہو اس لیے بے شک مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر کو آخر تک کوشش کرنا چاہیے مگر اس کا خیال رہے کہ جھگڑے کا اثر سرسید کے سوا مدرسے پر نہ پڑنے پائے۔

نوٹ

'فتنہ' کے معاصرینِ عہد کا یہ تذکرہ تصویر کے دوسرے رُخ کی حیثیت سے تاریخ کا ایک اہم باب ہو۔

لوگ سرسید اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے اختلافات بھول گئے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ اختلاف کے باوجود قانونی خانہ پُری کے بعد مسٹر محمود کے لیے سب سے پہلے رائے دینے والے وہی مخالف مولوی سمیع اللہ خاں ہیں اور مولوی سمیع اللہ خاں کے طرفدار بھی۔ آخر یہ کہے بغیر باز نہیں رہتے کہ "جھگڑے کا اثر سرسید کے سوا مدرسے پر نہ پڑنے پائے۔"

۳۔ بیگم بھوپال

ہندستانی ریاستوں میں بھوپال کی یہ خصوصیت کہ وہاں نسلاً در نسلاً صرف بیگمات دادِ حکومت دیتی رہیں تاریخ عالم میں ایک امتیازِ خاص رکھتی ہو اور ان بیگمات میں نواب شاہ جہاں بیگم کا عہد بالخصوص چند در چند اسباب سے قابلِ لحاظ ہو۔

سب سے اہم بات یہ کہ بیگم نے اپنی خوشی اور اپنی پسند سے اپنا دُوسرا نکاح اس وقت کے ایک بڑے عالم مولوی صدیق حسن سے کیا۔

مولوی صدیق حسن صاحب دنیوی حیثیت سے بیگم کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے لیکن ان کا مذہبی غلو اور علمی وقار بل کے ایک بیگم کیا ریاست کیا تمام ہندستان پر اس وقت ان کا سکّہ چلائے ہوئے تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کے متعلق مشہور ہو کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہونا چاہا۔ شوہر نے پوچھا کون ؟ کہا ملکۂ انگلستان ! شوہر نے اندر آنے کی اجازت نہیں دی اور پھر پوچھا کون ؟ اب ملکہ نے کہا آپ کی کنیز۔ بس دروازے کھُل گئے۔

بیگم بھوپال بہ حیثیت ایک خودمختار حکمراں پہلے بے نقاب و حجاب رہتی تھیں مولوی صدیق حسن خاں نے شوہر کی حیثیت سے انھیں حکم دیا کہ پردہ کرو اور بیگم نے بہ حیثیت ایک فرماں بردار بیوی کے مدت العمر اس حکم کی پابندی کی۔

مولوی صدیق حسن کے مذہبی شغف سے عام مسلمانوں کو اختلاف تھا۔ ان کے انتقال پر مخالف اور موافق ہر قسم کی رائیں شائع ہوئیں۔

'فتنہ' ایک ظریف پرچے کی حیثیت سے ایسے موقع پر کب باز رہ سکتا تھا دیکھیے کیا بات میں بات پیدا کی ہو۔

(۱)

نواب صدیق حسن خاں کا ماتم ختم۔ دسویں بیسویں چالیسویں کا نام نہیں یہیں سے کہا جاتا ہو وہابیت میں، زندگی میں بھی خرابی اور مرنے پر ہزار خرابی۔

وزارت کا وہ حال کہ کبھی تو نوابی کی گدّی اور کبھی اصطبل کی سائیسی۔

نواب صاحب کے مرنے پر ایامِ عدت تک کے لیے وزیر کو کُل نظم و نسق کا اختیار دیا گیا تھا مگر رزیڈنٹ صاحب بیچ میں کود پڑے وزیر کو باہر توقف کا حکم دے کے سرکار سے ملاقات کی۔ کہا جب تک

آپ کام نہ کریں صاحب ایجنٹ انچارج رہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم ایک عاقلہ انھوں نے فوراً جواب دیا میں برابر کام کرتی ہوں اور کروں گی۔ ایجنٹ صاحب کے تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس دن سے تمام کام روبہ کاری میں ہوتا ہو منشی امتیاز علی صاحب کو کیا ان کی وکالت سلامت ہو پھر لکھنؤ میں براجیں گے البتہ یہ حکومت یہ شان و شوکت جاتی رہے گی۔

(۲)

نواب صاحب کے انتقال کے بعد ایام عدت کے اندر بیگم صاحب نے محتاجوں کو جوڑے تقسیم کیے اس خبر پر "رات کے خواب" کی سرخی قائم کر کے 'فتنہ' نے ایک نوٹ لکھا۔

(۳)

یہ نوٹ دیکھ کر میر ناصر علی اڈیٹر "صلائے عام" دہلی نے اڈیٹر 'فتنہ' کو لکھا:۔

"اُردو اخبار دیکھنے کا اگر کوئی نتیجہ نہیں تو بھی 'فتنہ' میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہو کہ مدت کی محنت ٹھکانے لگ جاتی ہو۔ 'فتنہ' میں ابھی "خواب" دیکھا واقعی غضب کا لکھا ہو۔ دیکھیں بھوپال سے کیا داد ملتی ہو۔"

فتنہ:۔ واقعی وہ مضمون اس مزے کا تھا کہ ناصر علی سا شہنشاہِ سخن اس کی داد دینے کو بے تاب ہو، راقمِ مضمون کے لیے یہ کیا کم خوشی کی بات ہو کہ ناصر نے داد دی۔

بھوپال سے داد کی کیا امید ہوسکتی ہو اور ہوسکتی ہو تو یہی، کہ راقمِ مضمون کو بھی شاید کوئی نیا جوڑا مل جائے ۔ لیکن ہم خوش ہوں گے اگر کوئی "پھٹا پرانا" جوڑا ملے پھر کیا ہو ان کی بھی چاندی ہو۔

(۴)

بلا ہو گھر مرا دشمن کے گھر سے   وہیں آبیٹھنا اُٹھ کر ادھر سے

والیۂ بھوپال نے بہ طور مالک کے ایک لاکھ دے کر شاہِ اودھ مرحوم کے محلات کلکتہ میں جگہ پائی ہو۔ ضعیف شاہِ اودھ کی حیات میں اگر یہ خواہش کی جاتی تو دینے کے بجائے کچھ لے کر جگہ مل سکتی تھی کیا اس عبارت کے کچھ معنی ہوسکتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ شاہِ اودھ محلات کی طرف سے بہت خوش نصیب تھے وفات کے بعد پرانا محل

دے کر نیا محل پایا۔

(۵)

سچّی محبت والی بی بیوں کی کیا بات ہو۔ والیۂ بھوپال کی سی بی بی خدا ہر ایک کو دے۔ میاں کی خطابی عزّت جب لوح کھسوٹ میں پڑی تو کیا کیا تلق کا اظہار کیا کسی پہلو کسی کروٹ چین نہ تھا ہر وقت انتشار سے تلے اوپر لیکن تقدیر کی بات جیتے جی اولادِ نرینہ کی طرح یہ تمنّا بھی حاصل نہ ہوئی میاں جب جنّت کو سدھارے تو کسی طرح گورمنٹ نے آنسو پونچھے۔ اس عزّت کی خوشی بیگم کو اس طرح حاصل ہوئی جیسے بے باپ کے بیٹے کی یعنی اس بیٹے کی خوشی جو پیٹ میں ہو اور باپ چل بسے۔

گورمنٹ نے اجازت دی کہ مرحوم کا نام سرکاری کاغذوں میں عزّت کے ساتھ لکھا جائے خیر یونھی سہی یہ تو کہنے کو ہوا۔ کہ بیگم نے کہا کر کے چھوڑا۔

۴۔ جسے داغ کہتے ہیں دوستو اسی روسیاہ کا نام ہو

دکن دال منڈی کے ناٹک میں رنڈیاں اکثر جناب داغ کی غزلیں گاتی ہیں اور ناٹک کی رونق اس سے اور دوبالا ہوجاتی ہو کہ آپ بھی چراغِ بزم بنے ہوئے اپنا کلام سُننے میں ہمہ تن محو ہوتے ہیں ـــ ایک روز غزل گائی جاتی تھی جب مقطع کی نوبت آئی تو رنڈی نے "جسے داغ کہتے ہیں دوستو" گاتے ہوئے ساری محفل کو متوجّہ کرکے داغ کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــ

اسی روسیاہ کا نام ہو

وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ سُنا ہو اس ذکر سے جناب داغ بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر اس سے زیادہ نیک اختری و خوش طالعی کیا ہوسکتی ہو کہ محبوب شاہی ناٹک میں اپنا مقبول کلام اس طرح سُنا جائے۔ راقم فقیر آزاد **فتنہ**۔ دال منڈی کے ناٹک میں رنڈی نے لفظِ روسیاہ سے یہ ضرور دکھا دیا کہ دال میں کچھ کالا ہو۔

۵۔ علامۂ منطقی

شمس العلما مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی سے کسی نے کہا کہ اگر بہشت میں کسی کو حقّے کی خواہش ہوگی تو وہ بھی میسّر آسکے گا ارشاد ہوا بہشت میں حقہ میسّر آنا تو ممکن ہو البتّہ اس کے واسطے دوزخ سے آگ لانے کی

زحمت لازمی ہو۔

۶۔ گائکوار بڑودہ

ایک مرتبہ گائکوار بڑودہ کو ایک انگلش کنٹری ہاؤس کے کرسمس بال میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ممبرانِ بال نے گائکوار کو ایک نہایت خوب صورت لیڈی سے مِلایا۔ گائکوار نے اس لیڈی سے استدعا کی کہ تم میرے ساتھ ناچو۔ لیڈی نے منظور کیا جب دونوں ناچنے لگے تو گائکوار کی نظر ایک ایسے افسر پر پڑی جو ہندستان میں ایک مرتبہ ان کو دھوکا دے چکا تھا۔ گائکوار نے اس خوب صورت رقاصہ سے کہا تم اس آدمی کو جانتی ہو ہیں اسے نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیڈی نے کہا وہ تو میرے شوہر ہیں۔

۷۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات

مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم نے "دل گداز" کے اجرا کے ساتھ یہ جدّت کی تھی کہ سن محمّدی کے حساب (بجائے ہجری) سے اسے جاری کیا تھا اور اسی سن کے اعتبار سے مہینے بھی محرّم وغیرہ کے عوض "حمل" وغیرہ قرار دیے تھے۔

سنِ محمّدی کے ماہِ "حمل" کو 'فتنہ' لے اڑا اور اس کی آڑ میں 'دل گداز' پر ریویو کرتے ہوئے وہ وہ لُطف لیے ہیں کہ واہی واہ۔

"حمل" کے پہلے ہی روز 'دل گداز' نے پیٹ سے پاؤں نکالے۔ خدا مبارک کرے۔ ملک و قوم کو چاہیے کہ اسے کنارِ شوق میں لے۔ ایسے ہونہار ہزاروں دُعاؤں پر بھی میسّر نہیں آتے۔ آج شررؔ اپنی قوم و ملک کے دل دادہ و شیدا نہ ہوتے تو ترقّی کُن خیالات کے اعتبار پر اس پرچے کی اور ہی صورت ہوتی۔ اس ہونہار کو حمل کے پہلے ہی روز لندن میں اگر پیٹ سے پاؤں نکالنے کا اتفاق ہوتا تو اس کو کیا کچھ حقوق اور یورپین برکتیں نہ حاصل ہوجاتیں۔ یہ امر بلا زحمت ممکن تھا کیوں کہ حسنِ اتّفاق سے جناب شررؔ کو لندن میں ایک مناسب زمانہ گزارنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ یہ بھی ضرور ہو کہ 'دل گداز' کے نکالنے کا خیال لندن ہی میں انھیں آیا ہوگا اور وہ اس خیال کو دل میں چھپائے یہاں لائے۔ یہ امر کہ 'دل گداز' کو لندن میں نکالنے کے عوض جناب شررؔ نے دکن سے نکالا محض مُلکی و قومی فخر حاصل کرنے کے لیے ہو ورنہ ترقّی کُن خیال والے لوگ ہونہار اولاد کے لیے "حمل" کے آخری ایام ولایت ہی

میں گزرنا پسند کرتے ہیں۔ جنابِ شررؔ باوصف قیامِ لندن قریب ہی زمانے میں یہاں چلے آئے کہ 'دل گداز' دکن ہی سے نکالیں۔ خدا کرے یہ ہونہار پرچہ ان زیوروں سے ہمیشہ لدا رہے جو جنابِ شررؔ بہ طور ہدیہ و تحفہ اپنے ساتھ لائے ہیں۔

۸۔ چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ڈیر فتنہ۔ شرخی کے شعر کے متعلق لکھنؤ میں نیز صفحاتِ 'فتنہ' میں عجب عجب روایتیں گھڑی گئی ہیں بعض حضرات میر علیہ الرحمۃ کی طرف اس شعر کو منسوب کرتے ہیں اور بعض صفدر مرزا پوری کو اس شعر کا مالک بتاتے ہیں یہ دونوں باتیں غلط ہیں اصل میں یہ شعر ہمارے دوست وحید مرحوم کی ابتدائی مشق کا نمونہ ہے۔
آپ ایک معزز وکیل کے صاحب زادے تھے فارسی میں ... اور عربی میں بھی کامل استعداد رکھتے تھے اور
رہنگوی کے شاگرد تھے

سدھارے۔ انتہائی فکر کے چند شعر میری زبان پر مرحوم کے ہیں ناظرینِ فتنہ ملاحظہ فرمائیں:

خدا حافظ ترا مجنوں میں جاتا ہوں بیاباں سے — کہ اب تو ہوگیا ہوگا یہی نقشہ مرے گھر کا

کس رنگ میں ان کو دیکھ پایا — اک عمر سے پھرتے ہیں برہنا

عدو کو یادگار اپنی وہی رومال دیتے ہو — یہ آنسو تم نے پوچھا تھا ہمارے دیدۂ تر کا

دو کوڑی کی بات

(خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی زبانِ اُردو کے ایک "مصلحِ استاد" کے علاوہ لکھنؤ اور "لکھنویات" کے ماہر کی حیثیت سے بھی اپنے ثانی آپ تھے ـــــ آپ کا قلم لکھنؤ کے ہر تاریک رُخ

کا روشن پہلو دکھانے میں کمال رکھتا تھا یہاں کی بٹیربازی اور کنکوے بازی تک میں فنی اصطلاحی معلومات کے علاوہ برسبیلِ تذکرہ جو حُسن آپ پیدا کرتے تھے وہ صرف آپ ہی کا حصّہ تھا ــــ ان مضامین کا دیکھنے والا بجا طور پر "عشرت" کو لکھنؤ کے دورِ گزشتہ کا ایک رونے اور رُلانے والا ادیب ہی سمجھ سکتا ہو لیکن "فتنہ" میں آپ کا ایک ظریفانہ "چٹکلہ" بھی نظر سے گزرا یہ مضمون ان کے مرتبے اور ان کی خصوصیات کے اعتبار سے تو کچھ نہیں لیکن ان کی شخصیت کے اعتبار سے ضرور محفوظ کر لیے جانے کے قابل ہو)

جو میونسپلٹی کا ممبر ہوکر قومی مرچ اور مذہبی تعصب نہ کرے اس کی بات دو کوڑی کی۔

جو رپورٹر ہوکر زیٹ نہ اُڑائے اس کی بات دو کوڑی کی۔

جو بنگالی ہوکر سودیشی کا "کوڑیا غلام" نہ ہو اس کی بات دو کوڑی کی۔

جو والیے ریاست ہوکر رزیڈنٹ بہادر کی کٹ پُتلی نہ ہو اس کی بات دو کوڑی کی۔

جو رئیس ہوکر گورمنٹ سے اعلا خطاب حاصل کرنے میں تمام دولت کو "خاک" سے نہ لگادے اس کی بات دو کوڑی کی۔

اس کا کیا علاج

(از "شوخ رقم" بدایونی)

(خاص خاص علمی اور ادبی حلقوں میں میر محفوظ علی بدایونی کی جو خصوصیات مشہور ہیں یہ مضمونچہ انھی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہو ــــ ممکن ہو اپنی شہرت "محفوظ" رکھنے کے لیے گم نامی کا یہ "شوخ" پردہ انھی نے ڈالا ہو۔)

آج صبح خفیف حرارت قبل دوپہر یا بعدِ زوال۔ حسبِ ذیل اضافہ۔

ــــ نہایت زور دار جاڑا۔ شدید تپ، سخت بے چینی، بھیجے میں درد، ہذیان سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب آئے انھوں نے فیور مکسچر تجویز کیا جس میں لکر ایمونیا، فیبٹرک ایتھر وغیرہ کے سوا دو ڈرام سوڈا ٹارٹ جس سے ایک پاخانہ ہو دو چار منم اسپرٹ کلورا فارم جو کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دے ــــ فیس لی چلتے پھرتے نظر آئے اسپرٹ نے جب اپنا اثر کیا تو اعزہ گھبرا اٹھے ــــ آدھی رات کو پسینہ آیا تو آنکھ کھلی بخار ندارد۔ بھوک موجود۔ کھانا حاضر خوب چکھا۔ صبح ہوئی پھر ڈاکٹر صاحب کو بُلایا اور ان کی رائے سے ایک اونس مگنیشیا نوش کر گئے پھر کیا تھا اسہال جاری اس کے ساتھ ہی

تی بھی - دن بھر دست تی رات بھر دست تی - صبح تڑکے گجردم پھر ڈاکٹر صاحب آئے ان سے شکایت کی کہ دست بند نہیں ہوتے اسی خوف سے یونانی قدح نوشی سے پرہیز کیا تھا کہ خمیرہ بنفشہ ملیّن نے اس فصل میں غضب ڈھایا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر نسخہ لکھا پینے کی دیر تھی کہ دست بند - دستوں کا رُکنا کہ قیامت آگئی دھڑیوں بخار ہذیان کے بدلے غفلت - سرسام دوڑ پڑا لینے کے دینے پڑ گئے اب سر پر برف باندھی جارہی ہو بھاپیے رکھے جارہے ہیں مگر یہاں کچھ بھی خبر نہیں - دو گھنٹے تک یہ کارروائیاں ہواکیں اسی عرصے میں حضرت عزرائیل نے دقّ الباب کیا چھٹّی پائی -

اب آپ ہی فرمائیے کہ اس حال کا کیا علاج ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ بدایوں شریف میں ان دنوں سردی گرمی نے مل کر اپنی وہ ہَوا باندھی ہو کہ یونانی حکیموں کی عقلوں میں چھید اور ڈاکٹروں کے حواس باختہ کردیے ہیں ۔۔ موٹی سمجھ والوں کو اتّحاد و اتّفاق کی خوبیوں کا اندازہ کرنے کا موقع اس سے اچھّا مشکل سے ہاتھ آئے گا شاید "چچا" نے اسی وقت کے لیے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ؎ دو دل یک شود بشکنند کوہ را

حجاز ریلوے

(مسلمانانِ ہند کو مسلمانانِ عالم کی مصیبت میں شریک ہوتے تو ہم نے بھی دیکھا ہو اور ان کی یہ خصوصیت مشہور بھی ہو لیکن مولانا ظفر علی خاں کی یہ نظم اس موقع مسرت کی ہو کہ جس میں تمام دُنیائے اسلام شریک تھی) ؎

تا بہ بطحا چوں براقِ آتشیں ریل آمدہ
ریوٹر برق آشیاں با ایں بشارت در رسید

اس خبر کا غلغلہ کون و مکاں میں پڑگیا
ساری دُنیا کے مسلمانوں کے گھر ہو آج عید

شکر میں جانیں کریں اپنی نچھاور کلمہ گو
یہ وہ وقتِ مبارک، ہو یہ وہ آنِ سعید

اہلِ یثرب نے سُنی انجن کی سیٹی کان سے
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی بھلا کوئی نوید

خوش ہو اے اسلام پہنچی ہو ترے مرکز پہ ریل
جس کو کہنا چاہیے قفلِ تمدّن کی کلید

فائدہ اس سے اٹھائے گا عجم بھی اس قدر
جس قدر ہوگا عرب اس کے اثر سے مستفید

پُر سپر اس نے کیے وہ رہ گزر اور کوہ سار
عقل جن کی مشکلوں سے ہوگئی تھی ناامید

اس سے انکار اب بھی ہوگا بعض لوگوں کو مگر — کیا کریں مجبور ہیں یہ واقعہ ہی چشم دید
کون ہی وہ جس نے ناممکن کو ممکن کردیا — کون ہی جس نے سیہ کو کر دکھایا ہی سپید
ابرِ رحمت بن کے برسا نائبِ ختمِ رسلؐ — سایۂ یزداں امیرالمومنیں عبدالحمید
جس سے قائم ہی مسلمانانِ عالم کا وقار — ہی مۓ جاں پرورِ اسلام کی جس سے کشید
جان کو اس کی ارادت سے ہی جتنا اتحاد — جسم سے ہرگز قریب اتنی نہیں حبل الورید
ای خدائے ذوالجلال اپنی کتابِ پاک میں — قربِ نصرت کا دیا تونے ہیں قولِ سدید
آیۂ لَیَستَخلِفنَّ کو نہیں بھولے ہیں ہم — لام نے بخشا ہی جس کو حُسنِ تاکیدِ اکید
کرچکا ہی گرچہ تو وعدہ یہ پورا ایک بار — اور نہیں اس میں نہیں ہی موقعِ گفت وشنید
ہوچکے ہیں ایک بار اقوام میں ممتاز ہم — علم وحکمت میں فرید اور جاہ وحشمت میں وحید
ہم میں پیدا ہوچکے ہیں سنجر و اورنگ زیب — ہم میں ظاہر ہوچکے ہیں بوعلی و بایزید
تیری رحمت کی نہیں لیکن کوئی حد وحساب — کس لیے ہو پھر نہ ہم کو خواہشِ لطفِ مزید
بخشنی قوت ہی یارب گر تجھے اسلام کو — جو نہیں ہرگز تری فرطِ عنایت سے بعید
عمرِ امیرالمومنیں کو دے صد وسی سال کی — دیر تک ہو سایہ افگن ہم پہ یہ فردِ فرید

عذرِ لنگ

"اکبر الہ آبادی مرحوم کا یہ قطعہ ؎

آتا نہیں ہی مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہی ہی کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر ہی جو کچھ کہ دال دلیا — سمجھو اسی کو پُلاؤ قلیا

مشہور ہی، لیکن اس کا جواب علامہ شبلی نعمانی کی زبان سے اب سُنیئے۔ شبلی مرحوم کا یہ عذر واقعی پانو کے سلسلے میں تھا۔"

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہی ملال — لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ معذور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں ۔۔۔ حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور[1] ہوں میں
مگر اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا ۔۔۔ اب تو اللہ کے اقبال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی۔ ورنہ ۔۔۔ زندہ در گور ہوں مرحوم ہوں مفقود ہوں میں

فتنہ۔ مشکور بمعنی شکر گزار غلط۔

اولڈ بوائے

مولانا شوکت علی نے علی گڑھ کو یونی ورسٹی بنانے میں ایک ان تھک کھلاڑی کی طرح جو محنت کی وہ ایک ہی ثبوت مادرِ کالج سے ان کی محبت کا نہیں ہے۔

علی گڑھ کی اس زمانے کی زبان "اولڈ بوائے" کا دوبارہ اجرا بھی زیادہ تر انھی کی سعی و تحریک کا رہینِ منت تھا۔

شوکت علی کے خواب کی مجسم تعبیر محمد علی اسی اولڈ بوائے کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

ایک میدان کا سپاہی ایک رزم کا سورما دیکھیے بزم میں کیسے نرم لہجے میں دادِ شیریں بیانی دے رہا ہے۔

زمانہ جن کو بھلا چکا تھا وہ پھر فسانے سنائے تونے ۔۔۔ ہوئے تھے جو دل سے محو نقشے ہمیں دوبارہ دکھائے تونے
بہت سنبھل کر بگڑ گئے تھے ہزاروں مل کر بچھڑ گئے تھے ۔۔۔ بہت سے بگڑے ہوئے سنبھالے بہت سے بچھڑے ملائے تونے
سبق اخوت کا بھول بیٹھے تھے گم گئی تھی کتابِ الفت ۔۔۔ پڑھایا آموختہ دوبارہ پرانے گر پھر بتائے تونے
یگانے بیگانے ہو گئے تھے رہی تھی یاروں میں بھی نہ یاری ۔۔۔ مگر بلا کا اثر ہے تجھ میں پرائے اپنے بنائے تونے
ہوا تغافل کی چل رہی تھی چمن میں مرجھا رہی تھیں کلیاں ۔۔۔ ہوا چلائی کچھ ایسی آ کر کہ سوکھے غنچے کھلائے تونے
اگرچہ تھے کچھ نیاز والے مگر زیادہ تھے ناز والے ۔۔۔ نیاز والوں کو گر نوازا تو لاکھوں روٹھے منائے تونے
کہیں قیامت کا صور پھونکا کہیں پکارا کہ قم باذنی ۔۔۔ ہزاروں سوتے جگائے تونے ہزاروں مُردے جلائے تونے

مگر یہ طرفہ ہے ابرِ رحمت چلا ہے کاشی سے سمتِ "کوِل"
یہ کیسی گنگا بہائی اُلٹی یہ کیا کرشمے دکھائے تونے

[1] دیکھو 'فتنہ' کا نوٹ

مرزا قتیل کا وطن

(بہ قلم مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)

مرزا غالب مرحوم نے کلکتہ کے ادبی مناظروں میں کہا تھا کہ قتیل، فرید آباد کا کھتری تھا، مَیں اسے فارسی میں سند نہیں مانتا۔ انھوں نے یہی بات بعض خطوں میں بھی تحریر کی ہو۔ جہاں تک ہمیں علم ہو اُن کے معاصرین میں سے کسی نے ان کو نہیں ٹوکا کہ آپ قتیل کا وطن فرید آباد کس طرح بتاتے ہیں؟ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بلا وجہ "فرید آباد" کا نام کیوں لے دیتے؟ پنجابی، پوربی، یا محض ہندی اور کھتری کہ دینا اُن کے استدلال کے لیے کافی ہوسکتا تھا۔

مرزا غالب کو مرے ہوئے اسی سال گزر چکے اور ان کی تعریض قریب ایک صدی کے پرانی ہوگئی۔ لیکن حال میں پھر یہ سوال تازہ کیا گیا ہو کہ قتیل کا وطن یا اصل مولد کہاں تھا؟

رسالۂ 'نگار' لکھنؤ کے ایک مقالہ نگار (مالک رام صاحب) نے قتیل کا خاندانی شجرہ بٹالہ (ضلع گرداس پور) سے بہم پہنچایا اور تحریر فرمایا کہ اس کے باپ کا نام درگاہی مل مسلّم ہو اور یہ نام سوائے پنجاب کے اور کہیں نہیں رکھا جاتا ـــــ اتفاق دیکھیے کہ اس وقت بھی فرید آباد کے جاٹ ذیل دار کا نام "درگاہی سنگھ" ہو۔ مذکورہ بالا شجرے میں "سنگھ" والے کئی نام درج ہیں۔ خود قتیل کا خاندانی نام دیوالی یا دیوانی سنگھ تھا۔

قتیل کے آبا و اجداد کی نسبت عام طور سے تسلیم ہو کہ ذات کے کھتری اور پہلے بٹالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ لیکن اس کے "جدِ سوم" یعنی پردادا نے دہلی کے قریب قصبۂ باغپت میں سکونت اختیار کی اور اس طرح یہ خاندان پنجاب کی بجائے دہلی یا اس کے مضافات کا باشندہ ہوگیا۔

رسالہ نگار (جون ۱۹۴۴ء) میں مختار الدین صاحب آرزو نے بڑی محنت اور قابلیت سے قتیل کے حالات مختلف تذکروں سے جمع کیے ہیں اور زیادہ وثوق سے عاشق عظیم آبادی کی شہادت پیش کی ہو جو قتیل کا ہم عصر اور اس کے ساتھ خط کتابت رکھتا تھا اور بڑی تفصیل سے اُس کے حالات تحریر کرتا ہو۔ اس نے قتیل کی ولادت

شاہ جہاں آباد (دہلی) کی بتاتی ہے۔ بعض اور معتبر تذکرے بھی اس کی وطنیت اور ابتدائی نشو و نما، دہلی کی تحریر کرتے ہیں مختارالدین صاحب کا بھی یہی خیال معلوم ہوتا ہے اور ہمیں ان کی تائید کرنے میں عذر نہیں؛ لیکن مضمون کے آخر میں جو وہ سوال کرتے ہیں کہ "آخر یہ فریدآباد اس کا وطن کیسے ہوگیا؟" جواب میں عرض ہے کہ اُس کے دہلوی کہلانے اور فریدآبادی ہونے میں کوئی تناقض نہیں ہے کیوں کہ فریدآباد، دہلی کے مضافات میں داخل اور دریاے لطافت میں اس کا نام نظام الدین، مہرولی وغیرہ کی طرح دہلی کے محلوں اور بازاروں کی ضمن میں تحریر کیا گیا ہے۔ (باب سوم۔ فصلِ اوّل) اور یہ وہ کتاب ہے جس کے آخری دو باب خود مرزا قتیل نے لکھے تھے۔

تاریخوں، تذکروں سے قطع نظر خود فریدآباد کا محلِ وقوع اور دہلی سے تعلقات ایسے رہے کہ اگر کوئی تذکرہ نویس قتیل کو ایک نواحی بستی کی تفصیل لکھنے کی بجاے، اجمالاً دہلوی لکھتا ہے تو اُسے غلط نہیں کہ سکتے۔

فریدآباد میں اس وقت بھی ایک کھتری خاندان موجود ہے جو کئی پُشت سے یہاں بود و باش رکھنے کے باوجود "دِلوال" یعنی دہلوی کہلاتا ہے اور اس کے خاندانی تعلّقات نیز مذہبی مراسم اور تعلیم و تربیت اکثر شہر دہلی سے وابستہ رہے ہیں۔ چالیس پچاس برس پہلے تک ان کی تعلیمی اور ادبی زبان فارسی تھی اور اس سے ایک صدی پہلے، یعنی قتیل سے کچھ بعد زمانے میں ان کی شاعری اور زبان دانی فریدآباد میں مسلّم تھی جیسا کہ قدرت اللہ قاسم وغیرہ بعض معاصرین کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے[1] قرینہ کہتا ہے کہ قتیل اسی خاندان سے تھے اگرچہ جوانی میں مسلمان ہوجانے کی وجہ سے ان کا اپنے خاندان سے قطع تعلق ہوگیا اور باقی عمر بھی انھوں نے سیر و سیاحت میں اپنے وطن سے باہر بسر کی۔

بہرحال اتنا یقینی ہے کہ غالب نے جو قتیل کے قریب العصر اور دہلی کے رہنے والے تھے، اس کے فریدآبادی ہونے کا حال کسی سے سُنا ہوگا۔ ورنہ خود وہ اس کا وطن تصنیف کرتے، یہ بہت بعید از قیاس بات ہے۔ پس جب تک ان کے کسی ہم عصر کی تردید میسّر نہ آئے ہم عالیہ ردّ و قدح کو ان کے بیان کی تکذیب کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔



[1] مثلاً دیکھو مجموعۂ نغز حالات عبدالصمد فدا فریدآبادی

تبصرے

ادبیات

اُردو غزل اور اس کی نشو و نما (سید رفیق حسین الہ آباد)

اس تحقیقی و تنقیدی مقالے میں جو جامعۂ الہ آباد کی ڈی، فل کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا ہو مصنف نے ابتدائی زمانے سے ۱۸۵۷ء تک اُردو غزل کی نشو و نما دکھائی ہو، جیسا کہ عنوان کی وسعت اور خود کتاب کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہو مصنف نے اصل مآخذ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو اور ان کی تلاش میں مختلف جہات میں شدِ رحال بھی کیا ہو مگر ہماری راے ناقص میں ان کی محنت کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہو، اُردو غزل کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد کی تبدیلی جو اصل موضوع کتاب ہو محض ثانوی اور ضمنی درجہ رکھتی ہو، کل مدت کو چھ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہو اور ہر دور کے آخر میں دو دو تین تین صفحات میں عام خصوصیات کے عنوان سے غزل کا لفظی و معنوی تجزیہ کر دیا گیا ہو، ظاہر ہو کہ اس سطحی تبصرے و تحلیل میں دادِ تحقیق کہاں تک دی جا سکتی ہو، تمام تر وہی خصائص جو متداول اَدبی تاریخوں میں ملتے ہیں بہ اختلافِ الفاظ نقل کر دیے ہیں۔

رفیق صاحب نے ہر دور کے ممتاز شعرا کے خدوخال، تحقیقِ نسب، حالاتِ زندگی، افتادِ مزاج وغیرہ کا شرح و بسط سے تذکرہ کیا ہو مگر کلام کی تنقید محققانہ شان نہیں رکھتی، موضوع کے لحاظ سے واجب تھا کہ ہر دور کے شعرا کے کلام سے سیر حاصل بحث کی جاتی اور مقابلہ و موازنہ کیا جاتا، ہر شاعر کی فرداً فرداً سوانح نگاری خارج از موضوع ہو۔

مصنف نے دیباچے میں اپنے انکشافات کی جو فہرست دی ہو وہ فی نفسہ کتنے ہی وقیع اور مہتم بالشان سہی مگر ان کے مقصد سے زرا نسبتِ بعید ہی رکھتے ہیں مثلاً دیوانِ غالبؔ کی طبعِ اوّل کے بارے میں کچھ معلومات' (۲) میر و ناسخ و آتش کے کچھ نئے حالات۔ (۳) جرأت کے مراثی وغیرہ کی سراغ رسانی، (۴)

قلی قطب شاہ کے تخلصوں کی تحقیق وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے شروع کے پانچ بابوں میں کوشش کی گئی ہو کہ مشہور مغربی نقادوں کی تعریفِ شاعری نقل کر کے محاکمہ کیا جائے۔ نیز اُردو، عربی، فارسی، ہندی اور روسی و ترکی غزلوں سے بحث کی ہو مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ یہ حصہ بیش تر خام اور کہیں کہیں مہمل ہو مثلاً جہاں فلسفیانہ شعر کے حدود بیان کیے ہیں یا میتھیو آرنلڈ اور ارسطو کے نظریاتِ شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہو۔ جہاں کسی شعر کے مطالب بیان کرنے میں اُپج کی لی ہو وہاں کہنا پڑتا ہو کہ شعرفہمیِ عالمِ بالا معلوم شد۔ صفحہ ۵۹ پر ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند الخ کی شرح، ؎

محرم نہیں ہو تو ہی نواہاے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہو پردہ ہو ساز کا

کی تعریف میں رفیق صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر کا صحیح لطف علمِ لاسلکی کے وجود میں آنے کے بعد اُٹھایا جاسکا ہو، آج سے صرف دس برس پہلے بھی پوری طرح حظ حاصل نہیں ہوسکتا تھا !!! آتش کی ایک غزل نقل کر کے فرماتے ہیں آتش کے متصوفانہ کلام کی وہی داد دے سکتے ہیں جو ڈیکارٹ، سپنوزا اور لائبنٹز کے فلسفۂ مابعدالطبعیات سے آشنا ہیں !!! العجب ثم العجب، ایک نئی تحقیق یہ بھی ہو کہ غالب کے بعض بہترین اشعار میرحسن کے اشعار سے ماخوذ ہیں، مستقبل میں غزل کی ازسرِنو مقبولیت و ترقی کی بہت پُرلطف توجیہ کی گئی ہو، از روے ارثماطیق ثابت کیا گیا ہو کہ چوں کہ غزل پہلے اور دوسرے دوٗر کے بعد تیسرے دوٗر میں اور چوتھے پانچویں دوٗر کے بعد چھٹے دوٗر میں چمکی ہو (اس لیے نواں دوٗر آنے پر) "بیسویں صدی کے آخر میں غزلوں کی طرف پھر رجحانِ طبع کا ہونا لازمی ہو"

بارھویں باب میں لکھنؤ اور دلّی کی غزل گوئی کا موازنہ کیا گیا ہو اور لکھنؤ کی غزل گوئی پر شعرالہند کے اعتراضوں کا الزامی جواب دیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں اس قدر عرض کرنا کافی ہو کہ چوں کہ اعتراضات ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں کے کلام پر وارد ہوتے ہیں اس لیے مماثل اشعار دلّی کے ہم عصر شعرا کے دینے مناسب تھے، دورِ ماسبق کے شعرا میرؔ، سوداؔ اور انشاؔ کے بتذل اشعار پیش کرنا زرا زیادتی ہو۔ (ش۔ ح)

مُداوا (فرقت کاکوروی، یوسفی پریس، لکھنؤ، للعہ)

ادبی بے راہ روی کی اصلاح کا ایک موثر نیز پُرلطف طریقہ یہ ہو کہ کسی مصنف کی خامیوں پر اعتراض و

نکتہ چینی کرنے کی بجائے خود اسی رنگ میں اس انداز پر لکھا جائے کہ اس اسلوب کی بے اعتدالیاں مضحکہ خیز حد تک نمایاں ہوجائیں، اگر خاکہ اُڑانے میں دل آزاری کا پہلو نہ ہو تو مصنف ان غلطیوں کو جن کی طرف خود اس کی نظر کبھی نہیں گئی تھی درست کرلیتا ہے، فرقت کاکوروی صاحب نے اسی قسم کی کوشش کی ہے مگر ہماری دانست میں وہ ترقی پسندوں کو اعتدال پر لانے میں خود جادۂ اعتدال سے منحرف ہوگئے ہیں۔ انھوں نے موجودہ ترقی پسند شاعری کو عروض، ترنم، خوش آہنگی اور موسیقیت سے آزادی، اصولِ زبان سے بے زاری، نظمِ اُردو کے مناہج ارتقا سے روگردانی، جدید ترین مغربی ادب کی کورانہ تقلید، مسخ شدہ انقلابی خیالات کی تبلیغ، مبہم تحت الشعوری کیفیات کے مہمل بیان اور شہوانی جذبات کے بے شرمانہ اظہار کی مرادف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر فرقت صاحب نے اس مجموعے میں ایسے مضامین بھی شامل کیے ہیں جن کا موضوع زیادہ وسیع ہے اور جن میں جدید ادبی نظریات کی معقولیت ہی سے سرے سے انکار کیا گیا ہے مضامین کے انتخاب میں زیادہ سلیقے کی ضرورت تھی، بہت سے مضامین تو ایسے ہیں جو داخلِ کتاب کرنے ہی نہیں چاہیے تھے اور بعض میں ایک ہی بات کی مختلف پیرایوں میں تکرار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب عجلت میں مرتب کی گئی ہے، فرقت صاحب کی نظموں میں بھی بدیہہ گوئی کی خامی نظر آتی ہے، قلم برداشتہ لکھنے کی وجہ سے ان کی نظمیں محض بے تکی ہوکر رہ گئی ہیں ترقی پسند شاعری کا پُورا پُورا دھوکا نہیں ہوتا ع عیبہا جملہ شمردی ہنرش نیز بگو۔

بہرنوع فرقت صاحب کی سعی مستحسن ہے اور امید ہے کہ مشکور بھی ہوگی، پاکیزہ مذاق طبقے میں جدید مزخرفات کبھی مقبول نہیں ہوئی تھیں مگر ضرورت تھی کہ خود ترقی پسند شاعر اپنے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں اور تجدد پسند طبقہ اس بدعت پر متنبہ ہو۔ اس کتاب میں نیاز فتح پوری، سید مسعود حسن رضوی، رشید احمد صدیقی، جعفر علی خاں اثر۔ اور عندلیب شادانی کے مضامین سنجیدہ تنقید کے نمونے ہیں۔ خود سجاد ظہیر صاحب جو اس تحریک کے امام رہ چکے ہیں موجودہ روش کو مذموم قرار دیتے ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ترقی پسند شاعری کے مخالفوں اور موافقوں دونوں کے لیے سودمند ہوگا۔ (ش۔ ح)

نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے

(مصنفہ علی عباس حسینی، مکتبۂ جامعہ لکھنؤ، عمہ)

اس گل دستے میں چھ ڈرامے تاریخی ہیں اور تین سماجی، مگر سب میں

جو چیز مشترک ہی وہ مصنف کی حب الوطنی ہی، تاریخی ڈراموں میں گوتم بدھ کے طریق تبلیغ، بغرا خاں کی پدری شفقت اور کیقباد کی سعادت مندی، جلال الدین خلجی کی سادہ لوحی اور علاء الدین کی محسن کشی، بابر کی ہمایوں پر سے جاں نثاری، سوتیلی ماں کی دسیسہ کاری سے تنگ آکر شیر شاہ سوری کی آبائی جاگیر سے دست برداری اور ملک گیری کی ابتدا اور چاند بی بی کی شجاعت و سرفروشی کی حکایتیں بہت سادہ مگر دلچسپ پیرایے میں بیان کی ہیں جن کو پڑھ کر بچوں، بڑوں اور بوڑھوں سب کے دل میں شاہان سلف کی سچی قدر و منزلت پیدا ہوتی ہی۔

دل بہلاوا، سوانگ اور کیڑا تینوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اول الذکر مزاحیہ ہی جس میں یہ دکھایا ہی کہ خانہ نشین مستورات گھر بیٹھے کس طرح وقت گزاری بلکہ تفریح طبع کے سامان کرلیتی ہیں، سلما کی گفتگو نہایت چٹخارے دار اور بامحاورہ ہی۔

سوانگ مزاحیہ نیز اصلاحی ہی، جس کا لُب لباب یہ ہی چھوت چھات اور جات پات کی سختی بحالہ ہی صرف اس قدر ہوا ہی کہ اعلا طبقے کو اس کا احساس پیدا ہوا ہی اس خیال کا حقیقت بننا ابھی دور ہی۔

کیڑا میں اس ناقابل انکار حقیقت کو افشا کیا ہی کہ ازدواج کا حقیقی مقصد نفس پروری و عیش کوشی نہیں بلکہ افزایش نسل اور عورت کی خواہش اُمویت کی تسکین ہی۔

کتاب میں ایک آدھ بات کھٹکتی ہی مثلاً جذباتی میں کیقباد کی محفل نشاط میں خواجہ حافظ کا جو زمانۂ مابعد کے شاعر ہیں شعر کیقباد سے پڑھوانا محل نظر ہی۔ ہر ملک ملک ماست میں خواص سلیمان کی بلائیں لے کر اس کے سر پر تاج دیکھنے کی آرزو کرتی ہی حالاں کہ سلیمان کا باپ فرید خاں موجود ہی، بہ الفاظ دیگر فرید کو منھ در منھ کوستی ہی۔

فی الجملہ کتاب قابل تحسین ہی۔ (ش - ح)

نراس

(مصنفہ نورالحسن، حیدرآباد بک ڈپو، ۱۲/)

ہمیں بادل ناخواستہ کہنا پڑتا ہی کہ اس مجموعے میں تمام کہانیاں معمولی درجے کی ہیں، قصے وہی فرسودہ ہیں کہ غریب لڑکی کی امیر رشتے داروں میں شادی نہیں ہوسکتی، لڑکا اور لڑکی دونوں آتش فراق میں جلتے ہیں، بے زبان لڑکی کی شادی کردی جاتی ہی مگر لاج کی ماری خوش اسلوبی سے نباہتی ہی گویا بہ یک وقت دو مردوں سے خالص محبت کرنے کا معجزہ دکھاتی ہی، یا یہ کہ عورت شوہر کے چال چلن پر بے جا شُبہہ کرتی ہی اور غلط فہمی کی بنا پر خودکشی کر بیٹھتی ہی، یا اس

کے برعکس شوہر معصوم بیوی کی پاک دامنی پر شک کرتا ہو اور آتشِ حسد سے بھڑک کر بیوی کو زدوکوب کرتا ہو حتّٰی کہ بےچاری موت کے گھاٹ اُتر جاتی ہو وغیرہ وغیرہ۔

مصنف نے بعض جگہ ٹھیٹ دکنی محاورے استعمال کیے ہیں، ہم مقامی بولیوں کے محاورات یا الفاظ برتنے کے خلاف نہیں، بہت سے دیہاتی الفاظ ایسے ہیں کہ کتابی اُردو میں ان کے مُرادف موجود نہیں، اسی خیال کو کسی اور پیرایے میں ادا کیا جائے تو ایک کی جگہ کئی لفظ لانے سے بھی وہ لُطف نہیں آتا کیوں کہ بلاغت مفقود ہوجاتی ہو مگر ہم ست بجھڑی اُردو کے ضرور خلاف ہیں۔ نورالحسن صاحب نے اس کتاب میں شمالی ہند کی زبان لکھی ہو اور خصوصًا دلّی کے محاورات برتے ہیں اس میں دکنی محاورات کا پیوند ان مِل بےجوڑ ہو مثلاً بھگت کاڑنا، کھڑے اُدبھے، اَبا اَبا (کلمۂ استعجاب)، نقی پاپا، حسبہ، وغیرہ مقامی الفاظ کا صحیح مصرف مقامی رنگ پیدا کرنا ہو۔

بیانِ حکایت میں ضعفِ تالیف بھی پایا جاتا ہو مثلاً عمرِ رفتہ میں لئیق کو سلمٰی کی بچپن کی سہیلی بتایا جاتا ہو مگر سلمٰی اس کے سامنے اپنی ساری داستان اس طرح بیان کرتی ہو جیسے لئیق اس سے قطعًا ناواقف ہو، ایک موقع پر سلمان، سلمٰی کو اسٹیشن پہنچانے آتا ہو، گاڑی روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد رُک جاتی ہو، معلوم ہوتا ہو کہ ایک نوجوان جو دُلھن کو بیاہ کر لے جارہا تھا ریل میں سے گر کر مرگیا، سلمٰی کو وہم ہوتا ہو کہ دولھا سلمان تو نہیں ہو جس نے زبردستی شادی ہونے پر گر کر جان دے دی ہو، تعجب ہو ایک گھنٹے کے اندر سلمان کی شادی بھی ہوگئی اور وہ اسی چلتی گاڑی میں برات لے کر بیٹھ بھی گیا تھا!!!　　(ش۔ح)

ہماری گلی

(احمد علی، انشا پریس، دہلی، قیمت ۱۲/۱ عہ)

احمد علی صاحب ترقّی پسند اُدبا کے زمرے میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ان کی شہرت ہندستان سے نکل کر انگلستان تک پہنچ چکی ہو کیوں کہ ان کے افسانے اور مضامین جو اکثر اُردو سے ترجمہ ہوتے ہیں انگریزی کے موقّر رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، ان کا ناول Twilight in Delhi انگریزی حلقوں میں مقبولیت پاچکا ہو، اُردو داں طبقے میں بھی ان کی تحریروں کا چرچا ہو بلکہ آج سے بارہ سال قبل "انگارے" میں جو ان کے مضامین نکلے ان پر ہنگامہ بپا ہوچکا ہو۔ جنسیاتی مسائل کا بےباکانہ بیان آپ کی خصوصیت ہو مگر غنیمت ہو کہ مرورِ زمانہ اور پختہ سالی کے ساتھ ان کی تحریروں میں عریانیت کا عنصر کم ہوتا جارہا ہو، تاہم اِس نقص یا

وصف سے قطع نظر احمد علی صاحب کی کہانیوں میں جو شگفتگی و تازگی اور ماحول نگاری کا لطف ہو وہ جدید انگریزی ادب میں عام سہی مگر اُردو میں اب بھی شاذ ہو۔

زیر بحث کتاب 'ہماری گلی' ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کے سات افسانوں کا مجموعہ ہو، جن میں بہترین ہماری گلی اور میرا کمرہ ہیں جو مختلف رسائل میں چھپ کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ میرا کمرہ میں موچی کی اور ہماری گلی میں مرزا دودھ والے، شیرا چنے والے اور نثار احمد موذن کی قلمی تصویریں ناقابلِ فراموش ہیں۔ میرا کمرہ میں جزئیات و تفصیلات نہایت خوبی سے بیان ہوئی ہیں خصوصاً شیطان اور لینن کا مکالمہ لطف سے خالی نہیں، مگر افسوس ہو کہ مکالمہ تشنہ رہ گیا ہو مزید تبادلۂ خیالات دِل چسپ رہتا۔

مارچ کی ایک رات مجموعے میں سب سے لمبی کہانی ہو جس میں مصنف کا اصل رنگ عود کر آیا ہو، شاہدانِ بازاری کی زندگی کی جھلک واقعیت پر مبنی ہو اور اس طبقے سے نفرت دلانے کی بجائے اس پر رحم دلاتی ہو، اگر دو چار عریاں جملے حذف کر دیے جاتے تو افسانے کی معنوی خوبیوں میں کوئی فرق نہ آتا۔

شکنتلا اور مسٹر شمس الحسن معمولی درجے کی کہانیاں ہیں۔ شکنتلا کی موت ناقابلِ یقین ہونے کی حد تک سفاکانہ ہو بے موقع نہ ہوگا اگر آخر میں انشا کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، گو زبان بہت خوب ہو مگر جملوں کی بندش کہیں کہیں چست نہیں ہو، صرف ربط اور ضمائر کی کثرتِ استعمال سے روانی میں کمی آگئی ہو، بعض الفاظ کا اِملا غلط ہو مثلاً کوابی، عزیز خیراتی، تن و مند محل میں مُدت لگ گئی، مغلے زاد گالیاں، مطین، نیز ایک ادیب کے قلم سے "خرامہ روی سے ٹہلنا" نکلنا محلِ تعجب ہو، ایک جگہ ہٹلر کو اختناقی لکھا ہو، ذہن مرضِ اختناق الرحم کی طرف منتقل ہوتا ہو مگر اختناقی سے Hysteric مراد لی ہو۔

سوا سو سے کچھ اوپر صفحات کے کتابچے کی قیمت عہ۱۲ ذرا زیادہ ہو۔ (ش۔ ح)

سنگ و خشت

(مصنفہ کنہیا لال کپور، صہ۱۵۸، مکتبۂ جدید لاہور، قیمت عہ)

طنز قوم کے اخلاقی معائب، افراد کے نقائص، سیاسی بدعنوانیوں اور ادبی بے راہ رویوں کی اصلاح کا نہایت موثر و مجرب پیرایہ ہو، مگر طنز نگاری میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنا نہایت مشکل ہو، اس کی شرطِ اوّلیں یہ ہو کہ مصنف کی نیت خالص ہو یعنی مقصود بالذات تضحیک یا دل آزاری نہ ہو بلکہ غلطی پر متنبہ کرنا ہو،

طعنہ زنی سے کج رو پر مصر کرنا نہ ہو بلکہ غیرت دلاکر راہِ راست پر لانا ہو، کنہیالال کپور صاحب کی کتاب سنگ و خشت اس اصول کا مصداق ہے، صاحب موصوف خود جواں سال انگریزی داں ادیب ہیں، چناں چہ انھوں نے اردو افسانہ نویسی اور جدید شاعری کی بے اعتدالی کا جو پُرلطف خاکہ اُڑایا ہے اُسے تعصب یا قدامت پرستی پر مبنی نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس پر سے کیا لُطف جو غیر پردہ کھولے :: جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے ۔ صادق آتا ہے۔ ترقی پسند پر اُن کی تنقید مزاح آمیز مگر منصفانہ ہے، ان مضامین کا اصل مقصد آپ کی تفریح طبع ہے مگر ان کا مطالعہ فائدے سے بھی خالی نہیں ۔ مثلاً علامہ ظہور میں ہماری مخصوص مُردہ پرستی کا اچھا مذاق اُڑایا ہے۔ اسی طرح اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے میں ظرافت و سنجیدگی دونوں سموے ہوے ہیں شاعروں کی بھرمار، ادب کی ناقدری، تنقید کی پستی، فرقے دارانہ بھوٹ پر جائز چوٹیں کی ہیں۔ حفیظ جالندھری کے جس بند پر مضمون کی تان توڑی ہے اس میں لطیف طنز پنہاں ہے۔ اُردو افسانہ نویسی کے چند نمونے اور فرقت صاحب مصنفِ مداوا' کے رنگ میں غالب جدید شعرا کی مجلس میں بہترین مضامین ہیں، قومی لباس میں خاصی جدت پائی جاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کی کج بحثی اور ہماہمی کا ظریفانہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔

کپور صاحب جوہرِ قابل رکھتے ہیں نقشِ اول بتا دیتا ہے کہ مشقِ سخن جاری رہی تو نقشِ ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ اگر زبان کی طرف توجہ کی جاتی تو انھی مضامین کا لُطف دوبالا ہوجاتا۔ "ہم نے مسافر خانے یا ہوٹل میں ایک آدھ گھنٹے ٹھہرنا ہے" یا "قریب المرگ" یا " ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی" وغیرہ وغیرہ کو آپ کیا کہیں گے، کپور صاحب سے یہ شکایت کہ وہ انگریزی میں سوچ کر اُردو میں لکھنے کی وجہ سے کبھی کبھی انگریزی محاوروں کا "تحت اللفظ" ترجمہ کرجاتے ہیں فضول ہے کیوں کہ آج کل جدید مصنف الا ماشاء اللہ سب اس میں بتلا ہیں۔ دلچسپی لینا، نتیجے پر پہنچنا اسی قبیل کی جدت نما نقالی ہے جس پر اعتراض کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ (ش ۔ ح)

شباب و انقلاب

جناب عبدالخالق نہال سیوہاروی کا منظوم کلام۔ تقطیع صفحات ۲۰۴ مجلد، خوب صورت گرد پوش۔ کاغذ اور کتابت عمدہ۔ قیمت تین روپے۔ ناشر مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

نہال صاحب کے مزاج کی طرح ان کا تخیل بھی سادہ ہے یعنی پیچ دار نہیں۔ وہ راست بیں

اور راست گفتار معلوم ہوتے ہیں۔ رنگیں بیانی اور لطیف فن کاری کے نمونے اس مجموعے میں کثرت سے ملتے ہیں لیکن غلو کی اُڑان اور تصنع کے غوطے بہت کم۔ زبان صاف دلّی کی، جہاں وہ برسوں سے رہتے ہیں اس پر مرزا سائل کا مشورہ۔ طبیعت دار نوجوان تھے۔ مزاج میں شعریت تھی۔ دہلی آرہے۔ پھر کیا پوچھنا۔ اگر نئی اُردو شاعری کا موجد ذوق کا شاگرد اور نئی شاعری کو پروان چڑھانے والا غالب کا شاگرد اور فلسفۂ خودی کی تفسیر و تبلیغ کرنے والا داغ کا شاگرد ہوسکتا ہے تو سائل کے شاگرد کا آج کل کے رنگِ سخن میں نام پانا کون سی اعجوبہ بات ہے۔

نہال صاحب کا طرزِ سخن زعیمانہ ہے۔ کہیں کہیں انقلابی رنگ کی جھلک پڑتی ہے۔ خمریت بھی اعتدال کے ساتھ ہے جو کہتے ہیں اسے دل چسپ بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ مُصنّف کی نظر کی وسعت، دل کی فراخی اور تخیل کی بلندی کی شہادت دیتا ہے۔ اس میں غزلیں اور رُباعیاں بھی ہیں۔ اور نظمیں بھی۔ نظمیں جامعیت پر حاوی معلوم ہوتی ہیں چناں چہ اگر بعض نظموں کے موضوع ہیں، رزمِ زندگی، نعرۂ مردانہ، نوائے وقت وغیرہ تو بعض کے موضوع ہیں طلوعِ آفتاب، برسات، پروانہ۔ سماجی منظر کشی آج کل کے رنگ میں ہے اور خاصی ہے۔ نہ ان سے جوانی چھوٹی نہ غلاموں کی دنیا۔ ہمہ گیری ان دنوں عام میلان ہے اور نہال صاحب بھی اس میں ماہر ہیں۔ اگر کہتے ہیں:۔

کون آگیا یہ زُلف کو برہم کیے ہوئے
سامان انتشار دو عالم کیے ہوئے
ساقی ایاغ بادۂ رنگیں کہ زُہد خشک
ہے عیش زندگی کو جہنم کیے ہوئے

تو یوں بھی سخن سرا ہوتے ہیں:۔

تخیل مطمئن ہوتا نہیں اگلے حقائق پر
نمایاں جذبۂ تحقیق نو ہے نکتہ دانوں میں

رگوں میں جوش زن ہیں ولولے تسخیرِ عالم کے
جوانی کی اُمنگیں جاگ اٹھیں نوجوانوں میں

یہ زمانہ تنوع پسند ہے۔ معاشرت ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ ایسے عوارض میں انفرادیت کا سوال اٹھانا بے سود ہے۔ ہمہ گیری کے بعد ہی شاعر ایک رنگ پر اس مضبوطی سے ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے اس طرح اپنا لیتا ہے کہ وہی اس کا خاص کہلاتا ہے۔ یہ وقت نہال صاحب کی زندگی میں ضرور آئے گا۔ ان کا کلام زبردست امکانات کو لیے ہوئے ہے۔ فراری رنگ سے وہ کوسوں بھاگتے ہیں۔ انھیں کام کی بات اور مفید بات کہنے کا خیال رہتا ہے۔ یہ مجموعہ اُردو نظم میں ایک تازہ اور عمدہ اضافہ ہے جس میں ہر شخص کی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔ (ک)

Vol. 25 January 1945 No. 1

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Delhi.

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ع سے رسالۂ ‹ سائنس › بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ رپے ششماہی دو رپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:-

معتمد مجلس ادارت رسالۂ ‹ سائنس ›

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:- رسالۂ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع) تک دفتر انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے بہ قیمت ایک رپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 25 January 1945 No. 1

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Delhi.

جلد ۲۵ اپریل ۴۵ء نمبر ۲

اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:- عبدالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

۱ - یہ انجمن ترقئ اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے -

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم آج کل تقریباً سوا سو صفحات، جب کہ قوانین کنٹرول کے سبب کاغذ نپا تلا ملتا ہے -

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے - نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے -

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقئ اردو (ہند)، ۱۰۱ دریا گنج - دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقئ اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے -

المشـــــــــــتہر

انجمن ترقئ اردو (ہند)، دہلی

نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنے پورا ایک صفحہ	۱۶ روپے	۶۰ روپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۹ روپے	۳۲ روپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۵ روپے	۱۸ روپے

اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے - غیرمہذب اشتہارات شائع نہیں کیے جائیں گے -

المشـــــــــــتہر

انجمن ترقئ اردو (ہند)، دہلی

جلد ۲۵ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء نمبر ۲

اُردُو

انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:- عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) دہلی

اُردوٗ

جلد ۲۵ اپریل سنہ ۶۴۵ نمبر ۲

فہرست مضامین

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلّی ماراں دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

خواجہ میر دردؒ کے زمانے کی سیاسیات*

(جناب مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی)

خواجہ صاحب کی وفات کی تاریخ ۱۱۹۹ ہجری اس مصرع سے نکلتی ہے: ؎

حیف دُنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

ایک جگہ ولادت ۱۱۳۳ ہجری لکھی ہے لیکن اگر اڑسٹھ سال کی عمر پائی، جیسا کہ اکثر تذکروں میں تحریر ہے تو سنِ ولادت کچھ پہلے ہوگا۔ عیسوی حساب سے، ہم اُن کا زمانہ اجمالاً ۱۷۲۰ تا ۱۷۸۴ قرار دے سکتے ہیں۔ انھی دِنوں بادشاہ گر سادات کی سیادت گردش میں آئی۔ روشن اختر محمدشاہ بادشاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اسلامی نظر سے دیکھیے تو اس سے بھی زیادہ تابناک واقعہ یہ ہے کہ پُرانی دہلی میں، جسے انگریزوں نے اب دوبارہ نیا کردیا ہے، شاہ ولی اللہؒ نے مسندِ ارشاد پر قدم رکھا اور تجدیدِ دین کے ایک نئے دَور کی ابتدا ہوئی۔

۱۱۳۲ھ کے رمضان میں چند زلزلے اس شدّت کے آئے کہ دلّی کی شہرپناہ کئی جگہ سے شق ہوگئی۔ مسجد فتح پوری کے تین کنگرے ٹوٹ کر گرے۔ بڑی بڑی عمارتیں جڑ بنیاد سے ہل گئیں۔ بعض لوگوں نے اس آفتِ سماوی کو سلطنت کے حق میں فالِ بد بتایا۔ مگر سچ پوچھیے تو سب سے بُری فال خود لوگوں کے بد اعمال تھے۔ عربی مثل ہے جیسے اعمال ویسے عُمّال۔ تقدیر نے رنگ میں رنگ ملادیا۔ یعنی رنگیلی رعایا کے لیے رنگیلے بادشاہ کا انتخاب کیا۔

ساداتِ بارہہ کا قلع قمع ہوجانے سے مغلوں کی بادشاہی ایک جھٹکا کھا کر پھر جم گئی اور آیندہ کئی برس تک، تختِ دہلی تو بہت اونچا تھا، کسی کو دَور کی زمینوں میں بھی علانیہ مسندِ شاہی بچھانے کی جرات نہ ہوئی۔ البتہ امارت و وزارت کی کشاکش اور حصولِ جاہ و منصب کی کش مکش نے دربارِ دہلی کو دنگل کا نمونہ بنادیا جہاں دِن رات سیاسی پہلوانوں کے داؤ پیچ چلتے اور اُکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ محمدشاہ کو نظم و نسق کی گتھیاں سلجھانے کا کبھی دماغ

* ایک مقالہ جو یومِ درد، دہلی کے لیے لکھا گیا تھا۔

نہ تھا۔ سیدوں کی قید سے رہائی کیا پائی کہ رفتہ رفتہ عقل و شریعت کی سبھی قیود سے آزاد ہوگیا۔ شروع میں نظام الملک آصف جاہ کو قلم دانِ وزارت سپرد ہوا تھا مگر جب وہ دکن سے دہلی آیا، اور دربارِ شاہی کو قدیم آئین پر مہذب رکھنے کی کوشش کی تو بادشاہ کو اس کی ثقاہت سے وحشت ہونے لگی۔ خوشامدی امیروں نے بہکایا کہ وزیر آپ کا اتالیق بن گیا ہے، آپ کو لڑکا سمجھتا ہے۔ مسخروں نے نقلیں بنا بنا کر اُس کے سنجیدہ اوضاع و اطوار کا خاکہ اُڑایا تاکہ اس کی توقیر بادشاہ کے دل میں اور قدم پائے تخت دلی میں نہ جم سکیں۔ انھیں جتنی اپنے فاسد مقاصد میں کام یابی ہوئی، شاید اُسی نسبت سے بادشاہ کی زندگی اور انتظامِ سلطنت میں خرابی آتی گئی۔ ملک کی سیاہ بختی سے، انھی دنوں بادشاہ کی دادی ملکہ مہرپرور کا نیّرِ حیات بے نور ہوا۔ یہ ہوش مند خاتون عالم گیر کی عزیز بہو تھی۔ بادشاہ گردی کا کھیل بگاڑنے میں اُس کی تدبیر و رائے کو بڑا دخل تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی محمد شاہ کو اس کے مشورے کے خلاف چلنے کی مجال نہ ہوئی۔ جب اُس نے وفات پائی تو محل سرا کا سارا انتظام بادشاہ کی رضاعی بہن رحیم النسا بنتِ شاہ محمد درویش کی حویلی میں آگیا۔ اِدھر بادشاہ کی عیّاشی میں ترقی ہوئی۔ وقت کا زیادہ حصہ زنان خانے میں گزرنے لگا۔ احکامِ سلطانی رحیم النسا کی معرفت نافذ ہونے لگے۔ شاہی مُہر اسی کی تحویل میں رہتی۔ خود اُس کے دستخط سے اجرائے کار ہوتا۔ اس کے توسط کے بغیر بڑے بڑے کام ملتوی رہتے۔ غرض یہ درویش زادی دیکھتے دیکھتے دولت کی ماما بن گئی۔ ایک مدت بعد جب روشن الدولہ (بخشی) پر مقدمہ قائم ہوا اور کروروں رُپے کی رشوت کے دفتر کھلے تو رحیم النسا بھی اس کی ہم راز پائی اور محل سرا سے نکالی گئی۔

بادشاہ کا شوقِ تعمیر و تزئین تک عیش پرستی کی لاگ سے خالی نہ تھا۔ "حیات بخش" اور "مہتاب باغ" گویا اسی لیے بنائے تھے کہ افکارِ سلطنت کی بو تک وہاں نہ جانے پائے۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی پیروی میں دس بارہ سال کے اندر دلی کے باہر بیسیوں باغ نئے تیار ہوگئے۔ بادلی سے مہرولی تک مشجر کا حاشیہ کھنچ گیا۔ اور یہ بات قابلِ یقین ہے کہ اس شہر کی آب و ہوا ہی اور ہوگئی۔ کثرتِ اشجار کی بدولت یہاں بارش کا اوسط ماضی و مستقبل تا حال، سے غالبًا کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

اوّل اوّل محمد شاہ کو شکار سے بھی رغبت تھی لیکن پھر خود ہی شاہد و شراب کا شکار ہوگیا۔ رعایا دینِ ملوک پر چلا کرتی ہے۔ بادشاہ اس طرف مائل ہوا تو امیر و وزیر سبھی اُدھر جھک پڑے۔ دارالخلافہ دہلی میں اربابِ طرب

کی وہ ریل پیل اور اسبابِ عیش و تجمل کی وہ فراوانی ہوئی کہ پیرس و پیکن، استنبول و قاہرہ بھی، جو اُس وقت دنیا کی ٹکر کے شہر تھے، مات ہوگئے۔ سارا شاہ جہاں آباد خرابات کا مرقع بن گیا۔

ان سیہ مستوں پر عذاب کا پہلا کوڑا ۱۱۵۱ھ ہجری میں پڑا (مطابق ۳۹-۱۷۳۸ء) شامتِ اعمال نے حملۂ نادری کی صورت اختیار کی۔ آصف جاہ کے دکن جانے کے بعد سے دربار میں دوبارہ ایرانی اور ہندستانی امیر برسرِ اقتدار ہوئے تھے۔ شاہی فوج کا سپہ سالار یا وزیر جنگ امیرالامرا خان دوران خاں جتنا سپہ گری میں فائق تھا، اتنا ہی علم و عقل کے معرکے میں کوتاہ دست ثابت ہوا۔ نادرشاہ کے کابل و قندھار پر قبضہ کرنے کی خبر دہلی آئی تو یہ امیر بہت ہنسا۔ خبر لانے والوں سے کہا تمھارے مکان شاید بہت اونچے پہاڑوں پر بنے ہوئے ہیں کہ اتنی دور سے نادر کے قزلباشوں کو دیکھ لیتے ہو!

نادرشاہ نے پہلے کئی مراسلے اور قاصد بھیجے۔ ان کی بادشاہ تک رسائی کی نوبت نہ آئی، جواب کون دیتا؟ بعض درباری علانیہ کہتے تھے کہ یہ سب زکریاخاں تورانی صوبے دار لاہور کی چالاکی ہے اور وہی نادرشاہ کی طرف سے مصنوعی قاصد بھجوا رہا ہے۔ ایک مرتبہ بڑی دیر تک اس پر مباحثہ ہوا کہ جواب دیں تو اس غاصب لٹیرے کو القاب کیا لکھیں؟ وہ شہنشاہِ ہند کی مساویانہ مخاطبت کے لائق کہاں ہے؟

بادشاہ کے اصرار سے آصف جاہ دوبارہ دہلی آگیا۔ اس وقت کی سیاسی مصالح اور جملہ حالات کو دیکھ کر اس نے یہ صحیح رائے قائم کی اور بار بار عرض کرنے پر محمد شاہ نے بھی مان لی کہ جب تک خود بہ دولت زحمت نہ کریں گے کوئی امیر یا سپہ سالار نادرشاہ سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا۔ چناں چہ کوچ کا حکم صادر ہوا۔ جنگی علم شہر کے باہر نصب کرادیے گئے۔ لیکن یہ مئی جون (۱۷۳۸ء) کی گرمیوں کا زمانہ تھا جب کہ لاہور کا ریگستانی راستہ دن کے وقت آگ ہوجاتا ہے۔ اس مصیبت کے تصور نے اُن امیروں کو سراسیمہ کردیا جو سورج چڑھنے سے پہلے تہ خانوں میں اُتر جاتے تھے۔ انھوں نے پھر بادشاہ کو بہلایا کہ بھلا نادر کی یہ تاب کب ہے کہ اس دولت عظمیٰ کی طرف نگاہِ گرم سے بھی دیکھے؟ محمد شاہ اُن سب سے بڑھ کر آرام کا خوگر، دل آرام کا گرویدہ تھا، دلّی ہی میں رہا۔ بادلی کے میدانوں میں جنگی جھنڈے تمام گرمیوں لو میں کھڑے پھڑپھڑاتے رہے۔ وہاں نادری لشکر اٹک اُتر کر لاہور پہنچ گیا۔ زکریا خاں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اطاعت قبول کرلی۔ نادر کی طبعی

جرات کو دربارِ دہلی کی نا اہلی بلکہ بے ہوشی مہمیز کرتی ہوئی، خاص دار الخلافت کی طرف لے چلی۔

کرنال میں افواجِ دہلی سے اس کا مقابلہ، اور مصالحہ، برہان الملک سعادت خاں کی شہ سے خلافِ معاہدہ دہلی جانا، شاہی کارخانوں پر قبضہ جانا، شہر کی غارت گری اور قتلِ عام، یہ سب واقعات مشہور اور ان کی تفصیل تاریخوں میں مسطور ہے۔ اس مضمون کے ممدوح یعنی خواجہ میر درد اُس وقت ۱۸، ۲۰ برس کے نوجوان ہوں گے۔ شاہ جہانی دہلی کی پہلی تاراجی انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہوگی۔ ممکن ہے خود ان کی خانقاہ اس دست برد کی جھپیٹ میں آگئی ہو۔ اگرچہ قتل و آتش زنی کا زور قلعے کے سامنے کے بازاروں اور شہر کے شمالی محلوں میں زیادہ رہا۔ یہیں سب سے زیادہ قیمتی جواہرات و اقمشہ اور نادر ترین مصنوعات کی منڈیاں تھیں جن کا مثل دُنیا کے شہروں میں کم ہوگا۔ اور یہیں بہت سے امرائے کبار کی حویلیاں رزم و بزم کے سازو سامان سے آراستہ پیراستہ دُلھنیں بنی کھڑی تھیں۔ قزل باشوں نے جو لوٹ مار کی، اس کی بے حساب مالیت کا صحیح اندازہ اور کوئی تفصیل کہیں تحریر نہیں۔ البتہ نادر شاہ کروڑہا رُپے کے ظروف و جواہر اور نادرات کے علاوہ جو رُپیہ نقد لے کر دلی سے گیا اُس کا شمار اُسی کے ایک معتقدی مرزا مہدی، صاحب "نادر نامہ" نے پندرہ کرور بتایا ہے۔ اسی مصنف نے شہر میں نادری حکم کا شکار ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے۔ دوسری عصری تاریخوں میں ڈیڑھ لاکھ تک تخمینہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ اُس وقت نئی پُرانی دہلی کی آبادی دس لاکھ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ دُور دُور تک اس کا پھیلاؤ تھا۔ حتیٰ کہ شدید و پیہم تاراجیوں کے بعد بھی انشاءاللہ خاں کے زمانے تک تغلق آباد و مہرولی شاہجہاں آباد کے محلے سمجھے جاتے تھے۔ فرید آباد کی براہی اور گڑگانوں کی ماتا کا شمار شہر ہی کے میلوں میں ہوتا تھا۔ (ملاحظہ ہو دریائے لطافت باب سوم)

نادر شاہ نے قتلِ عام کی سنت عیدِ قرباں کے تیسرے یا چوتھے دِن ادا کی تھی۔ شہر کربلا کا مسلخ اور ذی الحجہ کا مہینا محرم بن گیا تھا لیکن عبرت کا تماشا دیکھیے کہ خون کی یہ ہولی کھیل کر نادر نے اپنے منجھلے بیٹے کی محمد شاہ کی لڑکی سے شادی رچائی تو گھر گھر طبلے کھڑکنے لگے۔ ناچ رنگ، جلسے، دعوتیں۔ جہاں دیکھو محفلِ رقص و سرود برپا ہے۔ بھانڈ نقلیں کر رہے ہیں اور اُن میں خود اپنے امیروں کی نالائقی اور سپہ سالاروں کی بُزدلی کا خاکہ اُڑا رہے ہیں۔ تماشائی شرمانے کی بجائے ہنستے اور قہقہے مارتے ہیں۔ آصف جاہ کے ساتھیوں میں ایک سردار درگاہ قلی خاں

اسی زمانے میں دلّی آیا تھا۔ اس نے "مرقع دہلی" کے نام سے ایک رسالے میں یہاں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہم لوگ جدید یورپ کے فسق و فجور کو نام رکھا کرتے ہیں۔ دو صدی پہلے ہمارے شہر میں اوباشی اور بدکاری کے جو کھیل کھیلے جاتے تھے اور مقابرِ اولیا کے جوار یا عرسوں میں جیسی کچھ فحاشی کا بازار گرم ہوتا تھا، لامذہب یورپ کی عیاشیاں بھی اُس کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ درگاہ قلی خاں کا "مرقع" چند سال ہوئے ایک اردو مقدمے کے ساتھ حیدرآباد میں چھپا اور "دہلی بارھویں صدی میں" موسوم ہے۔

اسی کا بیان ہے کہ نادرشاہی حملے سے محمد شاہ اتنا متاثر ہوا کہ راگ رنگ سے توبہ کی۔ اربابِ نشاط کو موقوف کر دیا۔ عجب نہیں کہ یہ توبہ اگلی برسات میں ٹوٹ گئی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کو نادر کے حملے اور تاخت تاراج سے جس قدر بھی صدمہ ہوا ہو، وہ کم تھا۔ حکومت کی سب سے چلتی تلوار، اس کا رُعب داب ہوا کرتا ہے۔ اس آفاقی قزاق کا چند ہزار سوار لے کر مُلک میں گھُس آنا، پایۂ تخت پر قبضہ کرنا اور جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا گویا ڈنکے کی چوٹ مغل بادشاہی کے خاتمے کا اعلان تھا۔ بنگالہ و دکن کے وسیع صوبے بجائے خود سلطنت اور کئی کئی صوبوں کا مجموعہ تھے۔ بہادر شاہ اوّل کے بعد ہی تختِ دہلی سے وہاں کے والیوں کی اطاعت رسمی رہ گئی تھی۔ اب یہ رسم بھی خالی دِکھاوا نظر آنے لگی۔ مرہٹوں کی ظاہری اطاعت ان کی کھُلی ہوئی بغاوت پر پردے نہ ڈال سکتی تھی۔ اُس آگ کو غارت گری کی حرص و ہوا نے بھڑکایا تھا اور اب یہ قوم خود اپنی مرکزی رہنمائی کے قابو سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ نادر کے حملے سے پنجاب کے نظم و نسق کی کلیں ڈھیلی ہو گئیں۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کی مذہبی دیوانگی کو تلوار کی فصد سے فرو کیا گیا تھا، اُن کے دُور دست علاقوں میں دوبارہ وحشت و شورش کے آثار پیدا ہونے لگے۔

ان تمام افتادوں کے باوجود محمد شاہ نے مرتے دم تک بادشاہی کو خاصا نباہ دیا۔ چناں چہ مرض الموت میں بھی ولی عہد احمد شاہ کو معقول فوج اور توپ خانے کے ساتھ وزیر الممالک قمرالدین خاں کی معیّت میں احمد شاہ ابدالی سے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ نادر شاہ کے ہلاک ہونے کے بعد یہ افغانی سردار کابل و خراسان کا تاج دار بن گیا تھا اور نہ صرف سندھ و کشمیر بلکہ قدم بڑھا کر پنجاب پر قبضہ جما رہا تھا۔ لشکرِ دہلی نے سرہند پر اس کا مقابلہ کیا اور اسے سلاطینِ تیموری کی آخری بڑی لڑائی سمجھنا چاہیے جس میں ابدالی کو شکست ہوئی اور وہ پنجاب چھوڑ کر ہٹ گیا۔ لیکن تقدیر کے گماشتوں

نے اِس جیت کی ایسی بھاری قیمت وصول کی کہ دولتِ مغلیہ کا دِوالہ نکل گیا ۔ یعنی قمرالدین اسی معرکے میں کام آیا ۔ برہان الملک سعادت خاں کا بھتیجا، صفدر جنگ اس کی بجائے سرِلشکر اور وزیرِ سلطنت نامزد ہوا ۔ اور محض اس کی ذاتی رقابت اور حسد کے طفیل، پنجاب کا بے یار و مددگار نیا صوبے دار معین الملک اور یہ وسیع صوبہ دوبارہ ابدالی کے پنجے میں دب گیا ۔ اس سے بھی بڑھ کر انقلاب یہ کہ فتح سرہند کے دوسرے ہی مہینے (ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں) محمد شاہ کا انتقال ہوا اور بادشاہی احمد شاہ کی وراثت میں آئی ۔ جو اپنے نااہل باپ سے بھی زیادہ نااہل تھا ۔ ہفتوں بلکہ مہینوں محل سرا سے باہر نہ نکلتا ۔ اندر اُس کی ماں اودھم بائی نے آفت اُٹھائی تھی باہر جاوید خواجہ سرا کی آقائی تھی ۔ اِس مخلوط حکومت سے صفدر جنگ اِس قدر تنگ ہوا کہ دعوت کے بہانے گھر بُلاکر اُس نے جاوید کو نابود کردیا مگر بادشاہ کو بھی سخت ناخوش کرلیا۔

سلطنت کو تقدیر کی ایک اور ٹھوکر یہ لگی کہ محمد شاہ کے دو مہینے بعد ہی نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں انتقال کیا ۔ مرحوم کا خلفِ اکبر شہاب الدین خاںؔ دربارِ دہلی میں باپ کا قائم مقام اور بخشیٔ ممالک تھا ۔ وہ منجھلے بھائی ناصر جنگ سے باپ کی مسندِ ولایت چھیننے اورنگ آباد چلا اور اپنے فرزند غازی الدین کو یہاں نائب بنا گیا۔ شہاب الدین قضائے آسمانی سے راستے ہی میں راہیٔ مُلکِ عدم ہوا ۔ بیٹے نے سولہ برس کی عمر میں باپ کی جگہ مستقل عہدہ اور خطاب عماد الملک سے سرفرازی پائی ۔ پھر منصبِ وزارت کے لیے اِس فتنے نے وہ فساد اُٹھائے کہ خود بادشاہی بازیچۂ طفلاں بن گئی ۔ صفدر جنگ کی اصل خدمت اور قوت اودھ کی صوبے داری سے تھی ۔ اس کے مغربی اضلاع میں افغانی رُہیلے جو اورنگ زیب کے زمانے سے جوق در جوق ہندی فوجوں میں بھرتی ہونے آتے تھے یہیں بس گئے۔ انھی کے نام سے یہ علاقہ رُہیل کھنڈ موسوم اور اُن کی اولاد سے معمور ہوا ۔ صفدر جنگ کی عقل کو خود غرضی نے ایسا مغلوب کیا کہ رُہیلوں سے لڑنے کے لیے مرہٹوں کو مدد پر بُلایا ۔ یہ سُبک پا قوم امداد کے بہانے قدم جمانے کے فن میں طاق تھی ۔ ایک دفعہ دوآب میں کیا آئی کہ اُس کی رَو پنجاب تک دوڑ گئی اور وہاں ابدالی حکومت سے جا ٹکرائی ۔

اِدھر صفدر جنگ کے پائے تخت سے ٹلتے ہی شاطر عماد الملک نے اپنی بساط جمائی ۔ رُہیلوں سے سازباز کیا ۔ مرہٹوں کو صفدر جنگ سے توڑ لیا ۔ نواحِ دہلی و اکبرآباد کے جاٹوں سے جبرًا مال گزاری وصول کرنے گیا ۔ پھر انھی کو اپنا معاون و مددگار بناکے تخت گاہِ دہلی پر چڑھا لایا ۔ اس توڑ جوڑ سے اوّل تو صفدر جنگ کو وزارت سے

بے دخل کیا اور آگے چل کر خود بادشاہت کی جڑ اکھیڑ دی۔ احمد شاہ کا شاہی اقتدار خالصے لگا لیکن راج ہٹ باقی تھی۔ نیا وزیرِ سلطنت انتظام الدولہ خاں خاناں بھی غازی الدین کا ماموں تھا اور بھانجے کے آگے سر نہ جھکاتا تھا۔ غازی الدین مرہٹوں کی فوج لایا اور پہلے وزیر کو اپنے اختیار سے برطرف کیا۔ پھر ایک مجلس منعقد کی۔ اس میں احمد شاہ کی نالائقی پر خطبہ دیا اور علما سے فتوا لیا کہ یہ بدکردار بادشاہ معزول کیا جائے۔ چناں چہ پہلے قید خانے میں ڈالا پھر اس کی اور اس کی شوخ دیدہ ماں دونوں کی آنکھیں نکال لیں۔ شہزادہ عزیز الدین، عالم گیر ثانی کے لقب سے اپنے لاثانی پرداد ا کا نقلی جانشین بنایا گیا (شوال ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء) مرزا غالبؔ کے مُوقلم نے مصائبِ روزگار کا جو خیالی نقش آراستہ کیا ہے، وہ اِس عہد کے ہندستان کی حقیقی تصویر چشمِ تصوّر کے سامنے پھرا تا ہے ؎

ہوا مخالف و شبِ تار و موجِ طوفاں خیز
گُسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خُفت است!

اب وہ زمانہ ہے کہ دہلی کے شمال مشرق میں رُہیلے سردار آزاد و خودمختار ہیں اور جنوب کی جانب جاٹ کسان راجگی کے دعوے دار ہیں۔ جس طرح ممالکِ دکن میں مسلمان بادشاہوں نے مرہٹوں سے ہل چھڑوا کر تلوار چلانی سکھائی تھی، جاٹوں کو اُمرائے دہلی کی اندھی رقابت نے سپہ گری و سرکشی کے راستے دِکھائے۔ حکومت کا وارث کوئی نہ رہا تو دربان اور پہرے دار اس کے مالک بن گئے۔ اس وقت غازی الدین کو آسانی سے مُلک و مال مِلنے کی راہ یہ نظر آئی کہ برات کے حیلے سے پنجاب پر فوج لے کر چلا جہاں معین الملک کی وفات کے بعد سے اس کی بیوہ ابدالی کی منظوری سے حکومت کرتی تھی اور اس کی بیٹی غازی الدین سے منسوب تھی۔ بیٹی کو اس نے پُورے ساز و سامان کے ساتھ رُخصت کر دیا تھا لیکن داماد نے ساس کو بھی سوتے میں پکڑوا بُلایا اور پنجاب کی صوبے داری اپنے گُرگے آدینہ بیگ خاں کے تفویض کر دی۔

دغا کی بازی کھیلنے میں غازی الدین بڑا بے باک شاطر تھا لیکن تلوار کے سامنے ایسی چالیں نہیں چل سکتیں۔ احمد شاہ ابدالی کو دہلی میں طوفانِ بے تمیزی بپا ہونے کی خبریں ملیں تو سیلاب کی طرح اٹک سے چلا اور سازشی کمینوں کو خس کی طرح بہاتا ہوا بے روک ٹوک جمنا تک پہنچ گیا۔ عماد الملک نے اپنی ساس کے دامن میں پناہ لی جس کی ردائے حکومت کھسوٹ لایا تھا۔ بڑی خوشامد درامد سے قصور معاف کرایا۔ شاہ و وزیر کی جان اور منصب بچ گئے

مگر لاوارثی دلّی کی دولت کو بھوکے افغانی کسی طرح نہ چھوڑ سکتے تھے۔ کامل اطمینان سے شہر کو لوٹا اور دو مہینے میں بڑے بڑے امیروں کو محتاج فقیر بنا کر واپس گئے۔ یہ بربادی اور خانہ خرابی، غدر ۵۷ء سے ٹھیک ایک صدی پہلے ۱۷۵۷ء (م ۱۱۷۱ھ) کا واقعہ ہے۔ اسی سال تقدیر کی سازش اور تدبیر کی چالاکی سے انگریزوں نے پلاسی کا معرکہ جیتا اور بنگالے میں قدم جما لیے۔

احمد شاہ ابدالی واپس گیا تو نجیب الدولہ خاں کو بادشاہ کا محافظ اور امیر الامرا یعنی وزیر جنگ بنا گیا۔ لیکن غازی الدین حکم رانی کا دیوانہ تھا۔ اسے بادشاہ کا دخل گوارا نہ تھا۔ کسی امیر وزیر کی شرکت کی تاب لاتا اور مل جل کر حکومت کرتا، یہ اُس کی فطرت کے خلاف تھا۔ ایک مری ہوئی سلطنت اور ایک لُٹی ہوئی دولت کے لیے بھی سازش و آویزش کیے گیا۔ اور اُجڑی دلّی کو اور اُجاڑتا رہا۔ ہزاروں باشندے شہر چھوڑ کر، اودھ، بنگال، راجپوتانہ، دکن، غرض جہاں سینگ سمایا وہاں چلے گئے۔ وہ بستیاں اور شہر کے محلّے جن کی حفاظت کا معقول انتظام نہ تھا، جاٹوں اور میواتی ڈکیتوں نے لوٹ لیے۔ پایۂ تخت میں محاصل کی آمد مدّت سے مسدود تھی۔ بزرگوں کے اندوختے اور موروثی دولت کے خزانے بیرونی اور مُلکی غارت گروں نے چھینے۔ اہلِ شہر کی بسر بُرد مشکل ہوگئی۔ حریف امیروں کے مسلح جتھے کوچہ و بازار میں خون خرابہ کرتے اور لوٹ مار مچاتے رہتے تھے۔ اور امن و عافیت رخصت ہو جائے تو اسبابِ معیشت و رفاہ خود بخود گُم ہو جاتے ہیں۔ غرض شہر کا حالِ خراب ایسا تھا جب کہ عماد الملک نے فساد کی ایک اور آگ بھڑکائی جس پر عالم گیر ثانی کے خونِ ناحق نے گویا تیل کا کام کیا اور آخر یہ آتش سوزندہ لاکھوں مرہٹوں کے لہو سے پانی پت کے میدان میں فرو ہوئی۔

مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ عمارت کو توڑنے اور گرانے میں غازی الدین خاں نے جو حصہ لیا اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں ملے گی لیکن اتنا کچھ بگاڑنے اور اُجاڑنے کے باوجود ایک مدرسے کی بنیاد کچھ ایسی نیک ساعت اور نیک نیت کے ساتھ رکھی تھی کہ اس کا فیض ابھی تک جاری ہے اور اسی کے احاطے میں آپ بیٹھے دہلی کی یہ داستان سُن رہے ہیں۔ یہیں مسجد سے متصل اس کا آخری مسکن ہے۔ اگرچہ اس کی اپنے معاصر شاہ و شہریار سے کبھی نہ بنی، لیکن اقلیم سخن کے تاج دار میر تقی میرؔ کے ساتھ بڑے لطف و نوازش سے پیش آتا تھا۔ چناں چہ میر صاحب اس کے بڑے معترف بلکہ معتقد ہیں حال آں کہ اس کی خوں ریزی اور بادشاہ کُشی سے بخوبی باخبر تھے۔ یہ

تفصیل بھی انھی کی کتاب ("ذکرِ میر") میں ملتی ہو کہ جب عالم گیر ثانی کو ایک درویش باخدا سے ملنے کے بہانے فیروز شاہ کے کوٹلے میں لاکر، سرکاٹ لیا اور لاش باہر پھینک دی تو وہ دِن بھر بے گور وکفن زمین پر پڑی رہی۔ رات کے اندھیرے میں چند شہزادوں نے جان پر کھیل کر اسے اُٹھایا اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا۔ (ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء)

عالم گیر ثانی کا وارث شاہ زادہ عالی گہر وزیر کے پنجۂ ستم سے بچ کر بہار و بنگال کی طرف بھاگا تھا۔ باپ کے قتل ہونے کے بعد شاہ عالم ثانی کے نام سے بادشاہ بنا۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو پانی پت میں کامل شکست دینے کے بعد، اسی بے سروسامان اور بے خانماں کا حقِ بادشاہی تسلیم کیا اگرچہ اسے میر صاحب کے لفظوں میں "تہمتِ بادشاہی" کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ نو دس برس تک ممالکِ مشرق میں گشت لگانے اور بے کار پڑے پھرنے کے بعد اپنی اُجڑی راج دھانی میں آیا بھی تو بادشاہِ بے مُلک ہی رہا۔ حتیٰ کہ ذوالفقار الدولہ نجف خاں وزیر قلعے میں آتا تو درباری نشست کی صورت قائم ہوجاتی تھی ورنہ بادشاہ سلامت چند مصاحبوں کو لیے بیٹھے رہتے اور فقط شعر شاعری سے دِل بہلاتے تھے۔ کئی صدی پہلے خاندانِ سادات کا ایک بادشاہ شاہ عالم گزرا ہو اس کی حکومت بھی گھٹتے گھٹتے چند میل کے دائرے میں رہ گئی تھی اور غالباً یہ مثل اُسی کے لیے بنی تھی کہ بادشاہی شاہ عالم، از دہلی تا پالم۔ وہ اب دوسرے شاہ عالم پر چسپاں ہوگئی۔

یہ خواجہ میر درد کی پیرانہ سالی کا زمانہ ہو جب کہ ہندستان کی حکومت مغلوں کی مٹھی سے نکلی اور چھوٹی بڑی کئی ریاستوں میں بکھر گئی۔ رُہیلے جاٹ، راج پوت، سکھ۔ سب اپنے اپنے گھروں میں شیر ہوگئے۔ جنوب مغربی ہندستان میں مرہٹوں کی پانچ گدیاں جم گئیں۔ ان میں گوالیار کے سندھیا راجا کا اثر دہلی، آگرہ تک پھیلا اور اسی کے سہارے پر شاہ عالم الہ آباد چھوڑکر دلّی آیا۔ حیدر آباد و اودھ مستقل مُلک بنے۔ میسور میں حیدر علی نائک نے اپنی سبھا الگ سجائی۔ لیکن تقدیر نے مغلوں کی وراثت کے لیے فرنگی تاجروں کو چُنا تھا اور وہ ارکاٹ و بنگال میں اپنی بساطِ حکومت بچھاکر اب آگے تک پانو پھیلا رہے تھے۔

میر تقی میر ایامِ فتنہ و فساد میں راجا ناگرمل دیوان کے ساتھ، شہر چھوڑکر جے پور کی سرحد پر بہ مقام کاماں چلے گئے تھے۔ وہیں دہلی کے ہزاروں باشندے مدّتوں ڈیروں میں یا عارضی جھونپڑیاں بنائے پڑے رہے یہاں تک کہ شہر میں نجف خاں نے امن امان قائم کیا اور ان خانہ بدوشوں کو پھر دہلی آنا نصیب ہوا۔ مگر ابدالیوں اور مرہٹوں کی

پڑی ورپڑی غارت گری نے شہر کو کھنڈر کر دیا تھا۔ میر صاحب نے اس تباہ حالی پر جگہ جگہ آنسو بہائے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن شہر کے کسی تازہ ویرانے پر جا نکلا تو قدم قدم پر رویا کہ وہ عالی شان عمارتیں، کہاں مٹ گئیں۔ وہ یاروں کے جم گھٹے اور ہا و ہو کے جلسے اور وہ پیارے دوست آشنا کدھر ناپید ہوگئے ؎

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جانیست
از ہر کہ نشاں جستم گفتند کہ پیدا نیست

خانہ ہا نشستہ۔ دیوار ہا شکستہ۔ خانقاہ بے صوفی۔ خرابات بے مست، خرابہ بود ازیں دست تا بہ آں دست ؎ ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ
بُود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ!"

غرض بڑی اذیت اٹھائی اور قسم کھائی کہ آیندہ شہر کی سیر کو کبھی نہ نکلوں گا۔ (ذکرِ میر ص ۹۹، ۱۰۰)

میر صاحب نے تو اور صدہا افراد کی طرح آخر اس خانہ برباد شہر کو خیر باد کہی اور ان صاحبوں کے خاندان تک انھی پردیسوں کی خاک میں مل گئے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خواجہ میر درد جنھوں نے ہزار آفتوں کے باوجود یہ در نہ چھوڑا تھا، ان کی اولاد آج بھی اپنی بارہ دری کے گرد بستی ہے۔ شہر کے باہر کی باغیچی مفقود ہوگئی، لیکن میر درد روڈ سے نئی دہلی میں ابھی اُن کی یاد موجود ہے۔ طرفہ تر یہ کہ اُس عہد کے اکثر شاعر و مصنف اُس عہد کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں لیکن خواجہ صاحب اپنے نام ور ہم مشرب مرزا مظہر جانِ جاں کی طرح کہ وہ بھی خواجہ صاحب کے انتقال سے چار سال پہلے شاہ عالم ہی کے عہد میں شہید ہوئے، شکایتِ روزگار کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے۔ اُن کی زندگی میں کیا کیا قیامت کے تہلکے اور گرد و پیش کیسے کیسے ہول ناک ہنگامے اور اشتلم بپا ہوئے مگر اُن کے صبر و سکون کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ وہ اس مادی دُنیا کے رہنے والے ضرور تھے لیکن معلوم ہوتا ہے ان کے محسوسات کا عالم دوسرا تھا۔ دیوانِ درد اور دوسری تصانیف جن میں علم الکتاب ہزار صفحات سے زیادہ ضخیم ہے، سامنے رکھیے تو گمان ہوتا ہے کہ جن تاریخی واقعات کو ہم سُننے سُنانے میں مشغول ہیں، خواجہ صاحب کو ان سے کوئی سروکار بلکہ شاید اُن کی خبر بھی نہیں تھی! ان کی حیات و موت ٹھیک اِس شعر کی مصداق ہے:۔ ؎

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ، غنودیم!

اُردو میں خطوط نویسی کا ماضی و حال

(بہ قلم جناب ثاقب رزمی صاحب)

---(٭)---

اُردو زبان موجودہ ماحول سے بڑی سُرعت کے ساتھ متاثر ہو رہی ہے۔ وہ ادب کے ہر راستے میں بہت کچھ ترقی کر چکی ہے اور اب ٹکنیکل میدانوں میں اپنا قدم نہایت کام یابی اور جرات سے آگے بڑھا رہی ہے۔ لیکن ابھی اُردو میں ایسی ہزاروں خلائیں ہیں جن کا بھرنا باقی ہے۔ اُن خلاؤں میں سے ایک خطوط نویسی سے بے توجہی ہے ابھی تک اُردو خطوط نویسی کی اصلاح و ترقی کی طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔

خطوط نویسی پر ادبی حیثیت اور نفسِ فن دو پہلوؤں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ اُردو میں یہ دونوں رُخ تاریک پڑے ہیں۔ خطوط نویسی کو ادبی حیثیت سے لیا جائے تو اُردو میں مکتوباتی مواد بہت کچھ مل جاتا ہے جو بکھری ہوئی حالت میں پڑا ہوا ہے، لیکن نفسِ فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُردو کا دامن اِس سے قطعی طور پر خالی ہے۔

ہندستان کے اپنے نئے دور میں قدم رکھنے سے لے کر اب تک خطوط نویسی کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ اب دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں اِس طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔

کیا خطوط نویسی ایک ناگزیر ضرورت ہے؟ باہمی اظہارِ خیال اور پیغام رسانی سوسائٹی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ انسانی معاشرت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی گروہوں نے اپنے اپنے عہد کے ارتقاے ذہانت کے ماتحت باہمی اظہارِ خیال کو زیادہ آسان اور واضح بنانے کے لیے کیا کیا کوششیں کیں۔

اگر باہمی اظہارِ خیال کو ایک مستقل صورت دینے کی کوششوں پر گہری نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اِس سلسلے میں انسانی ذہن کی ترقی کس طرح زینہ بہ زینہ ہوئی ہے۔ پہلے پہل اظہارِ خیال کے لیے آوازوں اور اشاروں سے کام لیا گیا۔ اِس کے بعد اِسی مطلب کو پورا کرنے کے لیے مختلف اشکال نے جگہ لی۔ پھر حروف کی نوبت آئی اور اس طرح عہد بہ عہد مختلف زبانوں نے جنم لیا۔

انسانی معاشرت کی وسعت اور ترقّی کے ساتھ ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ باہمی اظہارِ خیال اور پیغام رسانی کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے تہذیب کے ہر نئے دور میں مختلف کوششیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ سائنس نے مواصلات کی دُنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا اور زمان و مکان کی پابندیوں کو مادی طور پر انسان سے ہمیشہ کے لیے اُٹھادیا۔ آج سائنس نے رسل و رسائل اور نقل و حمل کے وہ حیرت انگیز ذرائع ایجاد کیے ہیں کہ اتنی وسیع دنیا ایک چھوٹا سا گھر معلوم دیتی ہو۔ واٹرلو کے مقام پر نپولین کی شکست کی خبر چھ ماہ تک امریکہ میں نہ پہنچ سکی، لیکن آج عہدِ سائنس میں ایک خبر چند سیکنڈ میں مہذب دُنیا کے ایک ایک کونے تک پہنچ جاتی ہو۔

خطوط نویسی تمدّن کا وہی اوّلین فطری تقاضا ہو جو آج زیادہ ترقی یافتہ اور اہم صورت میں ہمارے سامنے موجود ہو۔

زمانۂ حال میں خطوط کی اہمیّت اپنے انتہائی نقطے پر پہنچ چکی ہو جب کہ انسانی زندگی کے سامنے نئے نئے راستے کُھلے ہوئے ہیں۔ معاشرت، تجارت، سیاست اور حکومت حتّٰی کہ زندگی کے ہر شعبے میں چھوٹے اور بڑے تمام امور کی انجام دہی کے لیے خطوط کی آمد و رفت ایک جزوِ لاینفک ہو۔

تجارت اور کاروبار کے بدلتے ہوئے جدید راستوں اور موجودہ کش مکش کے عہد میں خطّ ایک عالم گیر آلہ ہو۔ یہ ایک بہت بڑی تجارتی طاقت ہو۔ ایک مدلّل، بامعنی اور سادہ تجارتی خط ایک کارخانے کے پیش کردہ مال اور خدمات کی تشہیر کرتا ہو اور اس کی شُہرت اور ساکھ بناتا ہو، مال بیچتا ہو اور اعتماد بڑھاتا ہو۔

آج کل ایک کارخانے کے خالص نفع کا انحصار اُس کی عمارت یا مال پر نہیں بلکہ اس کی کاروباری گفتگو اور خطوط کی استعداد پر ہو۔ زمانۂ حال میں ایک ترقّی پسند تجارتی ادارے کے لیے ضروری ہو کہ وہ اپنے آپ کو ممتاز بنانے کے لیے صاف و شستہ زبان کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ استعداد حاصل کرے اور اپنے تجارتی خطوط اور گفتگو کو جدید اسالیب میں ڈھالے۔

خطوط نویسی زبان کا ایک اہم حصّہ ہو۔ جس طرح ایک مضمون لکھتے ہوئے سادہ زبان، فقروں اور جُملوں کی صحیح ترکیب اور اچھے اسلوب کی ضرورت ہو، اسی طرح ایک خط مسوّدہ کرتے ہوئے اِن لوازمات کے

بغیر چارہ نہیں۔ کیا ایک اہم خط مسودہ کرنے میں اہتمام نہیں کرنا پڑتا؟ کیا زبان، گرامر اور خطوط نویسی کے اصول سے واقفیت کے بغیر ایک فصیح اور موثر خط لکھا جاسکتا ہو؟

سچ پوچھیے تو دوسری تحریروں کی نسبت خط مسودہ کرتے ہوے زیادہ احتیاط، زیادہ موثر اسلوب اور زیادہ شستہ زبان کی ضرورت ہو کیوں کہ ہمارا تخاطب ایک خاص فرد کی طرف ہوتا ہو جس کے جذبات اور رجحانات کا خیال رکھنا پڑتا ہو۔ ایک خط کی مسودہ نگاری کے لیے راقم کو گرامر، زبان اور فنِ تحریر سے پوری واقفیت کے ساتھ نفسیات میں بھی دست رس ہونی چاہیے۔

خطوط نویسی کی ادبی حیثیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ ادبِ جدید میں کتنا اہم مقام رکھتی ہو۔ خطوط گفتگوؤں کا مرقع ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم اُن سے اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کسی قوم نے ثقافت کے راستے کے ساتھ ساتھ کتنی ترقی کی ہو۔ ایک خط سے راقم کی پبلک زندگی سے لے کر خانگی حالات، ذاتی رجحانات اور اس کے ذہنی ارتقا کا جائزہ لیا جاسکتا ہو۔

ہندستان میں حکومتِ مغلیہ کے دور میں خطوط نویسی کو بہت کچھ ترقی دی گئی اور مکتوباتی ادب خوب پھلتا پھولتا رہا لیکن یہ ترقی کسی اور راستے پر ہوئی۔ خطوط نویسی کی ایک غلط ادبی حیثیت پر زور دیا گیا۔ خطوں میں مقفا اور مسجع فقرے ترتیب دیے گئے اور مطالب کو ثقیل الفاظ اور غیر ضروری لسانی پیچیدگیوں میں مدغم کیا گیا۔ خط و کتابت کی تمام قسموں، ذاتی، تجارتی اور سرکاری میں ایک ہی نوعیت کا پُر تکلف، مرصع اور مبہم اسلوب اختیار کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس عہد کا مکتوباتی ادب ایک جامد، غیر فصیح اور بے جان انبار بن کر رہ گیا، اگرچہ اُس میں تاریخی واقعات موجود تھے۔

بعد میں اُردو خطوط نویسی بھی اُسی ماحول سے متاثر ہوئی۔ اُس میں بھی وہی طوفان اُمنڈ آیا۔ وہی پانچ سطر کے القاب اور دس سطر کے آداب کے بعد مدعا کے تین الفاظ لکھنے کا طریقِ عمل شروع ہوگیا۔ اگرچہ اُردو میں خطوط کے مطالب کو زیادہ دقیق نہ بنایا جاسکا، مگر تحریر میں وہی رنگینی، لفظی شان و شوکت، پیچیدہ فقرے اور دور از کار باتیں اُبھر آئیں۔

آخر ایک مدت کے بعد مرزا غالب کی جدت پسند نظر نے عالمِ خطوط نویسی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اُس نے

خطوط نویسی کے رینگتے ہوئے بے جان راستوں کو یک سر بدل دیا اور اس کے اسلوب میں ایک نیا جوبن، ایک نئی شگفتگی بھر دی۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہو کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہو۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

ایک اور خط میں خطوط نویسی کی قدیم روش کی مذمت کرتے ہوئے :-

"جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا طریقۂ تحریر یہ ہو کہ جب قلم و کاغذ ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس لفظ کے ساتھ جو اس کی حالت کے موافق ہو صفحے کے شروع میں پکارتا ہوں اور اس کے بعد مطلب لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب، خیریت گوئی اور خیر و عافیت طلبی زائد و بے کار ہو اور تجربہ کار زوائد کو کچھ وقعت نہیں دیتے۔"

مرزا غالب کا نام اُردو کے مکتوباتی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ عالمِ خطوط نویسی میں مرزا غالب کا یہ تجدد اِس قابل تھا کہ اُسے بنیادی پتھر قرار دیتے ہوئے خطوط نویسی کو ادبی اور فنی دونوں اعتبار سے ترقی دی جاتی، لیکن افسوس ہو کہ ایسا نہیں ہوا۔

حکومتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب سرزمینِ ہند میں انگریزی جھنڈا لہرایا اور انگریزی تہذیب نے اپنے قدم جمائے تو تمام ملک پر ایک خود فراموشی چھا گئی۔ ہر عہد کی بلند خیالی اُس عہد کے حکم ران طبقے کے خیالات ہوتے ہیں۔ اس عالم گیر حقیقت کے ماتحت ہر فرد اپنی دُنیا کو بھول کر ان نکلتی ہوئی شعاعوں میں محو ہو گیا۔ جب انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا تو ملک کے ہر گوشے میں اس کے حصول کے لیے ایک گونج۔ ایک گرم جوشی پھیل گئی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں لسانی ضروریات کی انجام دہی کے لیے انگریزی زبان ایک جزوِ لازم بن گئی اور اپنی زبان کی ترقی اور نشوونما دب کر رہ گئی۔ چوں کہ تمام ملک میں رسل و رسائل کا ذریعہ صرف انگریزی زبان تھی، اس لیے لسانی ضروریات کے لیے ایک قائم مقام مِل جانے پر کسی اور طرف توجّہ نہ کی گئی۔

مغربی تعلیم و تقلید کے باوجود اس فن کی طرف اہلِ ہند کو کچھ توجّہ نہیں ہوئی۔

انگریزی زبان میں خطوط نویسی کے فن پر لکھی ہوئی سینکڑوں کتابیں انگریز قوم کے کاروباری تمدن کا پتا دیتی ہیں۔ اُردو میں خطوط نویسی کے فن پر کسی جدید معیاری کتاب کا وجود نہیں۔ یہاں تک کہ بیرونی پتا لکھنے کی بھی کوئی ترتیب مقرر نہیں ہو۔ بہ خدمتِ اقدس یا بہ خدمت شریف اور بہ مقام خاص کے بعد ضلع، تحصیل، شہر اور مکتوب الیہ

کے نام خلط ملط کر کے لکھ دیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند ٹوٹی پھوٹی کتابیں بازار سے مل سکتی ہیں جو نہایت ناکافی مواد لیے ہوے ہیں اور جو موجودہ وسیع ضروریات کی انجام دہی میں قطعی طور پر کم مایہ ہیں۔ اُردو زبان میں خطوط نویسی پر ایک با اصول مبسوط اور مکمل کتاب کی ضرورت ہے جس کا مطالعہ قاری کو خطوط نویسی کے متعلق اپنے علم کی اصلاح و ترقی میں مدد دے اور آیندہ مراسلاتی ضروریات کو پورا کرے۔

چند سال پہلے اُردو ایک چھوٹی سی خاموش، بے حس و حرکت دنیا کی زبان تھی، لیکن اب وہ ہنگاموں اور نئے افکار سے بھری ہوئی دُنیا کی زبان بن چکی ہے۔ اُس نے زندگی کے بدلتے ہوے نئے نئے دھاروں پر اپنا قدم رکھا ہے۔ ہمیں اپنی مسلسل کوششوں سے اُس میں استقامت اور مضبوطی بھرنا ہے تاکہ وہ ان تیز رو دھاروں پر چٹانوں کی طرح جم کر رہ سکے۔

اُردو کو تمام میدانوں میں ایک ترقی یافتہ اور پُر استعداد زبان بنانے اور اُس کی بنیادیں تکمیل، انقلابیت اور تجدید پر استوار کرنے کے لیے ہم اپنے سامنے مسلسل کام اور سخت محنتوں کا ہجوم دیکھتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس دَور کے کٹھن سفر کا احساس کرتے ہوے وقت ضائع کیے بغیر اپنے آپ کو کام پر لگائیں اور مشکلات کے طوفانوں میں اپنا راستہ بنائیں۔

ہمیں اُردو کی تمام کمیوں کو جتنی جلدی ہو سکے، پورا کرنا ہے تاکہ وقت آنے پر ہم اُسے ایک جدید اور مکمل زبان کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔

اُردو زبان ہم سے بہت کچھ چاہتی ہے۔ ہمیں اُس کے مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر دینا چاہیے، یہاں تک کہ تمام ہندستان عظمتِ اُردو کی غلغلہ اندازیوں سے گونج اُٹھے۔ ہماری قومی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی زندگی کا انحصار، اُردو کی زندگی پر ہے۔ اگر اُردو زندہ نہ رہی تو ہماری زندگی مجموعی طور پر ہمیشہ کے لیے منجمد ہو کر رہ جائے گی۔ ہمیں سورج اور چاند کی شعاعوں کے نیچے اپنی مسلسل محنتوں سے اُردو کو ایک زندۂ جاوید زبان بنانے کا عزم کرنا چاہیے۔

تعلیمی نفسیات مولوی مفتاح الدّین ظفر صاحب نے اس کتاب میں تعلیمی نفسیات کے اہم علمی مسائل سے سلیس عام فہم زبان میں بحث کی ہے۔ تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ قیمت مجلّد ۱۲/ بلا جلد ۱۱/ ۔ **منیجر انجمنِ ترقیِّ اُردو (ہند) دہلی۔**

مشاعرے کا ارتقا اور اس کی اہمیّت

(بہ قلم جناب محمد داؤد صاحب رہؔبر)

(※)

تمہید فارسی اور اُردوٗ میں مشاعرہ جس قدر اہمیّت رکھتا ہے اسی قدر مورّخینِ ادب نے اس کی تحقیق میں بے اعتنائی برتی ہے۔ اس علمی بے نیازی کا الزام فارسی سے زیادہ اُردوٗ کے محققین کے سر ہے نہ صرف اس لیے کہ ان کی زبان انھی مشاعروں کی بدولت دو سو برس کے قلیل عرصے میں کُل دنیا کی زبانوں کی ہم پلہ ہوگئی، ہے بلکہ اس لیے کہ یہ مروّجہ (.Institution) صرف اُردوٗ زبان ہی میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور رکھے گا۔ جس طرح شاعری کی کم و بیش تمام خصوصیات اُردوٗ نے فارسی سے ورثے میں پائی ہیں اسی طرح مشاعرے بھی ایران ہی سے ہمارے مُلک میں آئے ہیں لیکن آج ایران میں مجلسِ مشاعرہ کے نام سے یا اس سے ملتی جُلتی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ انجمنِ ادب طہران میں جہاں علمی اور ادبی مقالے پڑھے جاتے ہیں بعض شعرا اپنا کلام بھی سُناتے ہیں لیکن اس شعرخوانی کو ہمارے مشاعروں سے نسبت دینا بالکل غلط ہے اور یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مشاعرہ ایک خالص ہندستانی چیز ہے اور اُردوٗ کی ملکیّت ہے۔ ہندی والوں نے اس کے مقابلے پر دیکھا دیکھی کوی سمیلن اور سکھوں نے پنجابی میں کوی دربار کی بنا ڈالی ہے لیکن انھیں اُردو مشاعروں کی مقبولیت سے کوئی نسبت نہیں۔ البتہ مشاعرے پر میں نے صرف دو مضمون دیکھے ایک رسالہ زمانہ میں چھپا ہے لیکن یہ مشاعرے کی تاریخ پر روشنی نہیں ڈالتا دوسرا مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کا ہے۔ یہ مضمون اپریل ۱۹۱۳ء کے 'معارف' میں چھپا تھا۔ لیکن یہ موضوع اس سے بہت زیادہ توجہ کا مستحق اور محتاج ہے۔ میں نے مولانا کے اس مقالے سے کافی استفادہ کیا ہے۔

مشاعرے کے معنی مشاعرے کے لفظی معنی باہم شعر کہنے یا پڑھنے کے ہیں اس لحاظ سے اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، عربی کے عروضیوں نے ان صورتوں کے اصطلاحی نام تجویز کیے ہیں مثلاً مشاعرہ

مفاخرہ، منافرہ، مطارحہ، مسامرہ، مسالمہ، مبادہہ، مناظمہ، مماثلہ، مہاتنہ وغیرہ وغیرہ۔ میرے نزدیک اس کی چار صورتیں سب سے اہم ہیں:-

۱۔ یک جا ہوکر یعنی محفل میں شعرا ایک دوسرے کو اپنا کلام سُنائیں۔ یہ کلام سخن کے کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو۔[۱]

۲۔ ایک ہی طرح یعنی زمین میں شعر کہنا۔ یہ ضروری نہیں کہ شعرا مقابلے کے لیے اہتمام سے طرح دے کر غزلیں یا قصیدے لکھیں۔ اگر متاخرین اپنے متقدمین کی غزلوں اور قصیدوں کی زمین میں نئی چیزیں پیش کریں تو اسے بھی مشاعرہ کہا جائے گا۔ مولانا عبدالسلام صاحب اسے مطارحہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری شکل رواجی ہے جس میں شعرا کا یک جا ہونا اور پھر ایک ہی زمین میں اشعار کہنا یہ دونوں چیزیں موجود ہیں اور مشاعرے کی مکمل کیفیت اسی میں پائی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھی صورت میں 'شعرا کا اجتماع' اور 'ایک ہی موضوع کی نظمیں'۔

میں نے مشاعرے کی ان مختلف ممکن صورتوں کو ایسی ترتیب میں رکھا ہے جو ارتقائے مشاعرہ کے چار مدارج دکھاتی ہیں۔ اپنے اس نظریے کے ثبوت کے لیے ہم تاریخی شہادت کی طرف جُھکتے ہیں۔

مشاعرے کی قدامت

۱۔ شعرا کا یک جا ہوکر پڑھنا۔ اگر ہم محض قیاس دوڑائیں مشاعرے کی یہ شکل شاعری کی پیدائش کے ساتھ ہی ظہور میں آنی چاہیے۔ صاحبِ کمال اپنے ہم پیشہ سے اس کی داد چاہتا ہے اور اس سے مشورہ کرتا ہے چناں چہ شاعر شاعر کو ضرور اپنا کلام سُناتا ہوگا۔

شعرا کے یک جا ہونے کی سب سے قدیم روایت ہمیں جاحظ کے ہاں ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ نوروز اور مہرگان یعنی مہرگان کے جشن پر شعرا نوشیرواں کی مدح میں اس کے دربار میں قصیدے پڑھتے تھے جو خاص اس موقع کے لیے لکھے جاتے تھے۔[۲]

قسمِ اول کے ان مشاعروں کی زیادہ باضابطہ شکل ہمیں زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ یہ مشاعرے عکاظ اور ایسے ہی میلوں میں ہوتے تھے۔ مختلف قبائل کے شعرا یک جا ہوکر فخریہ اشعار سُناتے تھے۔

---

[۱] دیکھو بدائع البدائہ

[۲] ایران بہ عہدِ ساسانیان صفحہ ۵۴۵ بحوالۂ جاحظ

السید محمود شکری الآلوسی البغدادی 'بلوغ الادب' میں لکھتے ہیں :-

كَانَ لِلْعَرَبِ اَسْوَاقٌ يُقِيْمُوْنَهَا فِيْ شُهُوْرِ السَّنَةِ وَيَنْتَقِلُوْنَ مِنْ بَعْضِهَا إِلٰى بَعْضٍ ، يَحْضُرُهَا سَائِرُ الْعَرَبِ بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْمَآثِرِ وَالْمَفَاخِرِ ....[51]

مِنْهَا سوق عكاظ وهو موسمٌ معروفٌ للعربِ بل كان مِن اعظمِ مواسِمِهم واسواقهم وَهُوَ نخلٌ فِي وادٍ بين نخلة والطائف وهو الى الطائفِ اقربُ بَيْنهما عشرةُ اميال وهُوَ وراء قرنِ المنازِلِ بمرحلةٍ مِن طريقِ صنعاءِ اليمن ... وكانوا يتبايعون فيها و يتعاكظون و يتفاخرون و يتحاجّون وتنشد الشعراء الشعر وقد كثر ذلك فى اشعارِهم كقول حسّان ؎

سَأُنْشِرُ إِنْ حَيِيْتُ لَهُمْ كَلَامًا   سَيَنْشُرُ فِى المجامِعِ من عكاظ ....

وفيها علقت القصائد السبعة افتخاراً بفصاحتها على من يحضر الموسم من شعراء القبائل إلى غير ذلك وكان كل شريفٍ انما يحضر سوق بلده إلّا سوقَ عكاظ فانهم كانوا يتوافون ... من كل جهة ....[52]

اس قسم کے مفاخرے منڈیوں کے علاوہ اور جگہوں پر بھی ہوتے تھے۔ جہاں کہیں دو شخصوں میں نسبی فضیلت وغیرہ پر جھگڑا ہوجاتا۔ جھٹ قبیلے کے شاعر جمع ہوجاتے اور مفاخرت اور منافرت میں قصیدے پڑھتے۔ یہ قصیدے عموماً فی البدیہہ تصنیف کیے جاتے تھے، ان کے محاکمے کے لیے حکّام مقرر کردیے جاتے جو قبیلوں کے سربرآوردہ بزرگ ہوتے تھے ورنہ اکثر یہ مشاعرے طویل اور خوفناک جنگوں پر منتج ہوتے تھے۔

میں آپ کی دلچسپی کے لیے ایک مختصر سا مفاخرہ پیش کرتا ہوں۔ مفاخرے کی یہ کوئی اچھی مثال نہیں لیکن خوفِ طوالت نے اسی پر قناعت کرنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ مفاخرہ نعمان بن منذر شاہِ حیرہ کے دربار میں ہوا۔

" ابی عبیدہ سے روایت ہے کہ نعمان بن منذر کے ہاں بنی ربیعہ، بنو مضر اور بنو تمیم کے وفد آئے۔ ربیعہ کے وفد میں بسطام بن قیس اور حوفزان بن شریک البکریان تھے۔ مضر کے وفد میں قیس بن عیلان، عامر بن مالک اور

[51] - بلوغ الادب فی احوال العرب صـ۲۶۴
[52] بلوغ الادب - حصہ اول صـ۲۸۵

عامر بن الطفیل اور تمیم کے وفد میں قیس بن عاصم اور اقرع بن حابس تھے ۔ نعمان نے ان کی بہت تعظیم کی اور بہت تواضع سے پیش آیا۔ جب وہ لوگ رخصت ہونے لگے تو نعمان نے ان کے لیے اکل و شرب کی محفل آراستہ کی ۔ شراب حاضر کی گئی تو پہلے نعمان نے پی اب ظاہر ہے کہ سب سے پہلے وہ جسے پیش کرے وہ سب میں افضل ہے، جب نعمان پی چکا تو خادمہ نے نعمان کی جانب دیکھا کہ وہ کسے پیش کرنے کا حکم دیتا ہے اور اُسے افضلیت دیتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سر جھکایا پھر یہ اشعار پڑھے ؎

سقى وفودك مما كنت سأقتني   و ابدى بكاس ابن ذى الجدين بسطام
اغر بينميه من شيبان ذوانف   حامى الذمار وعن اعراضها رام
قد كان قيس بن مسعود و والده   تبذ الملوك به ايام ايام
فارضوا بما فعل النعمان فى مضر   و فى ربيعة من تعظيم اقوام
هم الجماجم والاذناب غيرهم   فارضوا بذلك او بوؤا بارغام

پھر عامر بن الطفیل نے کہا ؎

كان التتابع فى دهر لهم سلف   و ابن المرار و املاك على الشام
حتى انتهى الملك من لخم الى الملك   بارى السنان لمن برمه رام
انحى علينا باظفار فطوقنا   طوق الحمام بانعاس وارغام
ان يمكن الله فى يوم يشاء به   نتركك وحدك ندعو رهط بسطام
فانظر الى الصيد لم يحموك من مضر   هل فى ربيعة ان لم ندعنا حام

بسطام بن قیس نے اس کے جواب میں کہا ؎

لعمرى لئن صحت تميم و عامر   [illegible] وفهم تنجا
اروني كمسعود و قيس و خالد   [illegible] عبد الله ذى الباع والندا
فكانوا على افناء بكر بن وائل   [illegible] اذا ما سال [illegible] لهم جدا
وسرت على آثارهم غير نارك   وبينهم حتى انتهيت الى المدا [1]

[1] - بلوغ الادب حصہ اول ص ۲۹۹

ان مفاخروں میں بعض شعرا کے قصائد ہم طرح بھی ملتے ہیں، لیکن یہ اتفاقی بات ہو ورنہ اس کا کوئی لزوم نہیں تھا۔ کئی مفاخروں میں ایسے اتفاق نہیں نظر آتے ہیں۔

ہم طرح قصائد اب ہم مشاعروں کے ارتقا کی دوسری منزل میں قدم رکھتے ہیں یہاں آپ کو مختلف شعرا کے ہاں ہم طرح قصائد نظر آئیں گے۔ اس قسم کے قصیدے بالعموم فارسی میں ملتے ہیں۔ ان میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ معاصرین ایک دوسرے کے قصائد پر طبع زاد قصائد لکھتے ہیں اور ایسی بھی کہ متاخرین متقدمین کا تتبع کر رہے ہیں۔ چناں چہ بعض قصائد کی زمینیں خاص وجوہاتِ پسندیدگی کی بنا پر بہت سے شعرا کی طبع آزمائی کی جولان گاہ بنیں۔ میں یہاں مثال کے طور پر چند ہم طرح قصیدوں کے مطلعے دیتا ہوں۔ روٗنی۔ وطواط۔ معزی اور مسعود سعد سلمان۔

رونی ؎

قبول یافت ز ہر ہفت اختر آتش و آب وجیہ گشت بہ ہر ہفت کشور آتش و آب

وطواط ؎

توئی کہ تیغ ترا شد مسخر آتش و آب فگندہ ہیبتِ تو زلزلہ در آتش و آب

معزی ؎

زبس کہ ماند دل وچشم من در آتش و آب گشادہ در دل و درچشم من بر آتش و آب

در مدح مسعود، مسعود سعد سلمان ؎

نشستہ ام ز قدم تا بسر اندر آتش و آب تواں نشستن ساکن چنیں در آتش و آب

ایک ہی زمین میں انوری اور رونی کا قصیدہ :-

انوری ؎ باز ایں چہ جوانی و جمالست جہاں را دیں حال کہ نوگشت زمیں را و زماں را

رونی ؎ نوروز جواں کرد بہ دل پیر و جواں را ایام جوانی است زمیں را و زماں را

سنائی اور عرفی کا ایک ہم طرح قصیدہ ۔ سنائی ؎

دلا تا کی دریں زندان فریبِ ایں و آں بینی ۔۔۔ یکی زیں چاہِ ظلمانی بروں شو تا جہاں بینی

عرفی ؎

ز خود گر دیدہ بربندی چگویم کامِ جاں بینی ۔۔۔ ہماں کز اشتیاقِ دیدنش زادہ ہماں بینی

رونی اور عرفی :۔

رونی ؎ سپہر دولت و دیں آفتاب ہفت اقلیم ۔۔۔ ابوالمظفرِ شاہِ مظفر ابراہیم

عرفی ؎ صباحِ عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم ۔۔۔ گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

مسعود سعد سلمان ۔ رونی اور قاآنی :۔

سعد سلمان ؎ ز خاک و باد کہ ہستند یارِ آتش و آب ۔۔۔ قوی تر آمد بسیار آتش و آب

رونی ؎ گرفت مشرق و مغرب سوارِ آتش و آب ۔۔۔ ربود حرص امارت قرارِ آتش و آب

قاآنی ؎ چہ جوہر است کہ ہست اعتبارِ آتش و آب ۔۔۔ چہ گوہر است کہ زیبد نگارِ آتش و آب

عنصری ۔ فرخی اور منوچہری :۔

عنصری ؎ شہِ مشرق و شاہِ زابل ستانی ۔۔۔ خداوند اقران و صاحب قرانی

فرخی ؎ یکی گوہری چوں گُلِ بوستانی ۔۔۔ نہ زر و بہ دیدار چوں زرِ کانی

منوچہری ؎ جہانا چہ بدمہر و بدخو جہانی ۔۔۔ چو آشفتہ بازار بازارِ کانی

خاقانی اور قاآنی :۔

خاقانی ؎ می و مشک است کہ با صبح برآمیختہ اند ۔۔۔ یا بہم زلف و لبِ یار در آمیختہ اند

قاآنی ؎

غم و شادی ست کہ بایک دگر آمیختہ اند یا مہ روزہ بہ نوروز در آمیختہ اند

اسی طرح میرزا غالب نے نظیری کے قصیدوں پر قصیدے لکھے ہیں۔

اس قسم کے ایک ہی زمین کے قصیدوں کی بعض اوقات اتنی کثرت ہوتی ہو کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اِس زمین کا موجد کون تھا ہاں اس قدر بتا سکتے ہیں کہ سب سے قدیم قصیدہ اس طرح میں ہیں فلاں شخص کا ملتا ہو۔

بعض قصائد میں زمین کے علاوہ موضوع بھی ایک ہی ہو۔ مثلاً ثنائی، جمال الدین اصفہانی اور خسرو کا ایک قصیدے میں شہر آشوب کا مضمون ہو

جمال الدین ؎ الحذار ای عاشقاں زیں وحشت آباد الحذار الفرار ای غافلاں زیں دیو مردم الفرار

ثنائی ؎ ای خداوندانِ مال الاعتبار الاعتبار ای خدا خوانانِ قال الاعتذار الاعتذار

غزلوں میں پیروی

فارسی میں جب سعدی اور خسرو کے زمانے میں غزل گوئی کا چرچا ہوا تو یہی زمینوں کی پیروی غزلوں میں بھی منتقل ہوگئی۔ متحد زمینوں کی غزلیں قصیدوں سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ خواجہ عماد اور حافظ کے ہاں اکیس غزلیں متحد زمین کی ہیں۔ خواجہ حافظ اور عماد معاصر تھے عماد دونوں میں چھوٹے تھے، غالبًا تتبع انھی نے کیا۔[۱]

اس قسم کی غزلوں کی ایک کثیر تعداد آپ کو تحفۃ الحبیب میں ملے گی " یہ کتاب ایسی فارسی غزلوں کا مجموعہ ہو جو بعض اساتذۂ ایران نے ایک ہی بحر و ردیف و قافیہ میں لکھی ہیں . . . . . اس مجموعے میں ایک سو اسّی (۱۸۰) شعرا کی غزلیں تخلص کے ساتھ جمع کی گئی ہیں لیکن ایسی غزلیں بھی کثرت سے ہیں جن کے مصنفین کے ناموں کے واسطے لا اعلم ولا ادری لکھا گیا ہو۔ مجموعے کا حجم ۹۱۲ صفحوں کا ہو۔ اس کا جامع فخری ابن محمد امیری ہو۔ جامع نے یہ کتاب ۹۴۱ھ میں حبیب اللہ آصف کے ایما سے مرتب کی تھی جس کی بابت وہ لکھتا ہو کہ " ایں شہنشاہ ترک و عرب تھا جب اُسے یہ مجموعہ دکھایا گیا تو اس نے جامع سے کہا ؎

[۱] اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۲۸ء و نومبر ۱۹۲۹ء

تو ہم درچنیں کارگاہِ سخن	زکارِ سخن آں چہ دانی بہ کن
مبادا بہ بعضے شود اشتباہ	کہ در ملک نظمت نہ بود است راہ

مصنف نے اس میں التزام کیا ہے کہ جب تین سے زیادہ شاعروں کی غزلیں ایک ہی بحر و ردیف و قافیے میں نہ ملیں تو چوتھی غزل اپنی شامل کردی"۔

تحفۃ الحبیب اس مجموعے کا تاریخی نام ہے، ان غزلوں میں ہم کو توارد کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً

(۱) سعدی ؎ یارب تو آشنارا مہلت دہ و سلامت	چنداں کہ باز بیند دیدار آشنا را
حافظ ؎ کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز	باشد کہ باز بینم دیدار آشنا را
(۲) خاقانی ؎ داریم رو بجانے از بہر مدعاے	درحق ما دعاے شیخا بزرگوارا
مولانا نہائی خالی ؎
مستیم و بادہ در سر رسواے شہر و کشور	با ما مشو برابر شیخا بزرگوارا
(۳) حافظ ؎ الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا	کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا
جامی ؎ شراب لعل باشد قوتِ جاں ہا قوتِ دل ہا	الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
جامی ؎ ز اول عشق مشکل بود و آخر ہم چرا گویم	کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا
(۴) حافظ ؎ بہ بوی نافۂ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید	ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دل ہا
ابن حسام ؎ بہ امیدے کہ بکشاید ز لعل یار مشکل ہا	خیال آں لب میگوں چہ خوں انگندہ در دل ہا
(۵) حافظ ؎ ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما	مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما
جامی ؎ ساقی بیا کہ دور فلک شد بکام ما	خورشید را فروغ دہ از عکس جام ما

معاصرین کے انفرادی مشاعرے

اب ہم معاصرین کے مشاعروں کو لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کی منزل میں شعرا ہم طرح قصائد اور غزلیں کہتے تھے لیکن اس میں یہ ضروری نہیں تھا کہ شعرا ہم عصر ہوں۔ یہاں آکر ہمیں انفرادی مقابلے ملتے ہیں یعنی دو شاعر حریف بن کر یا دوستانہ طریقے سے ایک ہی زمین میں قصیدے اور غزلیں تصنیف کرتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک شاعر نئی زمین میں قصیدہ کہتا ہے اور دُوسرا اس کا جواب لکھتا ہے۔

۲۔ دونوں کسی دُوسرے شاعر کی ایجاد کردہ زمین طرح کے طور پر مقرر کر لیتے ہیں۔

ان معرکوں کا آغاز پانچویں صدی ہجری میں شروع ہوتا ہے۔ شاعروں کی باہمی رقابت عموماً شاہی انعام و اکرام پر ہوتی تھی اگر ایک شاعر کو کسی قصیدے پر بھاری صلہ دیا جاتا تو حریف اسی زمین میں بہتر قصیدہ لکھنے کی کوشش کرتا۔ عموماً یہ رقابت ایک ہی دربار کے شعرا کے مابین ہوتی تھی۔ چناں چہ "عضایری رازی کے دو شعروں پر سلطان محمود نے دو توڑے دلوا دیے۔ عنصری نے عضایری کے قصیدے کا رد لکھا۔ عضایری نے قصیدے ہی میں رد الرد لکھا۔ ان قصیدوں میں اس تفصیل سے اعتراض و جواب ہیں کہ گویا علمی رسالے ہیں"[۱] اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کے مشاعرے مناظروں کا کام بھی دینے لگے تھے۔

دولت شاہ، عضایری کے بارے میں لکھتا ہے:[۲] "از اکابرِ شعراست۔ در روزگارِ سلطان محمود بن سبکتگین بودہ از و ولایت ری بہ عزم ملازمت متوجہ غزنیں شدہ بہ دار الملک غزنیں در مشاعرہ و معارضہ مشغول شدہ۔"

پانچویں صدی کے آخر میں عہدِ ابراہیم غزنوی میں ہمیں راشدی اور مسعود سعد سلمان کے باہمی معرکوں کا پتا چلتا ہے یعنی دونوں شاعروں میں مشاعرے بھی ہوئے ہیں چناں چہ مسعود سعد سلمان لکھتا ہے ؎

ہر آں قصیدہ کہ گفتیش راشدی یک ماہ جواب گفتم بہ زاں بدیہہ ہم بہ زماں[۳]

پانچویں صدی کے بعد چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی ہجری تک ہمیں ان انفرادی مشاعروں کے وجود کی شہادت حاصل ہے۔

چھٹی صدی میں (۱) خاقانی اور اثیر الدین کے مشاعرے۔ دولت شاہ لکھتا ہے[۴] "و فاضل زمانِ خود اثیر الدینؒ معاصر خاقانی بود و از دیار فرغانہ ترکستان بہ آرزوی مشاعرہ خاقانی آہنگ ملک شروان کرد۔"

(۲) شمس طبسی اور قاضیٔ بخارا صدر الشریعہ۔ شمس طبسی کے ذکر میں دولت شاہ راقم ہے "شمس الدین معاصر سلطان الفضلا صدر الشریعت (قاضیٔ بخارا) از اکابر فضلاست و با یک دیگر صحبت داشتہ اند۔ گویند کہ قاضی شمس الدین

---

[۱] 'شعر العجم' جلد ۴، صفحہ ۱۳۱ شعرا کے باہمی معرکے۔ [۲] 'دولت شاہ'، صفحہ ۳۳۔ [۳] 'اُردو' جنوری و اپریل ۱۹۲۳ء تبصرہ از علامہ شیرانی بر کتاب شمس العلما عبد الغنی صفحہ ۱۶۔ [۴] 'دولت شاہ'، صفحہ ۸۰، نیز دیکھو 'آثار البلاد' صفحہ ۲۷۶

آوازۂ فضل کمال صدر الشریعۃ بشنود و عزیمت بخارا کرد۔ روزی کہ بدیدن صدر الشریعۃ رفت، درآں شب صدر الشریعۃ قصیدۂ گفتہ بود و بعد از آں کہ طلبہ را درس گفت ایں قصیدہ را می خواند و درغث وسمینِ آں فضلا سخن می گفتند و این است بعضی از آں قصیدہ ے

برخیز کہ صبح است وشراب ست ومن وتو　　　آوازِ خروس سحرے خاست ز ہرسو
برخیز کہ برخاست پیالہ بیکی پای　　　بنشیں کہ نشست ست صراحی بہ دوزانو
می نوش از اں پیش کہ معشوقہ شب را　　　با صبح بگیرند و ببرند دو گیسو
درشیشۂ مینا مۓ رنگیں خور وپندار　　　سنگی کہ دریں شیشۂ گردندۂ مینو
ای آہوی رعنای ترا صید دل من　　　در زلف پریشانِ تو چوں نافۂ آہو
از حسرتِ شفتالوی سرخ لب لعلت　　　ہم رخ پرخم زطباں چہ است زآلو

مولانا شمس الدین از مجلس برخاست و فی الحال بطریقۂ بدیہہ ایں قصیدہ را جواب گفت و بحضور مولانا صدر الشریعۃ آورد و بگزرانید و بعضی از آں قصیدہ ایں ست ے

از روی تو چوں کرد صبا طرّہ بیک سو　　　فریاد برآورد شب غالیہ گیسوٗ
از زلف سیاہ تو مگرشد گرہی باز　　　کز مشک برآور فلک تعبیہ ہر سوٗ
از شرم خط غالیہ تاثیر تو ماند است　　　در وادیٔ غم با جگرِ سوختہ آہوٗ [۱]

(۳)۔ خالد ابن الربیع المکی الطولانی . . . . " میانِ او و وحد الدین انوری مکاتبات ومشاعرات ست [۲]

(۴) حمید الدین الجوہری المستوفی . . . . " میانِ او و استاد سوزنی مشاعرات ست " [۳]

(۵) شرف الدین احمد بن محمد ایزد یار الشہیر لفرید کاتی " میانِ او و صدرِ اجل جمال الدین افضل العصر (افتخار الملک) مکاتبات ومشاعرات ست " [۴]

ساتویں صدی | اس صدی میں انفرادی مشاعروں کا سب سے زیادہ زور ہے۔ عوفی یزدی 'لباب الالباب' میں مختلف ہم عصر شعرا کے مشاعروں کا ذکر کرتا ہے مثلاً :-

---

[۱] دولت شاہ صفحہ ۸۰ - [۲] لباب الالباب جلد دوم صفحہ ۱۱۱ - [۳] لباب جلد دوم صفحہ ۲۰۸ [۴] لباب جلد اوّل صفحہ ۱۲۱

(۱) ملک طغان شہ بن محمد المؤید . . . . " میانِ او و میانِ ملک تاج الدین تمران مکاتبات و مشاعرات ست"[۱]

(۲) فخر الدین محمد . . . . " مدتی در نیشاپور بہ مصاحبت یک دیگر بودیم و میانِ ایں ضعیف و او مشاعرات ست"[۲]

(۳) ابوالفضل عثمان بن احمد الہروی . . . " میانِ او و رفیع مشاعرات ست"[۳]

(۴) الحکیم مجد الدین فہیمی البخاری . . . . " میانِ او و سعد الدین کافی مشاعرات ست"[۴]

دولت شاہ نے بھی اس صدی کے بعض مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔

(۵) رکن الدین قبای . . . " با بدر الدین جاجرمی در اصفہان مشاعرہ و معارضہ دارد"[۵]

{ساتویں کا آخر یا آٹھویں کا آغاز} (۶) جاجی . . . " بہ تبریز رفت و با خواجہ ہمام الدین مشاعرہ کرد"[۶]

آٹھویں صدی

(۱) سراج الدین قمری . . . . سراج الدین را با عبید زاکانی و خواجہ سلمان مشاعرہ و معارضہ است "[۷]

(۲) امیر یمین الدین فریومدی . . . . " میانِ امیر یمین الدین و پسرش امیر محمود کہ مشہور است بہ ابن یمین مشاعرہ بود "[۸]

نویں صدی

(۱) ملک الشعرا مولانا بدر شیروانی . . . . " مولانا محمد کاتبی از خراسان چوں بہ شیرواں افتاد میانِ او و مولانا بدر مشاعرہ و معارضہ دست داد "[۹]

(۲) خواجہ علی شہاب . . . " میانِ او و شیخ عارف آذری مشاعرہ و مناظرہ افتاد "[۱۰]

شاعروں کی اس قسم کی باہمی چشمکیں بے شک شاعری کی ترقی کا موجب ہوتی تھیں۔ مولانا شبلی 'شعر العجم' میں لکھتے ہیں " ایک شاعر کوئی نظم زور کی لکھتا تھا تو حریف شعرا قصیدے کا جواب لکھتے تھے اور زیادہ زورِ طبیعت صرف کرتے تھے۔ اکثر مشکل مشکل طرحوں میں اس غرض سے قصیدے لکھتے تھے کہ حریف سے جواب بن نہ آئے۔"[۱۱]

نویں صدی کے اختتام پر اور دسویں صدی کے دوران میں طرحیں دینے کا رواج ہوا۔ اس سے پیشتر شعرا از خود

---

[۱] لباب جلد اول ص۱۰۶۔ [۲] لباب جلد اول ص۲۱۲۔ [۳] لباب جلد دوم ص۳۲۶۔ [۴] لباب جلد دوم ص۳۸۶
[۵] دولت شاہ ص۱۴۴۔ [۶] دولت شاہ ص۱۸۱۔ [۷] دولت شاہ ص۲۳۵۔ [۸] دولت شاہ ص۲۷۳۔
[۹] دولت شاہ ص۳۷۷۔ [۱۰] دولت شاہ ص۳۹۱۔ [۱۱] شعر العجم جلد ۴۔ ص۱۳۷

اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے۔ طرح اس سے قبل عموماً کسی شاعر کا امتحان کرنے کے لیے دی جاتی تھی۔ چناں چہ میخانے میں خواجہ حافظ کا قصہ انھی کی زبانی یوں دیا گیا ہے:۔

"من ایں غزل خواندن گرفتم۔ چوں تمام شد ہمگی گفتند ایں شعر تو نیست بہ اعتقادِ ما معلوم نیست کہ دریں جزوِ زماں کسی بہ ایں خوبی شعر بگوید چوں از تو قبول کنیم؟ گفتم غزل طرح کنید۔ غزلی طرح کردند بہ توفیق فیاض علی الاطلاق خوب گفتم"۔[۵۱]

مآثر رحیمی۔ ص ۷۴۴۔ بیان مولانا قمی۔ وغزلی چند کہ مستعداں درآں زماں بہ جہت آزمایش و امتحان طبیعت آں دانش پژوہ طرح کردند دم مساوات بلکہ پیشی زد"

مولانا شبلی شعر العجم میں رقم کرتے ہیں:۔

"اس زمانے میں شاعری کی ترقی کا ایک سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ مشاعرے کا رواج قائم ہوا۔ اس سے پہلے شعرا بطورِ خود اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے اب یعنی فغانی کے زمانے سے یہ طریقہ ہوا کہ کسی امیر صاحبِ مذاق کے مکان پر شعرا جمع ہوتے تھے۔ پہلے سے کوئی طرح دے دی جاتی تھی سب اس طرح میں غزلیں لکھ کر لاتے تھے اور پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی برسرِ محفل برابر کے دعوے داروں میں چوٹ چل جاتی تھی۔ سوال و جواب ہوتے تھے اور اس طرح مسابقت اور حریف پیشگی شاعری کو ترقی دیتی جاتی تھی ...."[۵۲]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "فغانی کی غزلیں عموماً طرح کے طور پر دی جاتی تھیں اور محتشم کاشی وحشی یزدی غیرتی وغیرہ ان میں غزلیں لکھتے تھے۔ عرفی بھی انھی طرحوں پر غزلیں لکھتا تھا اور عام مشاعروں میں بے باکانہ پڑھتا تھا۔ وحشی یزدی یزد میں سکونت رکھتا تھا اس لیے اس سے تحریری مناظرات رہتے تھے۔ اوحدی نے لکھا ہے کہ جب میں شیراز گیا تو مشہور شعرا کے نام دریافت کیے۔ لوگوں نے غیرتی کا پتا دیا۔ شیراز میں ایک دکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا یہاں عارف لاہجی، حسین کاشی مؤرخ، میر ابوتراب شبستری مخاطب بہ مؤرخ خاں، رضای کاشی وغیرہ مشاعرے کرتے تھے۔ مشاعرے میں غیرتی اور عرفی سے مباحثہ ہوا۔ عرفی نے دعوے کے دونوں پہلو مخالف اور موافق لیے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا...."[۵۳]

---

[۵۱] میخانہ ص ۸۲۔ [۵۲] شعر العجم جلد ۲ ص ۱۹۱۔ [۵۳] شعر العجم جلد ۳ ص ۸۳ بہ بعد بہ حوالہ بہارستان سخن صمصام الدولہ شاہنواز خاں

شیراز کے علاوہ مشاعروں کا بڑا مرکز کاشان تھا۔ عبدالباقی نہاوندی کاشان کے مشاعروں کا ذکر مآثرِ رحیمی میں کرتا ہو۔

خراسان میں مشاعرہ :۔ صـ۳۲۳ مآثر رحیمی ذکر مولانا مظہری کاشمیری . . . " وغزلی چند طرح نمودند و به امثال و اقران خود دم مساوات زدند"

یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر اور خان خاناں کی بخششیں دور دور سے اہلِ کمال کو ہندستان میں کھینچ کر لارہی تھیں ایران میں صفویوں کی شعر و شاعری کے معاملے میں بدذوقی انھیں وہاں سے نکلنے پر آمادہ کرتی تھی۔ ایران سے بہت سے شعرا ان دنوں ہندستان میں آئے اور انھی مشاعروں کو اپنے ساتھ لائے۔ یہیں بہت سی مجالس مشاعروں کی نظر آتی ہیں۔

کشمیر میں ظفرخاں کے ہاں مشاعرے ہوتے تھے جن میں کلیم۔ صائب اور غنی وغیرہم شریک رہتے۔ [۱]
مآثرالامرا میں لکھا ہو :۔

"و در ہر ہفتہ یک بار مشاعرہ مقرر کردہ بود۔ جمیع شعرای کشمیر حاضر می شدند در آخر مجلس شیلانے می کشید۔" [۲]

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے بدایونی سے ایک واقعہ پیش کیا ہو جو مشاعرے کے وجود پر دلالت کرتا ہو:۔
بدآیونی نے امیر سلطان کا ایک شعر نقل کیا ہو ؎

باریک چو موی ست میانی کہ تو داری گویا سرِ آں موست دہانی کہ تو داری

"چوں ایں غزل درمیاں انداخت خیلی از شعرای آں صوبہ جواب گفتند ازاں جملہ این ست ؎ گفتم کہ گمایست دہانی کہ تو داری ۔ گفتا کہ یقیں است گمانی کہ تو داری ـــــــ و فقیر ایں چنیں گفتہ بودم ؎

سرچشمۂ خضر است دہانی کہ تو داری ماہی است دراں چشمہ زبانی کہ تو داری [۳]

بدایونی نے ایک اور امیر محمد خاں کلاں غزنوی کے بارے میں نقل کیا ہو :۔

"در زمانے کہ حکومت سنبل داشت ایں غزل حضرت شیخ سعدی قدس سرہ درمیان انداخت کہ ؎

دلی کہ عاشق صابر بود مگر سنگ است ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

وخود ایں چنیں گفت کہ ؎

[۱] شعرالعجم جلد ۳ صـ۲۱۹ ۔ [۲] مآثرالامرا حصہ دوم صـ۲۷۷ ۔ [۳] بدایونی صـ۲۳۸

دمے کہ چہرۂ ساقی زِ بادہ گل رنگ است　　بہ نوش بادہ بر آواز نے کہ دل تنگ است

و میر امانی و دیگر شاعران ہر کدام فراخور حوصلہ و حالت خویش موافق زباں آں زمان تتبع نمودہ جواب دادند ازاں میاں جمال خان مرحوم بداونی کہ نسبت مصاحبت و تقرب تمام بہ خان داشت و در لطافت طبع یگانہ بود غزلی گفت کہ مطلعش ایں ست ؎

تُرا رخ از مئے عشرت مدام گل رنگ است　　مرا بہ فکر دہانت چو غنچہ دل تنگ است...[1]''

اس زمانے میں مشاعروں کا سب سے بڑا مرکز برہان پور تھا۔ صاحب مآثرِ رحیمی جا بہ جا اس کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً مولانا تسلی کے بیان میں درج ہے :۔

''بہ برہان پور آمدہ بہ شرفِ بندگیٔ شان سرفراز شد، و در وقتے کہ مؤما الیہ (خان خاناں) در بُرہان پور بود و ہنوز ملازمت ایشاں نہ نمودہ بود ایں غزل خواجہ حسین ثنائی را کہ ایں بیت از وست ؎

ای اہلِ ہوش وقتِ گریباں دریدن است　　دست مرا بہ سوے گریباں کہ می برد؟

طرح فرمودہ بودند کہ موزونانِ برہان پور و بندگانِ صاحب طبیعت ایشاں نیز بگویند مولانا مذکور آں غزل را قصیدہ بہ مدح ایں سپہ سالار بود ''[52]

مولانا سیدی کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔

''بتاریخ سنہ یک ہزار و بست و دو از عراق بہ رفاقت و ہمراہیٔ ایں فقیر بہ ہندستان افتاد و غزلی چند کہ در دارالسلطنت برہان پور درمیانۂ بعضی موزونان طرح شدہ بود بہ غایت نیکو گفت ''[53]

مولّف اپنی سوانح میں لکھتا ہے :۔ '' در سنہ ہزار و ہفت غزلی درمیانۂ مستعداں طرح شدہ بود ... ''[54]

برہان پور میں مشاعروں کا یہ چرچا خان خاناں کی بدولت تھا جو خود طرحیں دے کر شاعروں سے غزلیں لکھوا تا تھا اور خود بھی لکھتا تھا۔ ملّا صاحب اس کے متعلق رقم طراز ہیں :۔

''خان خاناں در قابلیت و استعداد یکتائی روزگار بود و عربی و فارسی، ترکی و ہندی رواں داشت۔ شعر خوب می فہمید و رحیم تخلص کرد ''

''خان خاناں کو فراہمی کتب کا بے حد شوق تھا اور اس قدر کتابیں جمع کی تھیں کہ وہ دار الحکمت کا کام دیتا تھا۔ ایک عجیب خصوصیت اس کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر ممتاز و معروف شعرا اس کے دربار میں تھے،

---

[1] بدایونی صہ ۲۸۸ ۔ [52] مآثرِ رحیمی صہ ۱۵۲۶ ۔ [53] مآثرِ رحیمی صہ ۱۱۳۹ ۔ [54] مآثرِ رحیمی صہ ۱۵۴۵

ان کے دیوان خود ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے اکثر شعرا اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے کتب خانے میں غزلوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ شعرا جلسۂ مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ خانخاناں خود بھی شریکِ جلسہ ہوا کرتا تھا اور اس نے خود ان طرحوں میں غزلیں کہی ہیں اور زور آزمائیاں کی ہیں۔"

عہدِ اکبری میں ہمیں انفرادی مشاعرے کی ایک ایسی مثال ملتی ہے جو بہت نادر ہے۔ اس میں عرب کے مفاخروں کا رنگ بھی ہے اور اس کے علاوہ مطارحہ بھی موجود ہے لیکن بجائے غزل کے رباعی کو استعمال کیا گیا۔ خان زمان اکبر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوا اُس نے اکبر کو لکھا:۔ ؎

ای سدِ سکندرِ زمانہ درِ تو   یاجوج بود سپاہی لشکرِ تو
در دورِ تو آثارِ قیامت پیداست   دجال توئی خواجہ امینا خرِ تو

اکبر نے اس کا جواب حسب ذیل رباعی میں دیا ؎

ای خانِ زماں کہ پُر بود لشکرِ تو   شد دولتِ من باعثِ کر و فرِ تو
کم تر باشم ز خرِ دجال امروز   فردا من اگر جدا نہ سازم سرِ تو

خان زمان نے پھر لکھا ؎

تا ہست اثرِ خالصہ در کشورِ تو   مشکل کہ بمن جنگ کند لشکرِ تو
بگذر ز زر و سیم کہ تا نوکرِ تو   از سر گذرد برای سیم و زرِ تو

اکبر: ؎ باآں کہ بود خاکِ درم افسرِ تو   امروز بمن فرد نیاید سرِ تو
از دولتِ من ہست ترا سیم و زری   وز زورِ زر است قدرتِ لشکرِ تو

خان زمان:۔ ؎ ای شاہِ زماں منم کمیں نوکرِ تو   وز ترس نمی توانم آمد برِ تو
از دور تو قصدِ کشتنِ من داری   نزدیک چساں توانم آمد برِ تو

اکبر:۔ ؎ گفتی تو چو امتی خدا یاورِ تو   صد رحمتِ حق بر پدر و مادرِ تو
تغییر بدہ تو سکہ و خطبۂ من   تا من نہ کنم آرزوی کشورِ تو

جہاں گیر کی اپنی شعرفہمی کا معیار نہایت بلند تھا اور معمولی شاعر اس کے رُو بہ رُو غزل یا قصیدہ پڑھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ وہ خود طرحیں ڈالا کرتا تھا۔ دو ایک مشاعروں کا 'تُوزک' میں بھی ذِکر ہی۔

ایک دفعہ دربار میں یہ شعر امیرالامرا کا پڑھا گیا ؎

بہ گزر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق　　　یک زندہ کردنِ تو بہ صدخوں برابر است

جہاں گیر کے اشارے پر سب نے غزلیں کہیں۔ جہاں گیر نے ملّا احمد مُہرکن کا شعر پسند کیا چناں چہ یہ تمام واقعہ 'تزک' میں لکھتا ہی جو حسبِ ذیل ہی :۔

'بہ تقریبے ایں بیت امیرالامرا خواندہ شد . . . . چوں طبع من موزون است گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصرع و رباعی یا بیتے در خاطرم سرمی زند ایں بیت برزباں گزشت ؎

ازمن عتاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس　　　یک دل شکستن تو بہ صدخوں برابر است

چوں خواندہ شد ہرکس کہ طبع نظم داشت دریں زمین بیتے گفتہ گزرانید۔ علی احمد مُہرکن کہ احوال او پیش ازیں گزشت بد نہ گفتہ بود ؎

ای محتسب ز گریۂ پیرِ مغاں بہ ترس　　　یک خم شکستن تو بہ صدخوں برابر است

جہاں گیر کے عہد میں دوسرے امرا بھی اپنے ہاں مشاعرے منعقد کراتے تھے مثلاً امان اللہ خاں فرزند زمانہ بیگ مہابت خاں کے مشاعرے کا 'موخانۂ' میں ذِکر ہی۔

جہاں گیر خود شعروشاعری کا دِل دادہ تھا۔ شاہ جہاں اور عالم گیر نے اگرچہ اس کی جانب توجّہ نہیں کی لیکن ان کے عہد میں بھی مشاعرے کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ہیں۔

شاہ جہاں کا عہد

قدسی کا ایک قصیدہ ہی :۔

عالم از جلوۂ حُسن تو چناں تنگ فضاست
کہ سپند از سرِ آتش نہ تواند برخاست

شیدا نے اس قصیدے کے ایک ایک شعر کا رد لکھا اور اسی بحر و قافیے میں لکھا۔ مُنیر لاہوری نے محاکمہ کیا اور وہ بھی انھی قافیوں میں ہی . . . .[1]

[1] شعرالعجم، جلد ۴ صـ۱۳۷

شیدا ہی کے حالات میں عمل صالح میں ایک مشاعرے کا بیان درج ہے جو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

عہد عالمگیر

کلمات الشعرا کا مصنف سرخوش اپنے معاصرین کے مشاعروں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ خود بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ میر محمد احسن ایجاد پر رائے زنی کرتا ہے ... غزل ہائے طرحی را بہ قدرت تمام می گوید ... [1] پھر ایک اور جگہ میر نظام الدین احمد طالع کے حالات میں لکھا ہے:۔ "روزی ایں بیت خواجہ حافظ شیراز .... باہم طرح کردہ ایم۔ حافظ:۔

مزرعِ سبز فلک دیدم و داس مہِ نو | یادم از کشتۂ خویش آمد و ہنگام درو [2]

یہ واقعات کم وبیش انفرادی مشاعروں کی فہرست میں آسکتے ہیں یہاں میں صراحت سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ اس دور میں آکر مشاعرے باضابطہ یعنی مروجہ صورت میں آچکے تھے لیکن اس کی پرانی صورتیں اب بھی قائم تھیں۔ جس طرح والدین اپنی اولاد کے پرورش پا چکنے کے بعد زندہ رہتے ہیں بعینہٖ یہی کیفیت مشاعروں کی ہے۔ انفرادی مشاعرے اب تک قائم تھے اور آیندہ بھی قائم رہے اور ہم دیکھیں گے کہ اُردو میں منتقل ہوکر جب مشاعروں میں پابندیٔ اصول و قاعدہ شرط ہوئی اور مشاعروں نے مستقل رواج و رسم کی صورت اختیار کی، اس وقت بھی مشاعرے کی ابتدائی شکلیں قائم رہیں۔ چناں چہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ میرزا غالب نے نظیری کے قصائد کا اسی طرح تتبع کیا جس طرح اوائل میں شعرا کرتے تھے۔

اسی طور پر طرح کا استعمال شاعر کی اہلیت جانچنے میں تا ایں دم ہوتا ہے اور ہر عہد میں رہا۔ عالمگیر کے عہد میں ہمیں اس کی ایک مثال ملتی ہے، سرخوش کے 'کلمات الشعرا' میں ہے:۔

"در اوائلِ روزی فقیر یا وی گفت کہ مسودہ اشعار ملا ندیم بدست ناصر علی افتادہ و اشعار آں را بنام خود می خواند گفت امتحان شاعر طرح غزل است بہ باید باہم طرح غزل کنیم ..." [3]

اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ فارسی کے مشاعرے کثرت سے ہندستان میں رائج ہوچکے تھے اور بعد کے زمانے میں ترقی پکڑتے گئے حتیٰ کہ جب اُردو زبان نے ادبی حلقوں میں طاقت حاصل کی اور مشاعرے اُردو میں ہونے لگے، اُس وقت بھی ان کے دوش بہ دوش فارسی مشاعروں کی محفلیں باقاعدہ جمتی رہیں بلکہ جہاں اُردو

---

[1] کلمات الشعرا ص۸۔ [2] کلمات الشعرا ص۷۲۔ [3] کلمات الشعرا ص۷۵۔

کی طرح دی جاتی وہاں اساتذۂ فارسی کے لیے فارسی کی ایک الگ طرح بھی رکھی جاتی تھی۔ فارسی زبان منظرِ عام سے کبھی نہیں ہٹی اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

مشاعروں کا رواج اُردو میں

اُردو ادب کا شمالی ہند میں باضابطہ آغاز محمد شاہ کے اوائلِ حکومت میں ہوا ہو اور یہی وہ زمانہ ہو جب کہ مشاعرے فارسی سے منتقل ہوکر اُردو میں بھی جگہ پانے لگے۔ اگر انفرادی مشاعروں کو لیا جائے تو ان کا وجود ہمیں ولیؔ دکنی کے عہد سے ملتا ہو۔ آزادؔ نے 'آبِ حیات' میں حسبِ ذیل لطیفہ نقل کیا ہو:-

ولی نے اپنے جوش ریختہ میں ناصر علی سرہندی کو کہ علیؔ تخلص کرتے تھے، یہ شعر لکھا:-

اچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق　　　　اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے اس کے جواب میں لکھا:-

بہ اعجازِ سخن گر اُڑ چلے وہ　　　　ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں [۱]

محمد شاہی عہد میں فارسی مشاعرے

اس واقعے پر مشاعرے کا صحیح اطلاق نہیں ہوسکتا لیکن مشاعروں کی باقاعدہ ابتدا سوداؔ کے اوائلِ عمر میں ہوتی ہو۔ فارسی گویوں کے لیے غزلوں کو منظرِ عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے۔ اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے سب سے زیادہ مشہور مشاعرہ مرزا بےدلؔ کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا۔ اس زمانے کے شاعروں کے کلام اور دیگر تحریروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہو۔ مثلاً 'خزانۂ عامرہ'، میں اس کا ذکر ہو۔

نیز سوداؔ نے مولوی ندرتؔ کی ہجو میں اس کا ذکر کیا ہو، وہ خود انھی مشاعروں میں اپنا فارسی کلام سُناتا تھا۔ اس ہجو میں وہ دو جگہ لکھتا ہو:-

(۱) عرس میں جا میرزا بےدلؔ کے تئیں باشد ومد　　　　شعر ناموزون دپوچ اس رات کو پڑھتا تھا جد

کہتے تھے سُن سُن کے تیرے حق میں سب یوں نیک و بد　　　　چوں کلاغ امشب کہ مغزِ سامعان را مے خورد

ایں لعیں در بزم طرح شور و غوغا ریختہ

(۲) ایسی غزل اک عرس میں تم سے جب انصرام ہو بحر میں جس کی ہر طرح شبہ خاص و عام ہو
تقطیع اس کی جس کنے صبح سے تا بہ شام ہو اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منھ کو تنک لگام دو[۱]

پہلی مثال سے ظاہر ہے کہ فارسی کے یہ مشاعرے بھی رات کے وقت ہوتے تھے۔

فارسی گویوں کے توڑ پر دلی کے ریختہ گویوں نے مجلسِ مراختہ کی بنا ڈالی یعنی صحبتِ ریختہ گویاں میاں کم ترین کے بیان میں 'نکات الشعرا' میں میر تقی لکھتے ہیں:۔ "گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ ایں لفظ بوزنِ مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود"[۲] نیز دیکھو قیام الدین قائم مخزنِ نکات صفحہ ۱۴ ذکرِ فرحت "گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ ایں اختراع بروزنِ مشاعرہ است بہ نظر می آید"

سب سے قدیم مراختہ خان آرزو کا ہے جو اس کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور ریختے کے تمام بڑے بڑے اُستاد یعنی سودا، میر، میر درد، جرأت وغیرہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ شفیق اورنگ آبادی چمنستانِ شعرا میں اس کا ذکر میر درد کے بیان میں بہ ایں الفاظ کرتے ہیں:۔ "شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری می گوید کہ ایں عزیز بزرگِ عالی دودماں را فقیر مکرر بہ خانۂ خان آرزو روز مراختہ یعنی صحبت ریختہ گویاں ہندی کہ در پانزدہم ہر ماہی مقرر بود دیدہ ام"[۳] حاکم لاہوری نے 'مردم دیدہ' میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

'آبِ حیات' میں مولانا آزاد نے اسی مشاعرے کے ایک واقعے کی روایت کی ہے کہ سودا نے یہ مطلع پڑھا

؎ آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو :. اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو۔ شعر قدسی کے ایک مطلع کا ترجمہ تھا۔ خان آرزو نے فوراً کہا ؎ شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے :. چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک۔

سودا اُٹھ کر خان سے لپٹ گیا اور لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ خان نے واقعی اس کے شعر کو حدیثِ قدسی کہا۔

قدسی کا اصل شعر یہ ہے:۔ ؎ آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را :. اختر ز فلک می نگرد روی زمیں را[۴]

دوسرا مشہور مراختہ خواجہ میر درد کا ہے۔ میر تقی 'نکات الشعرا' میں میر درد کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

"مجلسِ ریختہ کہ بہ خانۂ بندہ بہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقر است بہ ذاتِ ہمیں بزرگ است زیرا کہ پیش

[۱] سودا از شیخ چاند صفحہ ۳۳ ۔ [۲] نکات الشعرا صفحہ ۱۴۲ ۔ [۳] چمنستان شعرا صفحہ ۱۰۸ نیز دیکھو تذکرہ میر حسن صفحہ ۲۲ ۔ [۴] آب حیات صفحہ ۱۵۹

ازیں این مجلس بہ خانہ اش مقرر بود۔"[1]

میر صاحب اس کے انعقاد کی تاریخ ہر ماہ کی پندرھویں بتاتے ہیں لیکن 'دستور الفصاحت' میں یکتا نے اس کی تاریخ تئیسویں درج کی ہو :-

"میر درد ۔ ۔ ۔ در بست و سوم ہر ماہ مجلسِ سرود و مشاعرہ در کاشانۂ فیض نشان اش مرتب می گشت و تمامیٔ شعرائے دار الخلافہ و نغمہ سنجان حاضر می آمدند"۔ ۔[2]

تاریخ جو بھی ہو یہ معلوم ہوتا ہو کہ جب خان آرزو کا مراختہ بند ہوا تو میر درد کے ہاں ہونے لگا[3] اور پھر خود میر تقی کے ہاں اس کا انعقاد ہوتا رہا اور اس کی تاریخ وہی پندرھویں رہی ۔

معلوم ہوتا ہو کہ مراختے کی مجالس بہت مقبول ہوئیں ۔ اسی ابتدائی زمانے میں ہمیں دلی کے بہت سے مراختوں کا حال ملتا ہو جو مختلف اہلِ ذوق اپنے گھروں پر منعقد کراتے تھے ۔ مثلاً :-

۱۔ مراختہ میر علی نقی[4]

۲۔ مراختہ بہادر بیگ خاں غالب ۔ ۔ ۔ یک چند مجلسِ مراختہ بہ دولت خانہ خود منعقد می ساخت و بہ ضیافتِ مجلسیاں خاص و شعرای فصاحت بیان بہ انواع اطعمہ و اقسام اشربہ و صد گونہ رقص می پرداخت"[5]

ظاہر ہو کہ اُمرا شعرا اور حاضرینِ خاص کی ضیافت بھی کرتے تھے ۔

۳۔ مراختہ عظیم الدین خاں آشفتہ ۔ ۔[6]

۴۔ مراختہ مرزا اسد بیگ رفیق[7] — مراختہ میر علی نقی ۔ صفحہ ۱۴۸ نکات الشعرا

۵۔ مراختہ مرزا راجا شنکر ناتھ[8]

۶۔ مراختہ محمد تقی ترقی ۔[9] در فیض آباد۔

۷۔ مراختہ مولوی قدرت اللہ قدرت ۔ رام پور میں[10]

۸۔ مراختہ میر سجاد سجاد[11]

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ۱۲۸ ۔ [2] دستور فصاحت صفحہ ۳۸ متن ۔ [3] نیز دیکھو نکات الشعرا صفحہ ۱۵۰، ذکرِ عشاق صفحہ ۱۲۸، ۹۰، صفحہ ۱۳۶، ۱۰۰، صفحہ ۵
[4] نکات الشعرا صفحہ ۱۴۸ ۔ [5] مجموعۂ نغز، جلد ۲ ۔ صفحہ ۲۴ ۔ [6] مجموعہ نغز جلد اول صفحہ ۳۱ ۔ [7] مجموعۂ نغز صفحہ ۲۷۴
[8] مجموعہ صفحہ ۳۶۱ ۔ [9] کریم الدین صفحہ ۳۶۱ ۔ مجموعہ صفحہ ۱۳۸ ۔ [10] مجموعہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۵ ۔ [11] مجموعہ صفحہ ۲۹

۹۔ مراختہ میر محمد تقی مرحوم شرف . . . در ایام نواب معلی القاب امیر الامرا نجیب الدولہ عفی عنہ طرح مراختہ بہ خانۂ خود می انداخت قاسم ہیچ مداں درآں اوان بتدی ایں فن بود بہ مجلس وی حاضر می شد [۱]

۱۰۔ مراختہ غلام ہمدانی مصحفی . . . . در زمانے کہ وارد حضرت دہلی یک چند طرح مراختہ بہ خانہ خود انداختہ با قاسم ہیچ مداں سراپا نقصان کہ اکثر بہ مشاعرہ اش می رفت بسیار بہ اہلیت و آدمیت پیش می آمد [۲] (مراختہ کو مشاعرہ بھی کہنے لگے تھے)

یہ وہ مراختے ہیں جن کا ذکر بڑے بڑے اُستادوں کے بیان میں آتا ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹے اور کئی مراختے ہوتے تھے۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ غم و شادی کی تقریبوں پر لوگ مشاعرے کرواتے تھے۔ چناں چہ مہدی علی خاں عاشق کے بیان میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں :۔

"قریب دوازدہ سال بلاناغہ روزِ جمعہ بہ انعقاد مشاعرہ بہ خانۂ خود پرداخت و بہ ہیچ مانع قوی بل اقوا موقوف نہ ساخت حتا کہ صبح فاتحہ سیوم فرزند ارجمند خود نمودہ و بعد ظہر مجلسِ مراختہ منعقد فرمود . . ." [۳]

معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ گویوں کے غیر معمولی جوش و خروش نے فارسی کے مشاعروں کی مقبولیت پر بہت اثر ڈالا، یہ وہ زمانہ تھا کہ فارسی کے معاملے میں ہندستانیوں اور ایرانیوں کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ ایرانی اہلِ ایران کی زبان کو سند جانتے تھے اور ہندستان کے فارسی شعرا کو حقارت سے دیکھتے تھے، ہندستانی ادبا کا یہ دعوا تھا کہ اہلِ ہندستان نے فارسی کی ایسی خدمت کی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی زمانے میں محمد علی حزیں ہندستان آئے اور انھوں نے اس تنازع کو تقویت دی۔ ان کی حقارت کا اندازہ حزیں کے اس فقرے سے ہوتا ہے جو انھوں نے سودا کے بارے میں کہا کہ "از پوچ گویان ہندی بہ نسبت اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فارسی سے ہندستانی اہلِ ذوق کسی حد تک منحرف ہوگئے۔ اس چیز نے ریختہ گوئی کو تقویت اور مراختوں کو مقبولیت دی چناں چہ مصحفی لکھتے ہیں "بہ مقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود ما مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے ایں کہ رواجِ شعر فارسی در ہندستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بہ پایۂ اعلا فارسی رسیدہ (بلکہ از و بہتر گردیدہ)" [۴] شاید یہ مصحفی کا مبالغہ ہو لیکن اس میں شک

---

[۱] مجموعہ صفحہ ۲۱۰ ۔ [۲] مجموعہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۹ ۔ [۳] مجموعہ صفحہ ۳۶ نیز صفحہ ۲۹ ۔ [۴] تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۲۴۵

نہیں کہ ان مراختوں کی بہ دولت ریختے کو بہت ترقی ہوئی۔

اوپر کی اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مراختوں کی مجالس کو مشاعرہ بھی کہنے لگے تھے اس کی شہادت ایک اور جگہ بھی ملتی ہے۔ "ریاض الفصحا" میں مصحفی جعفر کے بیان میں رقم کرتے ہیں :۔

"پسرِ کلاں ایں بزرگ مجلسِ مشاعرہ ترتیب دادہ نظمِ ریختہ خود را بسمع مبارک ایشاں می رسانید۔۔" [۱]

اب تک ہم نے جن اُردو محفلوں کا ذکر کیا ہے وہ صرف وہ ہیں جنھیں تذکرہ نگاروں نے لفظ 'مراختہ' سے تعبیر کیا ہے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ریختہ یا اُردو کی محفلیں مشاعرہ کہلانے لگی تھیں اور ایسی بزموں کا شمار کرنا نہایت مشکل ہے کیوں کہ وہ کثیر تعداد میں ہیں۔

جن مشاعروں کا ہمیں ذکر ملتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

دلی کے مشاعرے :۔

۱۔ محمد تقی خاں ترقی کا مشاعرہ [۲]

۲۔ مشاعرہ محمد یار خاں امیرِ روہیلہ [۳]

۳۔ مشاعرہ نواب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میڈھو۔ [۴]

۴۔ مشاعرہ حمید الرحمان انیس [۵]

۵۔ مشاعرہ مصحفی [۶]

۶۔ مشاعرہ نواب علی حسین خاں اندوہ [۷]

۷۔ مشاعرہ صدر الدین صدر [۸]

۸۔ مشاعرہ حکیم سید محمد [۹]

۹۔ مشاعرہ حاجی قمر الدین قمر عرف حاجی [۱۰]

۱۰۔ مشاعرہ میر محمدی شرف [۱۱]

۱۱۔ مشاعرہ مہر اللہ غیور [۱۲]

۱۲۔ مشاعرہ تقی ہوس [۱۳]

۱۳۔ مشاعرہ نصیر الدین نصیر

۱۴۔ مشاعرہ فراق [۱۴] ثناء اللہ خاں

۱۵۔ مشاعرہ لطف علی خاں ناطق [۱۵]

۱۶۔ مشاعرہ نجیب الدولہ [۱۶]

۱۷۔ مشاعرہ حافظ حلیم ص۱۷۸۔ نکات الشعرا۔

۱؎ ریاض الفصحا ص۶۹۔ ۲؎ مجموعۂ نغز ص۱۵۵، آبِ حیات ص۳۶۹۔ ۳؎ ص۲۸۷ مجموعۂ نغز۔ ۴؎ مجموعۂ نغز ص۱۸۱، ص۲۵۱۔ آبِ حیات ص۱۹۰۔ ۵؎ مجموعۂ نغز ص۸۷۔ ۶؎ ریاض الفصحا ص۲، ص۲۹۹، ص۲۲۲، ص۳۲۔ تذکرۂ ہندی مصحفی ص۱۶، ص۲۰، ص۲۱۷، ص۲۲۳، ص۹۸۔ خمخانۂ جاوید جلد اول ص۲۶۵۔ ۷؎ ریاض الفصحا ص۱۵۷، ص۱۷۱، ص۱۷۷۔ ۸؎ ریاض الفصحا ص۵۲۔ ۹؎ ریاض الفصحا ص۱۱۵، ص۶۹، ص۱۲۰۔ آبِ حیات ص۳۳۵۔ ۱۰؎ ریاض الفصحا ص۱۴۵۔ ۱۱؎ ریاض الفصحا ص۲۴۰۔ یکتا ص۱۰۸۔ ۱۲؎ ریاض الفصحا ص۲۲۶۔ ۱۳؎ ریاض الفصحا ص۳۳۷۔ ۱۴؎ ریاض الفصحا ص۱۵۷، ص۲۷۔ ۱۵؎ ریاض الفصحا ص۸۳۔ ۱۶؎ یکتا ص۱۰۹۔

۱۸۔ مشاعرہ علیم اللہ بے تاب۔ تذکرہ حسن صفحہ ۶۵ ۱۹۔ مشاعرہ احمد علی، تذکرہ حسن صفحہ ۷۵

۲۰۔ مشاعرہ میر حسن صفحہ ۱۶۱ و صفحہ ۲۰۲

دلّی اور دیگر مقامات کے یہ مشاعرے ناپایدار ہوتے تھے اور سال دو سال سے زیادہ جاری نہیں رہتے تھے مصحفی لکھتے ہیں :۔ " اکثر بہ تجربہ درآمدہ کہ ایں مجلس از یک سال طول نمی کشد و تفرقہ و خللے برد بالضرور واقع می شود" ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔ " تفرقہ انداز خواہندۂ ایں چنیں مجالس از قدیم نیست" ریاض الفصحا

ظاہر ہی کہ ان کی ناپایداری کی وجہ شعرا کے باہمی تفرقے ہوتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اکثر شاعر ایک دوسرے پر سر مشاعرہ اعتراض کرتے تھے جس کا انجام عموماً جھگڑے ہوتے تھے اور ہجو گوئی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ " سوداؔ نے فدوی نام ایک شاعر کی جو نسل کا بقال تھا اور اس سے فنی رقابت رکھتا تھا، کئی ہجویں لکھی ہیں۔ یہ شخص برخود غلط اور عامیانہ وضع کا تھا مشاعروں میں اکثر کھڑے کھڑے غزل پڑھتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ ٹانڈے سے فرخ آباد سوداؔ سے مقابلے اور مجادلے کے لیے آیا لیکن سوداؔ اور اس کے شاگردوں نے اس کی ایسی ہجویں لکھیں کہ ذلت اٹھاکر بھاگ نکلا۔"[۱]

اسی طرح نعیم اللہ نعیمؔ دہلوی اور محمد حاتم کے درمیان طنز و ایما کی گفتگوئیں مشاعروں میں اکثر آئی ہیں اور مکرر غزلیں آپس میں لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی اور مطلع میں محمد نعیم پر طعن کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہی بدتر اسے خزاں سے بہارِ نعیم ہی

جب دورہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انھوں نے بھی مطلع غزل کا یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہی لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہی[۲]

احمد علی یکتاؔ نے بھی دو مشاعروں کا ذکر کیا ہی جن میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچی تھی۔ ان میں ایک مشاعرہ مہر اللہ غیور کا ہی اور دوسرا نجیب اللہ کا۔ اس کا حال انھی کے لفظوں میں دیکھیے۔ خوش فکر خاں نواؔ کے متعلق لکھتے ہیں :۔ " یک مرتبہ در مشاعرہ مولوی نجیب اللہ و یک بار در مشاعرہ سید مہر اللہ غیور کہ مقابلۂ او

[۱] سودا از چاند صفحہ ۲۵۹ [۲] گل زار ابراہیم صفحہ ۲۴۳

ظاہرا با تجمل مرثیہ گو و مرزا علی لطف و مرزا مغل سبقت و بہ باطن با جرأت شدہ بود، بر ہمہ ہا غالب آمدہ شکست فاش دادہ و ہجو ہاے رکیک برروے ہر یک در مجمع کثیر خواندہ، حتی ہمہ بزرگواں دشمن او شدہ خواستند کہ او را بہ جاں بہ کشند۔ مشارالیہ نیز ازیں معنی خبر یافتہ، باوجود تنہائی مطلق پروا نہ می کرد و مستعد جنگ بہ زبان سنان و تیغ زبان ہردو بود۔ بالآخر محمد عاشق تصوّر واسطہ گردیدہ، با مرزا مغل سبقت و او سبب ملاقات شد، و بہ ظاہر نزاع موقوف ماند۔"[1]

"دلّی میں میر تقی نے ایک مثنوی کہی اپنے تئیں اژدہا قرار دیا اور شعراے عصر میں سے کسی کو چوہا کسی کو سانپ کسی کو بچھو کسی کو کن کھجورا وغیرہ وغیرہ بنایا ساتھ اس کے ایک حکایت لکھی کہ دامن کوہ میں ایک خوں خوار اژدہا رہتا تھا جنگل کے حشرات الارض جمع ہوکر اس سے لڑنے گئے جب سامنا ہوا تو اژدہے نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہوگئے۔اس قصیدے کا نام اجگر نامہ قرار دیا اور مشاعرے میں لاکر پڑھا محمد امان نثار شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشاق موزوں طبع تھے انھوں نے وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا اور اسی وقت سرِ مشاعرہ پڑھا چوں کہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آئی تھی اس لیے اس قطعے پر خوب قہقہے اُڑے اور بڑی واہ وا۔ ہوئی اور میر صاحب پر جو گزرنی تھی سو گزری، چناں چہ مقطع مذکور کا یہ ہے ؎

حیدرِ کرّار نے وہ زور بخشا ہے نثار　　ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر"[2]

دلّی کے ان معرکوں میں سب سے بڑھ کر خطرناک وہ معرکہ تھا جو سیّد انشا اور مرزا عظیم بیگ کے درمیان ہوا۔ یہ "شعری رزم جس میں انشا کی طرف سے بعض ناجائز امور کی حد تک اقدام ہوا ہے مرزا میڈھو کے مشاعرے میں قطعات و غزلیات فخریہ سے گزر کر باقاعدہ میدانِ جنگ کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔جب حکیم قدرت اللہ قاسم کے سامنے شمع لائی گئی انھوں نے انشا سے خطاب کرکے کہا "عم زاد آپ کی سرکار سے ہمیں مسیلمۂ کذاب کا خطاب عنایت ہوا ہے،بہت اچھا اب زرا ہمارے الفیل مالفیل پر بھی کان دھریے۔صاحبِ مشاعرہ کو گمان گزرا کہ اب کوئی رکیک ہجو پڑھی جانے والی ہے

---

[1] یکتا، ص۱۰۹ متن　　[2] آبِ حیات ص۲۱۷

ادھر سے یہ اور اُدھر سے محب علی محبؔ اُٹھے اور کوشش کرکے فریقین میں صلح کرادی۔دونوں طرف شرفا تھے، مان گئے، معاملہ بہ خیر و خوبی گزر گیا اور کشت و خون تک نوبت نہیں آنے پائی"[1] مرزا عظیم نے اسی وقت فی البدیہہ کہا ؎

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہر ایک سے ہے بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار کرنا
کئی سکھن باز کھنڈ گویوں میں ہو نہ ہو اعتبار اپنا
جنھوں کی نظروں میں ہم سُبک تھے دیا انھی کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے سے بار اپنا

جب یہ واقعہ خود بادشاہ جم جاہ تک پہنچا تو شیخ ولی اللہ محبؔ نے خوب موقع پر کہا :- ؎

مجلس میں چکے چاہیے جھگڑا شعرا کا
اس فن کے کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا
اکبر شہ یا شاہِ جہاں گیر کے آگے

اس شاعرانہ پرخاش کی یادگار سید انشا اور پھر اس کے جواب میں میرزا عظیم بیگ کا مخمس ہے۔

یہ پورا واقعہ بہت طویل ہے اس لیے یہاں بیان نہیں کیا۔

اس طرح کے اور بہت سے واقعات مشاعروں کے سلسلے میں آئیں گے جن کا ذکر ان کے موقع پر کیا جائے گا۔

مشاعروں کی کثرت نے شعرا کے دماغ بہت چڑھا دیے تھے اور اُمرا اور رؤسا کو ان کی بہت نازبرداریاں کرنا پڑتی تھیں۔اس کی ایک مثال حسب ذیل ہے :-

"نواب امین الدولہ مرزا مینڈھو بہ آں شوکت و مکنت بہ ہرکس چہ ددد خورد بزرگانہ می فرمودند در ایام عقد مجلسِ مشاعرہ بہ دولت خانہ ایشاں مرزا عظیم بیگ مرحوم عظیم کہ مردے بود آزاد وضع بے باک از رفتن مشاعرہ ابا آوردہ گفت "من وارستہ راچہ ضرور کہ تعظیم عظیم امیرے بجا آوردہ زیرِ مسند نشینم و مثل ما بے سروپا راچہ احتیاج کہ بے ہیچ تکریم فخیم ایں وزیرے سرانجام دادہ پائیں نشینی گزینیم گاہے کہ ایں سخن بہ آں نیکو کردار والا تبار رسید گستردن مسند موقوف نمودہ فرمود کہ تشریف شریف ارزانی دارند کہ من ہم باشما بر فرشِ چاندنی خواہم نشست قاسم ہیچ مداں سراپا نقصان درحین حضور ایں محفل سرور مرزا

[1] مقدمہ مجموعہ نغز لب، تفصیل کے لئے دیکھو مجموعہ جز اول صہ ۸۲ تا صہ ۸۶ نیز صہ ۲۶۲ و صہ ۲۶۳ بہ بعد آب حیات

مذکور را ہرچہ تمام تر پیش کشید تا مشارالیہ شرطِ خدمت بجا آوردہ خود چار بالش شوکت پیش کشید بہ مبالغۂ بسیار و قال و مقال بے شمار ہماں روز بر مسند اجلاس فرمود از اں پس بالمرہ در مجلسِ مشاعرہ بہ مسندِ جلوس نہ فرمودند میر انشاء اللہ خاں انشا و برکت اللہ خاں برکت و مشتاق علی خاں مشتاق بہ شاعرِ طبع قدیم مرزا عظیم بیگ عظیم و دوست دار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق و ایں خوشہ چین اربابِ سخن یعنی قاسم بے سرو بن بہ مقتضائے بشریت بہ خلاف عنوان بزرگی بزرگان بے ہیچ خوش نہ بودند و مانندِ میوہ بیش رس پیش رسیدہ مانند گل سر رسید در آں بزمِ رنگیں بہ صدرِ مجلس می نشستند ما ہا جائے کہ می یافتیم می نشستیم و ہر جا کہ نشستیم ہر چہ بودیم بودیم..... [1]

مجالسِ مشاعرہ میں اب تک کئی پابندیاں آگئی تھیں اور دستور مرتب ہو رہے تھے۔ مثلاً شمع کا گھومنا،[2] داد دینا وغیرہ۔ کسی اُستاد کا میرِ مشاعرہ ہونا، میرِ مشاعرہ عموماً کہنہ مشق کو بنایا جاتا تھا، ریاض الفصحا میں صدرالدّین صدر کے مشاعرے کے حال میں مصحفی لکھتے ہیں :۔" فقیر را میر آں مجلس بہ سبب زیادتیٔ عمر قرارداد [3]

مشاعروں میں اعتراضات اس کثرت سے ہوتے تھے کہ کوئی مبتدی شعر سُنانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا جب تک اس کا اُستاد کوئی مسلم الثبوت شخص نہ ہوتا تھا۔ شاگرد پر اعتراض ہوتا تو عموماً اُستاد اس کا جواب دیتا۔ قدرت اللہ قاسم محمد بخش شوق کے بارے میں لکھتے ہیں :۔" درایامِ انعقادِ مجلسِ مشاعرہ در دولت خانۂ ایشاں (میرزا مینڈھو) بنابر اصلاح برکت اللہ خاں برکت بہ گفتن غزل طرحی ہمت می گماشت "[4] ان اعتراضوں کا حال ہم آگے چل کر بتائیں گے۔

نکات الشعرا:۔ اکثر بر شعر ما مردماں اعتراضات بے جا می کرد و جواب با صواب می یافت۔

شعرا اپنے شاگردوں کی ڈولیاں لے کر مجلسِ مشاعرہ میں پہنچتے تھے۔

مصحفی لکھتے ہیں :۔ فقیر در ہر چار مشاعرہ اش (صدرالدّین صدر) مع شاگرداں حاضر بود [5]

مصحفی نے اپنے شاگردوں کی اصلاح اور مشق کے لیے ایک علاحدہ مشاعرہ نئی طرز کا قائم کیا تھا جس کا حال وہ شفق کے حال کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں :۔" پیش از چند سال فقیر در روز ہائے کہ

---

[1] مجموعہ نغز صلا ، [2] مقدمہ مجموعہ لب ، [3] ریاض الفصحا ص۱۷۷ ، [4] مجموعہ نغز ص۳۵۲ ، [5] ریاض الفصحا ص۱۷۷

بنائے مشاعرہ بہ تجدید بر روش انداختم بہ حلقۂ شاگردیٔ من درآمدہ و چند غزل را بہ اصلاح رسانیدہ،،[۵۱] اسی کا مکمل حال لکھا ہو لیکن اسے چھوڑ دیتا ہوں:۔" روزی شیخ محمد عیسیٰ تنہا تخلص آمدہ عرض کرد کہ ای قبلہ اگر برائے مشق مامردم صحبت جلسہ انعقاد دادہ شود اغلب کہ در رائے شریف ہم اولاد النسب باشد التماس ایشاں را پذیرہ کردہ در ویرانۂ بیرونِ شہر کہ روشن آرا می گویند بہ ایں روش دلے خالی می کردیم و شریکِ جلسہ غیر شاگردان دیگرے کم شد چوں مرا در آں روز تعطیل محض بود ایں شغل را بہ پاسِ خاطرِ دوستاں درپیش گرفتم و میاں نورالاسلام منتظر تخلص کہ خدا ایشاں را بیامرزاد و میرزا حیدرعلی گرم تخلص کہ از مدتے بہ طرفِ حیدرآباد دکن در رفتہ واں جا نام و نشانے پیدا کردہ شمع جلسہ بودند دو سہ سال رونقِ جلسہ روز بہ روز ترقی داشت و دریں اثنا میاں نورالاسلام بہ سبب بیماریٔ سِل سفر ناگزیر درپیش آمد، شکستِ عظیم بر دلِ من افتاد و صحبت، جلسۂ معیّنہ بگسیخت.... [۵۲]

یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان مجالسِ عزا اور مسالموں کا بھی ذکر کروں جن میں غزلوں اور مثنویوں کی بجائے مرثیے اور سلام پڑھے جاتے تھے۔ یہ مجالس ریختہ گوی کی مجلسوں سے بالکل مختلف تھیں لیکن فی الحقیقت انھیں مشاعروں ہی کی ایک شاخ کہنا چاہیے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مرثیوں کی زبان اور محاوروں پر اعتراض یا تنقید نہیں کی جاتی تھی۔ سودا اور پھر میر و مصحفی کے زمانے میں مجالسِ عزا کثرت سے ہوتی تھیں لیکن اسی تنقید کے نہ ہونے کی وجہ سے مرثیوں کی حالت ابتر تھی۔ شیخ چاند لکھتے ہیں:

"مرثیہ گوئی کی حالت بُری تھی پہلے تو اکثر مرثیہ گو بلند پایہ شاعر نہ تھے دوسرے ان کا مطمح نظر سامعین وغیرہ سے صلہ حاصل کرنا بھی تھا.... سودا نے بھی ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہو ؎

یہ روسیاہ تو ایسا نہیں جیسے ہووے تلاشِ مرثیہ گوئی سے دام و درہم کا

سامعین کے پاسِ ادب و عقیدت سے فائدہ اُٹھاکر مرثیہ گو جری ہوجاتے تھے اور بے جھجک فنی غلطیاں کرتے تھے۔ یہی وجوہ ہیں کہ بعض معقول اور رُتبےدار شاعروں نے مرثیہ گوئی ترک کردی تھی (جیسا کہ اوپر ندیم کے متعلق قائم نے لکھا ہو) یہی شکایت سودا کو بھی تھی اس نے لکھا ہو:۔

لازم ہو کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہو کہ

[۵۱] ریاض الفصحا ص۱۵۲ [۵۲] ریاض الفصحا ص۲

عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبطِ تفضیک و قصدِ بکا میں رہیں اس کا سیاق و سباق جہلا دریافت کریں اور پھوٹ بہیں۔"

قائم اور سودا کے بیانات سے ظاہر ہے کہ مرثیہ گوئی کی حالت ابتر تھی اور نا اہل شاعری کی جولاں گاہ بنی ہوئی تھی عیوب پر مذہبی احترام اور عقیدت کا پردہ ڈالتے تھے۔ مرثیہ گو بے تکان طبع آزمائی کرتے تھے اور صلہ پاتے تھے اکثر شاعروں نے مرثیہ گوئی کو معاش کا ذریعہ بنا لیا تھا اس میں تنقید و تنقیص کی زد سے بھی بچاؤ ہو جاتا تھا۔ چناں چہ سودا جیسا بے باک ہجوگو بھی اعتراض کرنے سے ہچکچاتا تھا اس نے آخر صاف کہہ ہی دیا ؎

عرض رکھتا ہوں ای کرم گستر　　　　اعتراضی سے پر مجھے ہے ڈر
کھول سکتا نہیں مَیں اپنے لب　　　　اس سبب سے کہ ہے یہ جاے ادب

لیکن زمانے کے اربابِ فن اور اساتذۂ تنقید نے اسی خرابی کو محسوس کیا اور یہ حکم لگا دیا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" یہ کلیہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں اس زمانے کی مرثیہ گوئی کی ابتری و خرابی کی داستان مضمر ہے۔ سودا نے بھی اس عام ابتری کو بہ شدت محسوس کیا اور خوف و خطر کے باوجود اس زمانے کے مشہور مرثیہ گو تقی کے سلام اور مرثیے پر منظوم اعتراضات کیے جو ایک رسالے "سبیلِ ہدایت" کی شکل میں اسی زمانے میں مرتب ہو چکے تھے . . . . سودا نے تعجب سے لکھا ہے کہ جتا اور بدھو جیسے عوام جن مرثیوں کو سن کر پھوٹ بہیں ان کے معانی و مطالب اہلِ علم و فن کی فہم سے باہر ہوں ؎

آپ کے مرثیے کا ہوں قائل　　　　خون جس سے عوام کا ہے دل
سُن کے جتا سے جس پہ بدھو تک　　　　شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس　　　　یہی آتا ہے بار بار افسوس
بدھو جتا سمجھ جسے رو دیں　　　　معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں
جب یہ صورت خیال کرتا ہوں　　　　اسی غیرت کے مارے مرتا ہوں . . .[1]

مولانا آزاد بھی اس راے سے اتفاق رکھتے ہیں :-

" اس زمانے کے انھی مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور

---

[1] سودا از شیخ چاند ص۲۵۳ بہ بعد

بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ حق یہ ہے کہ مرثیے کا شاعر گویا ایک مصیبت زدہ ہوتا ہے کہ اپنا دکھڑا روتا ہے۔ جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو غم و اندوہ کے عالم میں جو بےچارے کی زبان سے نکلتا ہے سو کہتا ہے اس پر کون بے درد ہے جو اعتراض کرے۔ وہاں صحت و غلطی اور صنائع بدائع کو کیا ڈھونڈنا لوگ فقط اعتقادِ مذہبی کو مدِ نظر رکھ کر مرثیے سلام کہتے تھے اس لیے قواعد شعری کی احتیاط کم کرتے تھے اور کوئی اس پر گرفت بھی نہ کرتا تھا۔[۱]

اب تک دلّی کے علاوہ اور بہت مقامات پر مشاعروں کا رواج ہو چکا تھا۔ ان کے مشہور مرکز فیض آباد[۲]، بریلی[۳] اور لکھنؤ تھے۔ ان میں لکھنؤ سب سے بڑا مرکز تھا۔ احمد نگر، فرخ آباد، رام پور، عظیم آباد، مرشد آباد، حیدر آباد۔ (دیکھو مقدمہ مجموعۂ نغز) الہ آباد۔ آب حیات ص۳۶۶

۱۱۹۸ھ میں میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ ولی عہد شاہ عالم لکھنؤ پہنچے اور انھوں نے وہاں جاکر مشاعرہ شروع کیا۔ صاحب گُل زارِ ابراہیم بھی ان مشاعروں میں حاضر ہوا ہے اور ان کا حال یوں بیان کرتا ہے:- "غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعرا کی طرف اس قدر آئی تھی کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانے میں ٹھیرائی تھی۔ شعراے باوقار کو چوب دار بھیج بھیج کر مشاعرے کے دن بُلواتے۔ چناں چہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا تو اس ہیچ مداں نے یہ عذر کہ بھجوایا کہ کم ترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے ازبس کہ ان صحبتوں میں مناظرے ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے۔ .. پذیرا نہ ہوا پھر چوب دار آیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں بہت ضرور ہے مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں دستور نہیں۔ غرض ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرفِ سعادت ملازمت کا حاصل کیا مکرر غزلیں اس دن تفضلات کے پڑھوائیں اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنایتیں فرمائیں۔ پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔"[۴]

دلّی تباہ ہو چکی تھی اور نواب آصف الدولہ کی سخاوتیں اہلِ کمال کو لکھنؤ کھینچ رہی تھیں۔ لکھنؤ میں بھی جگہ جگہ مستقل مشاعرے قائم تھے، چند ان میں سے حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مرزا سلیمان شکوہ کا مشاعرہ[۵] جس میں جرأت، مصحفی، انشا، رنگین اور دوسرے اساتذہ شریک

---

[۱] آب حیات ص۱۵۶ [۲] مجموعہ نغز ص۱۵۵، آب حیات ص۳۶۹، سودا از شیخ چاند ص۳۸۵ [۳] ریاض الفصحا ص۳۲۷ [۴] گل زارِ ابراہیم ص۸۹
[۵] مجموعۂ نغز ص۳۱۰، ص۱۸ بعد۔ تذکرہ ہندی ص۱۱۲، ص۱۳۱۔ یکتا ص۹۹۔

ہوتے تھے۔

۲۔ مشاعرہ مرزا رضا علی بیگ آشفتہ[1]

۳۔ مشاعرہ مرزا حیدر علی[2]

۴۔ مشاعرہ حسین علی خاں اثر[3]

۵۔ مشاعرہ لالہ موتی لال (کشمیری پنڈت)[4]

۶۔ مشاعرہ قمر اللہ قمر[5]

۷۔ مشاعرہ مرزا جعفر[6]

۸۔ مشاعرہ نواب آغا میر[7]

۹۔ مشاعرہ نواب سید محمد خاں رند[8]

۱۰۔ مشاعرہ مرزا شناور

بعد کے زمانے میں لکھنؤ کیننگ کالج کا مشاعرہ بھی دلی کالج اور غازی الدین خاں کے مدرسے کے مشاعروں کی طرح مقبول ہوا۔

مشاعروں کی دیکھا دیکھی لکھنؤ میں شیخ مغل فانی ایک صاحب نے ایک مجلسِ مناثرہ کی بنا ڈالی مصحفی نے اس کا حال لکھا ہے:-

"شیخ مغل فانی تخلص بانیٔ مجلسِ مناثرہ دریں شہر اوشدہ اوّل جماعتے از ہنوداں وغیرہ بہ تقریبِ نثر نویسی چہ در زباں اُردوے ریختہ و چہ در زبانِ فارسی در آں مجلس حاضر می شدند چوں حسب اتفاق روزی گزرِ فقیر دراں مقام افتاد برائے شریک شدن نیشانِ انشا پردازان روزہا نثرے کہ در وصف دکان تنبولی و تتبع ظہوری برمشتری گفتہ بودم بہ معرض بیان آوردم چوں چوں خار خار مشاعرہ از قدیم درویش جا داشت پیشِ فقیر ہم گاہ گاہ رفت و آمدی می کرد القصہ رفتہ رفتہ مجلسِ مناثرہ اش بہ مشاعرہ تبدیل یافت و ورقِ مرقعِ تصویرِ نثر نویساں را برطاق گزاشتہ زمانہ بازیٔ گنجیفہ دیگر درپیش آورد یعنی از رفتنِ عاصی در آں مجلس بہ کثرت مجمع کثیر شاگرداں شود۔ غزل خوانی از سامع سبحان ملا اعلا درگزاشت و دراں وقت منشیانِ سحر بیان زبانِ سکوت بہ کام کشیدہ جز سماعتِ اشعار کارے دراں انجمن نہ داشتند۔ ہرگاہ دریں نزدیکی روزگارِ شیخ موصوف بہ سرکارِ نواب کلب علی خاں بہادر رونقِ شرف گرفت آں رقعہ شوریدہ مضمون زبانِ اُردو خواندہ شد واجب رفتنِ مشاعرہ برمن فرض گردید برائے آں کہ فقیر ہم سرکارِ ایشاں بہ صیغۂ شاعری پیشتر از مغل عز امتیاز داشت چند سال گزشتہ باشد کہ حالا باوصف نہ رفتن فقیر بہ سبب روزگارِ نوابِ فلک جناب مہدی علی خاں بہادر شاگردانِ من آں مجلس بہ دستور قائم می دارند ۔ ۔ ۔ ۔"[9]

۱۔ خم خانہ جلد اوّل ص ۶۹۔ ۲۔ مجموعۂ نغز ص ۳۱۲۔ ۳۔ ریاض الفصحا ص ۳۔ ۴۔ ریاض الفصحا ص ۳۳۔ ۵۔ ریاض الفصحا ص ۳۲۲۔ خم خانہ ص ۶۹
۵۔ یکتا ص ۲۵ دیباچہ۔ ۶۔ یکتا ص ۲۵ دیباچہ۔ ۷۔ آبِ حیات ص ۳۶۴ و خم خانہ جلد اوّل ص ۹۔ ۸۔ آبِ حیات ص ۳۶۴ بعد۔ ۹۔ ریاض الفصحا ص ۳۵۰

یوں تو لکھنؤ میں مشاعرے سوداؔ کے وہاں پہنچتے ہی شروع ہو چکے تھے۔ سوداؔ جب فیض آباد سے لکھنؤ پہنچا تو محفلِ شعرا کو ہمراہ لایا اور وہی ان مشاعروں کا روح درواں تھا، لیکن مشاعرے اپنے اوجِ کمال پر نواب آصف الدولہ کے آخری ایام میں پہنچے۔ دلّی کے مشاعروں کی طرح لکھنؤ میں بھی مشاعروں کی بنا پر باہمی عناد اور تفرقے پیدا ہوے اور عناد اور عداوت نے بہت طول کھینچا۔ خود سوداؔ اور مرزا فاخر مکین کے مابین ایک طویل مجادلہ رہا لیکن اس سے زیادہ بڑھ کر انشاؔ اور مصحفیؔ کا واقعہ ہے۔ جس کی تفصیل 'آبِ حیات' میں ہے اس لیے اس کے سُنانے کی مَیں ضرورت نہیں سمجھتا۔

اس طویل قصّے میں جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شاعروں نے ایک دوسرے پر کس قسم کے اعتراضات کیے۔ مَیں یہ کہوں گا کہ جس طرح کا کلام ہے اسی طرح کے فضول اعتراض ہیں۔ دونوں میں ذاتیات پر حملہ کرنے کا عنصر غالب ہے اور کلام کی تصحیح یا اصلاح کا کم۔ دونوں پایۂ ثقاہت سے گرے ہوے ہیں ان کی تنقید ہزلیات اور تضحیک پر مبنی ہے۔

ایک اور بات جو یہاں قابلِ توجہ ہے وہ شاعری پر ان مشاعروں کا اثر ہے۔ اور یہ اثر بالخصوص اہلِ لکھنؤ پر ہوا۔ طرح دے کر غزلیں لکھوانا بے شک شاعری کو ترقی دیتا تھا اور شعرا میں منافست پیدا کر کے اُنھیں آگے بڑھنے پر آمادہ کرتا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا مقصد محض قافیہ پیمائی رہ گیا۔ سنگلاخ زمینوں میں اشعار کا نبھانا شاعری کی عمدگی کا معیار ہوا۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کے اسی واقعے میں ردیف گردن والی غزل طرحی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز طرفہ زمین ہے۔ اچھے اچھے اساتذہ جب مشاعرے کے لیے طرحیں تجویز کرتے تھے تو چُن چُن کر عجیب وغریب زمینیں نکالتے تھے۔ اس قسم کی نئی نئی زمینوں میں شعرا جب غزلیں لکھنے بیٹھتے تھے تو دُور دُور سے قافیے کھینچ کر لاتے تھے اکثر لغت میں سے کُل قافیے چھانٹ کر قصیدہ یا غزل میں بنھانے بیٹھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان بے محل قافیوں اور ردیفوں کے لیے دور از کار اور نئے نئے استعارے اور تشبیہیں لانی پڑتی تھیں، اس سے زبان کو تو خوب فروغ ہوتا تھا کیوں کہ مشکل سے مشکل خیال کو ادا کرنے کے طریقے ڈھونڈے جاتے تھے لیکن شاعری کا مطلب خبط ہوتا تھا اور لوگ نفسِ مضمون کی بجائے ترکیبوں اور صنعتوں کی ندرت پہ جان دیتے تھے۔ اس قسم کی زمینوں کا مفصّل حال ہم شاہ نصیر

کے بیان میں لکھیں گے۔ یوں تو دلّی کے شعرا بھی مشاعروں کے اس اثر سے متاثر ہوئے جیسا کہ ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کے دیوانوں سے ظاہر ہی لیکن لکھنؤ والوں پر اس کا جو شدید اثر ہوا وہ دلّی والوں پر نہیں ہوا۔

لکھنؤ میں میر انشا اور مصحفی کے معرکوں کے بعد خواجہ آتشؔ اور ناسخؔ کا مجادلہ بھی قابلِ ذکر ہی۔ معتمد الدولہ نواب آغا میر صاحب کے ہاں مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ یہ وہی مشاعرہ ہی جہاں نواب نے شیخ کو خلعت دینے کا ارادہ کیا تھا اور خواجہ آتشؔ قرابین لے آئے تھے۔ اس میں شیخ امام بخش نے پہلے غزل پڑھی ؎

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہی تماشا ہی تہ آتش دھنواں ہی

آتش کے لفظ پر خواجہ صاحب آگ بگولا ہوئے جب ان کی باری پڑھنے کی آئی تو انھوں نے مطلع پڑھا

؎ یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہی زمیں جس کی چہارم آسماں ہی

اتفاق سے جس منزل پر مشاعرہ ہو رہا تھا وہ بھی چوتھی تھی نواب نے خوش ہوکر خواجہ صاحب کو بھی خلعت دی [1]

شاہ نصیر ان دِنوں حیدرآباد میں تھے۔ وہاں دیوان چندو لال [2] کے ذوق نے بہت سے شعرا کو گرد جمع کیا تھا اور مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں خواجہ آتشؔ اور ناسخؔ کی دھوم تھی کہ شاہ نصیر لوٹے۔ آزادؔ 'آب حیات' میں لکھتے ہیں :۔ ''جس دن وہاں پہنچا مشاعرے میں شاید دو تین دن باقی تھے ہر اُستاد نے ایک ایک دو دو مصرع طرح کے بھیجے۔ ادھر انھیں دردِ گردہ عارض ہوا مگر وہ درد کے ٹھیرتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آٹھ غزلیں تیار کر کے مشاعرے میں پہنچے پھر اور مشکل مشکل طرحیں مشاعرے کے شاعروں نے بھیجیں۔ یہاں بھی ہمیں وہ بات نظر آتی ہی کہ دو غزلے سہ غزلے لکھنا موردِ تحسین ہوتا تھا۔ اور یہ بھی بے تکلف غزلیں لے کر پہنچے مگر وہاں کے صاحبِ کمال خود نہ آئے۔ جب دو تین جلسے اور گزرے تو ایک شخص نے سرِ مشاعرہ مصرع طرح دیا وہ مصرع شیخ صاحب کا تھا اس وقت شاہ صاحب سے ضبط نہ ہوسکا مصرع تو لے لیا مگر اتنا کہا کہ چکس میں گل دم اُڑانے کی صحیح نہیں پالی میں آئیے کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آئے افسوس ہی کہ اس موقع پر بعض جہلا نے جن سے کوئی زمانہ

---

[1] خم خانہ جلد اوّل ص۹

[2] آب حیات ص۳۰۰

اور جگہ خالی نہیں اپنی یاوہ گوئی سے اہلِ لکھنؤ کی عالی ہمّتی اور مہماں نوازی کو داغ لگایا چناں چہ ایک معرکے کے مشاعرے میں شاہ صاحب نے آٹھ غزلیں فرمایش کی کہ کر پڑھیں تھیں ایک غزل اپنی طرح کی ہوئی بھی پڑھی جس کی ردیف و قافیہ عسل کی مکھی اور محل کی مکھی تھا اس پر بعض اشخاص نے طنز کی۔ کسی شعر پر کہا کہ سبحان اللہ کیا خوب مکھی بیٹھی ہے کسی نے کہا حضور یہ مکھی تو نہ بیٹھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے اسی وقت کہا کہ جنھیں چاشنیٔ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف اٹھاتے ہی ہیں ہاں جنھیں صفرائے حسد کا زور ہے ان کا جی متلائے گا ہی[1]

ان مشاعروں میں جو اعتراضات ہوتے تھے وہ اہم ہیں لیکن میں نے سب "آبِ حیات" سے اخذ کیے ہیں اس لیے سُنانے کی ضرورت نہیں۔

مشاعروں میں جس قدر مورچہ بندیاں ہوئیں ان میں آخری پُر لطف شاہ نصیر اور ذوق کی ہے۔ ذوق کو اوائلِ عمر میں بہادر شاہ ظفر کی اُستادی نصیب ہوئی تھی وہ اپنے اُستاد سے خاص حالات میں منحرف ہوئے۔ "جب شاہ نصیر دکن سے لوٹے تو ذوق مشاق ہو چکے تھے، شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی آتش و آب و خاک و باد وہ غزل مشاعرے میں سُنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اسے میں اُستاد مانتا ہوں دوسرے مشاعرے میں انھوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر کچھ اعتراض ہوئے جشن قریب تھا شیخ علیہ الرحمۃ نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ اسی طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقے کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود بہ گفتۂ من حرفِ اعتراض چناں کسے بہ دیدۂ بینا فرو برد انگشت

---

[1] - آبِ حیات ص۲۸۸

شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرے میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور رُو برُو برسرِ معرکہ فیصلہ ہو جائے چناں چہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتبِ تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں جلسے میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لیے قابلِ خطاب ہوں۔ انھوں نے کہا مجھے کچھ تعلق نہیں انھوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا کہ خیر تحریر تو اسی وقت تک ہے کہ فاصلہ دوری درمیان ہو جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے قصیدے کا مطلع تھا ؎

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد　　　آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

مشاعروں میں اعتراض

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت ہونا چاہیے انھوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہو تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مشاہدہ! اس نے کہا کتابی سند دو انھوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرینِ مشاعرہ اس سوال و جواب کے اُلٹ پھیر کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا ؎

پیش از ظہورِ جلوۂ جانانہ سوختیم　　　آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

سُنتے ہی مشاعرے میں غُل سے ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سوداؔ کا یہ مصرع گزرانا ؏

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا [1]

مشاعروں میں اعتراضات اور ان کے جواب

اُردو مشاعروں میں اعتراضات کا سلسلہ بہت ابتدائی زمانے سے ہے یہ اعتراضات عموماً بے معنی ہوتے تھے تاہم مشاعروں کا یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا تھا اور شاعری پر اور بالخصوص اُردو زبان پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

مصحفی تذکرۂ ہندی میں بال مکند حضور کے بیان میں لکھتے ہیں کہ لطف علی خاں ناطق کے ہاں دہلی

---

[1] آبِ حیات ص۴۵۳

میں مشاعرہ ہوتا تھا :- "غزل طرحیٔ میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف " اور" بہ معنی تقرّر داشت و ازیں جہت بعضی از فصحا اور را خلاف اردو شمردہ پیرویش نہ کردند و اکثرے از اطاعت استادیش کردہ اشہب فکر را در میدان خیال دوانیدہ مشارٌ الیہ کارے کردہ کہ پیش ہر دو گروہ خفت منفلش عاید حال نگشتہ یعنی در آں غزلی طرحی شعرے طرفہ خواندہ و آں ایں ست ؎

رکھتا ہوں میر صاحب و قبلہ سے میں سند یہ جانتا نہیں کہ زباں ہو کہاں کی "اور"[۵۱]

خواجہ آتش پر اعتراضات :-[۵۲] ؎

دخترِ رز مری مونس ہو مری ہم دم ہو میں جہاں گیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہو

اعتراض :- بیگم ترکی لفظ ہو اہلِ زبان گ پر پیش بولتے ہیں اور زبانِ فارسی کا قاعدہ بھی یہی ہو - یہ اس وقت بھنگیائے ہوے بیٹھے تھے کہا کہ ہوں ہم ترکی نہیں بولتے - ترکی بولیں گے تو بگم کہیں گے.

ایضاً :-۶ اس خوان کی نمش کفِ مارِ سیاہ ہو

لوگوں نے کہا یہ لفظ فارسی اور اصل میں نمشک ہو - انھوں نے کہا کہ جب ہم فارس جائیں گے تو ہم بھی نمشک کہیں گے یہاں سب نمش کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھا چاہیے -

شیخ ناسخ پر اعتراض :-[۵۳] ؎

کیا ہی حاسد ہو فلک جس نے کہ نوبت پائی دم میں مانندِ حباب اس نے نقارہ توڑا

اعتراض :- نقّارہ مشدّد ہو تخفیف کے ساتھ نہیں آیا - جواب : نظّارہ بھی بہ تشدید ہو لیکن فارسی اور ریختے میں آیا ہو -

اعتراض :- غیر زبان کے لفظ میں قیاس نہیں چل سکتا اہلِ زبان کی سند دینی چاہیے - جواب :- (نظامی) ؎

بہ ذوقِ جشنِ نوروزی نقارہ گلوے خویش کردہ پارہ پارہ

شاہ نصیر پر اعتراض :-[۵۴] تظلّم کو بجائے ظلم باندھا ہو - جواب میں یہ سند پیش کی :- محتشم کاشی ؎

آلِ نبی چو دستِ تظلّم بر آورند ارکانِ عرش را بہ تزلزل در آورند

---

[۵۱] ریاض الفصحا صـ۸۳ - [۵۲] آب حیات صـ۳۹۳ - [۵۳] آب حیات صـ۳۵۹ - [۵۴] آب حیات صـ۴۰۵

اردو اساتذہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سند پر اس قدر توکل کرتے تھے کہ اگر استاد نے کچھ غلط بھی کہا ہو تو اس کو صحیح مان لیتے تھے اور اس کی پیروی کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔

ذوق پر اعتراض :- ؎

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہو گر اس میں زلفِ سرکش ہو　　　پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

اعتراض :- یہ بحر ناجائز ہے کسی استاد نے اس پر غزل نہیں کہی۔ شیخ مرحوم نے جواب دیا کہ ۱۹ بحریں آسمان سے نازل نہیں ہوئیں طبائع موزوں نے دقت بہ وقت گل کھلائے ہیں۔ یہ تقریر مقبول نہ ہوئی۔

اوپر کی آخری دو مثالوں سے ثابت ہے کہ اردو شعرا تمام تر فارسی کی کورانہ تقلید میں مصروف تھے، اگر فارسی کے شعرا محاورے کی غلطی کرتے ہیں تو اردو کے شاعر بھی اس کے مرتکب ہوں گے، اگر کوئی عمدہ بحریں فارسی میں موجود نہیں ہیں اردو والے بھی ان میں طبع آزمائی نہیں کریں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری کی تمام خصوصیات اردو میں بعینہٖ منتقل ہو گئیں۔

مشاعروں کی بدولت اردو زبان بہت جلد ترقی کر گئی لیکن شاعری کو بہت ضعف پہنچا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شاعری قافیہ پیمائی کا نام رہ گیا تھا۔ گلزارِ ابراہیم کے مقدمے میں مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں :- "کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا بے شک لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رُخ پر عروج اور دوسرے پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لیے کہ زبان روز بہ روز منجھتی جاتی تھی اور زوال اس لیے کہ فنِ شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص اس کے بعد اور جو لوگ پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لیے شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہو قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا ایک آدھ محاورہ آ گیا کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا۔ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی۔ اور اب بھی وہی حال ہے مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں کسی نئی تشبیہ کا کہنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام

ل؎ آبِ حیات، ص۴۷۷

ہر کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لیے سند طلب کرتے ہیں جیسے کوئی قانون داں کسی فوج داری میں تعزیراتِ ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہر اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعرا کی محنت سے زبان صاف ہوگئی"...[1]

مولوی صاحب کے یہ الفاظ اس زمانے کی بالخصوص لکھنؤ کی شاعری کا نہایت صحیح نقشہ ہیں ۔ یہی حالات تھے جن کی وجہ سے میرزا غالب نے جب شاعری میں طرزِ ادا، تشبیہات میں جدت پیدا کرنی چاہی تو اربابِ علم ان کے پیچھے پڑگئے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس شدید تنقید کا اثر میرزا پر نہایت خوش گوار ہوا اور ان کی شاعری سیدھے رستے پر آگئی، لیکن اس اصلاح کی وجہ یہ نہ تھی کہ مرزا نے اپنی جدت طرازی کو ترک کردیا بلکہ یہ کہ خاص و عوام کے معیارِ سہل پسندی نے ان کے کلام کو آسان اور رواں کردیا جس سے اس میں شگفتگی پیدا ہوگئی ۔

قلعے کے مشاعرے

دلّی کے مشاعروں کی حالت بہادر شاہ ظفر کے عہد میں اگرچہ بادشاہت قلعے تک محدود تھی اور شاہی انعام و اکرام برائے نام رہ گئے تھے لیکن دلّی میں اب بھی مشاعروں کے چرچے پورے زور و شور سے ہورہے تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول مشاعرہ خود قلعے ہی میں ہوتا تھا جس میں شہر کے تمام اُستاد مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ، صہبائیؔ وغیرہ حاضر رہتے تھے ۔ یہ مشاعرے رات رات بھر رہتے تھے ۔ علاوہ اُردو کے فارسی کی طرح بھی دی جاتی تھی ۔ مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں قلعے کے پانچ ایسے مشاعروں کا ذکر کیا ہر جن میں وہ شریک ہوے ۔ مَیں صرف ایک خط کو پڑھتا ہوں جو میر مہدی مجروحؔ کو لکھا ہر ۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی نے قلعے کا مصرع طرح مانگا تھا جواب میں انھیں لکھتے ہیں: "یہ قلعے میں شاہ زادگانِ تیموریہ جمع ہوکر کچھ غزل خوانی کرلیتے ہیں وہاں کے مصرعِ طرحی کو کیا کیجیے گا اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا، مَیں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبتِ چند روزہ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہر کہ اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔"

فارسی کے مکاتیب میں سے جن میں مشاعروں کا ذکر آیا ہر چار نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کے نام ہیں

[1] مقدمہ گل زارِ ابراہیم صہ ۳

اور ایک میر مہدی مجروح کے نام۔

پہلا :۔ "جمعہ کی شب کو (۲۳ مارچ سنہ درج نہیں) بزمِ سخن آراستہ ہوئی میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اس لیے مشاعرے میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نواب ضیاءالدین احمد خاں نے نواب زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کردیا وہ دونوں شام کو ہاتھی لےکر میرے مکان پر آئے اور مجھے سوار کراکر لے گئے وہاں پہنچ کر مولانا صدرالدین آزردہ کی زیارت سے رنجِ راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی (فارسی) دو تین شعر دل نشین تھے۔ عارف اور جوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے :۔ ؎

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم — چہرہ آغشتہ بہ خونابِ جگر بنمایم

یہ غزل سُنائی آیندہ مشاعرے کے لیے گریبانم نہ می آید، دامانم نہ می آید طرح ہوئی ہے۔"

دوسرا مشاعرہ :۔ دوسرے مشاعرے میں بھی غالب شریک ہوے۔ فرماتے ہیں کہ اُردو کے بہت سے شاعر جمع تھے اور انھوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ بیمار تھے اس لیے شریکِ مشاعرہ نہ ہوئے :۔ "چوں نوبت بہ من رسید نخست "ملک نہ خواست" "فلک نہ خواست" سرودم آں گاہ غزل طرحی خواندم :۔ ؎ چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید ؛ بہ نوعے گفت می آیم کہ مے دانم نمی آید مشاعرے میں آیندہ کے لیے عرفی کا یہ مصرع قرار پایا ؏ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن۔"

تیسرا مشاعرہ :۔ تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو مجھے آکر لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سببِ علالت نہ آئے حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر تشریف لائے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ قصیدے کو براتِ نامقبول کی طرح واپس لے جاؤں گا اور اُردو کے شعرا کو دردِ سر نہ دوں گا لیکن حضرت آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہوگیا اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا (نوٹ۔ یہ مشاعرہ غالبًا قلعے سے تعلقِ ملازمت پیدا ہوجانے کے بعد ہوا جب کہ ذوق بہ قیدِ حیات موجود تھے گویا اسے ۱۸۵۰ اور ۱۸۵۴ کے درمیان کا کوئی مشاعرہ سمجھنا چاہیے)

چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں میری خاک زمیں گیر ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی ۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی اور حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دی تھی ۔

پانچواں مشاعرہ ۔ میر مہدی مجروح کو لکھا ہے :۔ جمعے کی شب ۲۵ر فروری (سن درج نہیں) کو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر جمع ہوں چناں چہ خاندانِ بابری کے شہزادے اور دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بادشاہ کی غزل پڑھی پھر شہزادۂ خضر سلطان نے اپنی غزل سُنائی اس کے بعد میرزا حیدر شکوہ میرزا نورالدین اور میرزا عالی بخت نے اپنا اپنا کلام سُنایا ۔ عالی کے پاس ہی میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اپنی غزل دس شعر کی پڑھی ۔ صہبائی کے شاگردوں میں سے محوی نام ایک نوجوان نے ' نشید مستانہ ' لگائی ۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر زمینِ طرحی میں سُنائے میں . . . بہلنے سے وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا مکانوں کے دروازے کھلے تھے چراغ روشن تھے شراب پی اور سو رہا ۔ صبح قلعے میں گیا تو وہی چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں جمع تھے انھوں نے رات والی غزلیں پھر سُنائیں میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی ۔ وہیں سُنا کہ ساری رات مشاعرہ جاری رہا ۔ سب سے آخر میں سلطان الشعرا ذوق نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں" [۱]

قلعے کے مشاعروں کی مقبولیت ان خطوط سے ظاہر ہے ' یہ مشاعرے دیوانِ عام میں ہوتے رہے ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے کریم الدین کا جو مشاعرہ لکھا ہے وہ فی الحقیقت دیوانِ عام کے مشاعروں ہی کا مرقع ہے' اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے ۔

قلعے میں شہزادے اپنے دیوان خانوں میں علاحدہ مشاعرے منعقد کراتے تھے ۔ صاحب ' خم خانہ ' وجیہ الدین اختر گورگانی کے بیان میں لکھتے ہیں :۔ " سلیمان شکوہ کے پوتے غدر سے پہلے قلعۂ معلا دہلی میں ان کے دیوان خانے میں اکثر محفلِ مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی " [۲]

قلعے کے مشاعروں میں وہ مشاعرہ بھی مشہور ہے جو مفتی صدرالدین آزردہ نے قلعے میں منعقد کرایا اس کی مفصل روداد جنوری کے ' ادبی دنیا ' میں چھپی ہے میں اسے چھوڑ دیتا ہوں ۔

---

[۱] غالب از غلام رسول مہر ص۲۷۵ بہ بعد [۲] ' خم خانہ ' جلد اول ص۲۰۲

قلعے سے باہر شہر میں بہت سے مشاعروں کا حال ملتا ہے۔ ایک مشاعرہ غازی الدین خاں کے مدرسے میں ہوتا تھا۔[51]

دلّی کالج میں بڑی دھوم دھام کے مشاعرے ہوتے تھے یہ بھی بے لطفی اور تکرار کے بڑھ جانے پر بند کر دیے گئے۔ اس کا حال مولانا آزاد کی 'آبِ حیات' میں ہے:۔

"جن دنوں شاہ نصیر کے معرکے ہو رہے تھے منشی فیض پارسا دہلی کالج میں مدرّسِ حساب تھے اور ان دنوں جوانی کے عالم میں شاعری کے جوش و خروش میں تھے۔ انھوں نے مدرسے میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ قائم کیا اور اسے انشاے اُردو کی ترقی کا جزو ٹھیرا کر صاحب پرنسپل سے مدد لی ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازے کے باہر تھا شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے گراہ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرے کے دن دو بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی مشاعرہ دلّی میں نہیں ہوا"[52]

ان مشاعروں میں شاہ نصیر اور ذوقؔ کے جھگڑے ہوئے اس کے علاوہ حکیم آغا جان عیش ایک ظریف الطبع نے عبدالرحمان ایک شخص کو ہُدہُد کا تخلص دے کر اُسے اساتذہ سے لڑایا اور اس سے لُطف اُٹھایا۔ اُدھر مومن نے ایک باز صاحب تیار کیے اور خوب خوب چوٹیں ہوئیں اور بالآخر یہ مجالس بھی ہجو گوئی اور گالی گلوچ تک پہنچیں۔

ایک مشاعرہ دلّی میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے قائم کیا تھا جو ۱۸۴۶ء میں عروج پر تھا۔[53]

پھر کریم الدین صاحب اورنگ آبادی کے ہاں ایک مجلس منعقد ہوتی تھی۔ کریم الدین ص۴۰۵۔ ایک مشاعرہ حاجی بیگ شہرت۔ اس سے موقوف ہو کر میرے مکان پر آیا۔ کریم الدین ص۴۱۴

ان دنوں دلّی سے جو اخبار یا رسالے نکلتے تھے ان میں سے بعض کے ایڈیٹر اپنے رسالے کو فروغ دینے کے لیے اپنے مطبع میں مشاعرے کرتے تھے اور پھر ان کی چیدہ غزلیں اپنے رسالے میں شامل کرتے تھے۔ لالہ سری رام دو ایسے رسالوں کا ذکر کرتے ہیں ان میں ایک "زبان دہلی" نام تھا جس کے ایڈیٹر پیارے لال صاحب رونق دہلوی تھے۔[54] اور دوسرا رسالہ 'کمال' ہے بعض ایسے مطبع تھے جو رسالے

---

[51] 'خم خانہ' ص۱۷۔ [52] 'آبِ حیات' ص۴۸۲۔ [53] 'خم خانہ' جلد سوم ص۱۰۵۰، ص۲۵۴۔ کریم الدین ص۳۷۱۔ [54] 'خم خانہ' جلد سوم ص۵۵۲۔ [55] 'خم خانہ' جلد سوم ص۵۵۶

ہی کی صورت میں مشاعرہ کرتے تھے، جنھیں گُل دستے کہا جاتا ہے اس میں گزشتہ طرح کی غزلیں شائع ہوتی تھیں اور آیندہ نمبر کے لیے طرح دے دی جاتی تھی ایسے رسالے آج کل بھی نکلتے ہیں۔

ان مشاعروں میں سب سے زیادہ اہم مشاعرہ مولوی کریم الدین کا ہے انھوں نے بھی اسے اپنے مطبع کے اشتہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ یہ مشاعرہ اگرچہ دلّی کے دوسرے مشاعروں کے مقابلے میں معمولی مشاعرہ تھا لیکن اس کو مرزا فرحت اللہ صاحب کے قلم دل پذیر نے ایک تاریخی حیثیت عطا کی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ دلّی کی شمع آخری کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرحت اللہ صاحب نے اس مشاعرے میں بہت کچھ مواد اپنی طرف سے شامل کیا ہے مثلاً اس میں اساتذہ مثلاً مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ بادشاہ کی غزل پڑھوائی ہے غرض مرزا صاحب کا مقصد اس مشاعرہ لکھنے سے کوئی اصلی یا تاریخی واقعہ بیان کرنا نہیں بلکہ اہلِ ادب کے لیے سامانِ ضیافت کا تیار کرنا ہے۔ جہاں تک آدابِ محفل، قاعدۂ نشست و برخاست، مشاعرے کے انتظام کا دخل ہے یہ مشاعرہ قلعے کے مشاعروں کا ایک صحیح مرقع ہے اور خود مرزا صاحب نے یہ لکھا بھی ہے کہ یہ مشاعرہ انھوں نے ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے جو قلعے یا دیوانِ عام کے مشاعروں کے متعلق انھوں نے اپنے بزرگوں سے سُنے ہیں۔

اس زمانے کے مشاعروں کے آداب مشاعرہ ہونے سے چند روز پہلے منادی کی جاتی تھی یا اشتہار دیا جاتا تھا جس میں مصرعِ طرح کا اعلان ہوتا تھا۔ خاص خاص اساتذہ کو طرح اہتمام کرنے والے خود بھیجتے تھے، بڑے بڑے شاعروں کو شرکت پر راضی کرنے کے لیے منّت سماجت کرنا پڑتی تھی۔ مشاعرے سب رات کے وقت ہوتے تھے۔ جہاں مشاعرہ ہونا ہوتا وہاں خوب آرایش کی جاتی اور مہمانوں کے آرام کا انتظام ہوتا، جگہ کو جھاڑ فانوس سے سجادیا جاتا۔ مہمانوں کی ضیافت کے لیے عموماً صرف حقّہ پان ہوتا تھا، بڑے بڑے امرا کھانے پینے کی چیزیں بھی حسبِ توفیق حاضرینِ خاص اور شعرا کو پیش کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشاعرہ ہی تھیٹر اور سنیما کا حکم رکھتا تھا اس لیے تمام کا تمام شہر ٹوٹ پڑتا۔ بڑے بڑے اُستاد اپنے شاگردوں کی ٹولیاں لے کر پہنچتے ان کو ایسے طریق سے بٹھایا جاتا کہ شعرخوانی کا دَور مبتدیوں سے ابتدا ہو کر اساتذہ پر آکر ختم ہو۔ اس میں مصلحت یہ ہوتی تھی کہ چوں کہ مشاعرہ رات رات بھر

چلتا تھا اس لیے لوگوں پر نیند کا خمار رہتا لیکن اساتذہ کا انتظار رہتا جس سے سارے کا سارا مشاعرہ دل چسپی سے گزرتا۔

قلعے کے مشاعروں میں ابتدا خود بادشاہ کی غزل سے ہوتی تھی جو عموماً کوئی دوسرا پڑھتا تھا، اس کے بعد نوعمر شعرا شروع ہوتے تھے ان کی ہمت افزائی کی جاتی تھی، اعتراض اور تنقید بھی ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ رفتہ رفتہ اساتذہ کی باری آتی تھی۔ سب لوگ غزلیں تحت اللفظ پڑھتے تھے اور مضمون کو ادا کرکے پڑھنا خوبی سمجھا جاتا تھا۔ گاکر پڑھنے کو معیوب خیال کرتے تھے۔ صرف بادشاہ کی غزل گاکر سنائی جاتی تھی۔ اس زمانے میں تحت اللفظ پڑھنے والے بھی بڑے بڑے باکمال تھے یہ بھی ایک خاص فن تھا۔ تذکروں میں خاص خاص شعرا کی اس فن میں خاص تعریف کی گئی ہے۔ ان میں جرأت، انشا، مومن، اوج، غالب اور بعد کے زمانے میں میرزا ارشد گورگانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جرأت کا طرزِ شعرخوانی مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ جاتے تھے۔ آبِ حیات ص۲۱۱

مومن مومن کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:۔ "میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدابخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا ایسی دردناک آواز سے دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ سارا مشاعرہ وجد کرتا تھا"۔ 'آبِ حیات' ص۴۴۲

انشا کے متعلق لکھا ہے، اکثر اشخاص مشاعرے میں اپنی غزل ان سے پڑھوایا کرتے تھے۔ آبِ حیات ص۲۸۳

عبداللہ خاں اوج:۔ پڑھتے اس زور و شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صفِ مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے۔ آبِ حیات ص۵۱۵

میرزا غالب کا اندازِ شعرخوانی بھی اپنی آپ مثال تھا۔ حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے:۔

"شعر پڑھنے کا انداز بھی مشاعروں میں حد سے زیادہ دل کش اور مؤثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے چوں کہ ان کی پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اس لیے صبح ہوگئی تھی مرزا نے کہا صاحبو اب میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں یہ کہہ کر اول اُردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُر درد آواز میں پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے اور اس لیے

غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنون شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں میرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب سید الشہدا کی منقبت میں انھوں نے لکھا تھا پڑھا۔ سُنا ہے کہ مجلسِ مشاعرہ بزمِ عزا بن گئی تھی جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے مفتی صدرالدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اسی حالت میں مینھ برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا آسماں ہم گریست . .»[۱]

داد دینے کے بھی اپنے طریقے تھے، عموماً واہ واہ سبحان اللہ، کیا خوب، ہوتی تھی۔ ایک مشاعرے میں میرزا غالب نے اوج سے کہا :-" میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں اُستاد کہتے ہیں"[۲] کبھی کہتے یہ خدا کے دین ہیں۔ جی خوش کردیا۔ بتدی ہوتا تو دعائیں دیتے۔

بڑے بڑے اُستادوں میں چوٹیں بھی چلتیں ہجوں اور گالیوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، میرِ مشاعرہ کسی بزرگِ کہنہ مشاق کو بناتے۔

مجالسِ عزا

ادھر مجالسِ عزا کا لکھنؤ میں چرچا ہوا اور انھوں نے بھی باقاعدہ مشاعروں کی صورت اختیار کی۔ مرثیے بہت ترقی کرچکے تھے۔ انیس اور دبیر کے درمیان مقابلہ ہوا۔ طویل مرثیے بزمِ عزا میں پڑھے جاتے تھے۔ مرثیے عموماً مسدس میں تھے، یہاں بھی اعتراضات کا بازار گرم ہوا اور مرثیہ گوئی کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ مجالس ان دنوں الہ آباد، مرشد آباد، بنارس، حیدرآباد وغیرہ میں ہوتی تھیں۔

مرثیہ پڑھنا بھی ایک خاص فن تھا۔ میر انیس اور ان کے خاندان کے دوسرے مرثیہ گو شعرا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر مرثیہ پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے، "آبِ حیات، ص۵۴۷"

غدر کے بعد جب دلّی تباہ ہوئی تو اہلِ کمال تمام ہندستان میں بکھر گئے اور جہاں جہاں گئے وہاں

---

[۱] 'یادگارِ غالب'، مرزا کی طرزِ شعر خوانی۔ [۲] 'آبِ حیات'، ص۵۱۵

مشاعروں کی بِنا ڈالی، خاص خاص مشاعروں کے مرکز حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ حیدرآباد۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ حاجی ابراہیم مقرّبِ نظام مشاعرے کراتے تھے نظام کی غزل وہی پڑھتے تھے۔ داغ ان میں شرکت کرتے تھے۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۱۶، ص۱۱۱، ص۱۳۱ و ص۱۸۲۔

۲۔ رام پور۔ مشاہیر کے علاوہ نواب صاحب کی طرف سے مشاعرہ ہوتا تھا جس کا انتظام داغ کے سپرد تھا۔ کلب علی خاں مشاعرے کرتے تھے۔ 'خم خانہ' جلد دوم ص۱۰۶ و ص۲۴۱

۳۔ پٹنہ۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۱۰۷، 'خم خانہ' ص۳۲۷، ص۳۷۳، ص۵۰۹

۴۔ بریلی۔ قاضی خلیل کے ہاں 'خم خانہ' جلد سوم ص۲۱۹، ص۴۰۹، ص۲۲۳، ص۱۷۸۔

۵۔ کلکتہ۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۴۵۵، 'خم خانہ' جلد اوّل ص۱۳۹۔ 'خم خانہ' ص۵۰۹

واجد علی شاہ جب کلکتہ گئے تو وہاں مٹیا برج میں مشاعرہ کیا جس کا انتظام ان کے ایک مصاحب اصغر علی اصغر کے سپرد تھا۔ 'خم خانہ' جلد اوّل ص۳۲۵

۶۔ ٹونک۔ 'خم خانہ' جلد اوّل ص۲۹

۷۔ شاہی۔ " " ص۳۵۷

۸۔ مالیرکوٹلہ۔ " جلد دوم ص۱۷۸

۹۔ بھوپال۔ " " ص۳۰۸ 'کریم الدین' ص۴۰۵۔ 'خم خانہ' جلد چہارم ص۳۱۳

۱۰۔ آگرہ۔ " جلد چہارم ص۱۸۔ ص۲۰۹۔ ص۲۱۵

۱۱۔ سندیلہ:۔ " " ص۲۳۲

۱۲۔ بدایوں۔ " " ص۲۰۰

۱۳۔ منصوری۔ 'کریم الدین' ص۴۵۳

اس کے علاوہ سندھ، مدراس، کرناٹک میں بھی مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔

انجمنِ پنجاب کے مشاعرے

مشاعروں کے ان مرکزوں کے علاوہ سب سے بڑا مرکز مشاعروں کا لاہور تھا، اتفاق سے اس زمانے میں چند انگریز عالم یہاں ایسے آگئے جنھوں نے مشرقی

علوم میں دلچسپی ظاہر کی۔ دلّی میں غدر ہوا تو بہت سے علما پنجاب اور لاہور میں آگئے جن میں مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی قابلِ ذکر ہیں، ان اصحاب نے ان انگریزوں کی مدد سے یہاں ۱۸۶۵ میں ایک انجمن کی بنا ڈالی جس کا نام ''انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب مقام لاہور'' تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ لاہور میں علوم و السنۂ شرقیہ کی ایک یونی ورسٹی قائم کی جائے۔ اس انجمن کی رویداد مختلف قسم کی کوششوں پر حاوی ہے جس میں ادبی علمی معاشی اصلاح شامل ہے۔

یہ مشاعرے یا مناظمے اس قافیہ پیمائی کا ردِّ عمل تھے جن کا میں ذکر کرچکا ہوں۔ اس انجمن نے ۱۸۷۴ میں نئے قسم کے مشاعرے کی بنا ڈالی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

''۱۸۷۴ میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دربست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔. چار مثنویاں یعنی برکھارُت، نشاطِ امید، حب الوطن اور مناظرۂ رحم و انصاف اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں۔'' [1]

نئی شاعری کے اس پہلے مشاعرے کی جس جلسے میں بنیاد رکھی گئی اس پر منشورات میں کیفی صاحب نے ایک مفصّل مضمون لکھا ہے:۔

''یہ عظیم الشان جلسہ جس کی تاریخی عظمت ادبی دنیا میں کسی جلسے سے کم نہیں۔ ۹۔ اپریل سنہ ۱۸۷۴ کو شام کے چھ بجے انجمن کے اہتمام سے سکشا سبھا کے مکان پر منعقد ہوا حاضرین میں ہندستانی اصحاب کے علاوہ کرنل ہال رائڈ، مسٹر جسٹس بولنو چیف جج چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورمنٹ۔ کرنل میکلیگن، مسٹر رینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور نواب عبدالمجید خاں فقیر سیّد قمرالدّین وغیرہ اصحاب تشریف رکھتے تھے۔ مسٹر جسٹس بولنو صدرِ جلسہ تھے۔ اس جلسے میں آزاد مرحوم نے ایک زبردست تقریر کی اور اس کے بعد ایک نظم مسمّا بہ شبِ قدر سنائی اس سے لوگوں کو یہ جتانا مقصود تھا کہ اردو کی نظم مروّجہ مضامین کے سوا اور مطالب کے بیان کرنے کی بھی

[1] مجموعہ نظمِ حالی، مقدّمہ۔

قابلیت رکھتی ہے اگر شاعر کو سلیقہ ہو۔ یہ نظم ان کے مجموعے میں بھی شامل ہے اور نئی شاعری کی سب سے پہلی نظم قرار دی جاتی ہے۔

کرنل ہال رائڈ نے اپنی تقریر کے سلسلے میں فرمایا: اس وقت مولوی محمد حسین صاحب نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر اشعار سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے۔ . . . "

مسٹر تھارنٹن، رائے مول سنگھ، پنڈت بسنت رام اور صاحب صدر کی مختصر اعترافی تقریروں کے آخر میں اس نئی شاعری کے اوّل مناظمے کے لیے ایک موضوع قرار پایا۔"

منشورات۔ ص ۲۷۸ ببعد بحوالہ ضمیمہ اخبار 'کوہ نور' لاہور مطبوعہ ۱۶ رمئی ۱۸۷۴

" اب میں آپ کو نظم کی اس خاص اور تاریخی صحبت میں لے جانا چاہتا ہوں جو ساٹھ برس گزرے لاہور میں منعقد ہوئی یہ مناظمہ ۳۰ رجون ۱۸۷۴ کو انجمن پنجاب کے مکان میں ہوا تھا آپ دیکھ چکے ہیں کہ پرانی چال کے طرحی مشاعروں کی جگہ موضوعی مناظموں کی قرار داد آزاد مرحوم نے ۹ راپریل ۱۸۷۴ء کے عالی وقار جلسے میں منظور کرائی تھی جس کی کیفیت آپ کے گوش گزار ہو چکی ہے اور یہ مناظمہ اسی سال کی ۳۰ رجون کو ہوتا ہے اس لیے ظن غالب ہے کہ یہ نئی شاعری کا اوّلین مناظمہ ہے۔ اس میں نو شعرا نے اپنی نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ آیندہ مناظمے کے لیے اُمید موضوع قرار پایا۔ وہ شعرا حسب ذیل ہیں: (۱) شاہ انور حسین ہما (۲) مولوی میرزا اشرف بیگ خاں اشرف رئیس دہلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب نظم کا عنوان تھا برد عجوز، (۳) منشی الٰہی بخش رفیق عنوان یخ بستہ (۴) حضرت آزاد، (۵) مولوی محمد مقرب علی رئیس جگراؤں، (۶) مولوی امو جان ولی دہلوی شاگرد غالب ہیڈ ماسٹر ورنیکلر مڈل سکول فیروز پور جھرکہ، (۷) مولوی قادر بخش مدرس انبالہ، (۸) مولوی عطاء اللہ اور (۹) مولوی علاء الدین محمد کاشمیری۔ (ظاہر ہے کہ باہر سے لوگ آتے تھے)

اس مناظمے کے لیے موضوع زمستان مقرر تھا جون کی جلتی بلتی گرمی اور مناظمے کا موضوع زمستان "

اس کے بعد کیفی صاحب نے ان نظموں کے شعر نقل کیے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انجمن کا یہ مشاعرہ کب تک قائم رہا؟ مولانا حالی نے جن چار نظموں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اس مشاعرے میں پڑھی گئیں۔ ان میں پہلی تین یعنی برکھا رُت، نشاطِ اُمید اور

حب الوطن یہ تینوں ۱۸۷۴ء کی نظمیں ہیں اور چوتھی ۱۸۷۶ء کی ہے یعنی مناظرۂ رحم و انصاف۔ اس سے ثابت ہوا کہ سنہ ۷۶ء تک یہ مجلس قائم تھی لیکن پیشِ نظر اس وقت "گل دستۂ سخن" یعنی "رسالۂ انجمن مشاعرۂ بیت العلوم لاہور" مطبوعہ حسب الحکم ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر صاحب رجسٹرار یونی ورسٹی کالج و پریزیڈنٹ انجمنِ پنجاب کے چار نمبر ہیں۔ یہ رسالہ انجمن پنجاب ہی کے مطبع میں چھپا۔ یہ چار نمبر حسب ذیل ہیں :-

۱- فروری ، ۱۸۸۰ء ۲- جون ، ۱۸۸۰ء

۳- جنوری ، ۱۸۸۱ء ۴ - فروری ، ۱۸۸۱ء

یہ انجمنِ پنجاب کے وہ ماہ وار رسالے تھے جن میں مشاعرے کا بیش تر کلام چھاپا جاتا تھا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

آخری نمبر جو ہمارے پاس موجود ہے ۱۸۸۱ء کا ہے جس سے ظاہر ہے کہ فروری ۱۸۸۱ء تک یہ مشاعرہ جاری تھا۔ آگے چل کر ہمیں اس مشاعرے کے وجود کا ۱۸۸۳ء تک ثبوت ملتا ہے۔ لالہ سری رام خم خانہ' میں منشی احمد حسین خاں بی اے کا حال یوں لکھتے ہیں :-

"۱۸۸۳ سے شعرگوئی کا شوق ہوا مرزا ارشد دہلوی کو کلام دکھایا ان دنوں میں انجمنِ پنجاب کا مشاعرہ بہت زور شور سے ہوا کرتا تھا مولانا آزاد اور مولوی فیض الحسن جیسے بزرگ وار شریک ہوتے تھے احمد حسین خاں بھی اپنی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔"

۱۸۸۳ء کے بعد ہمیں اس مشاعرے کا ذکر نہیں ملتا اور یہ راز تاریکی میں ہے کہ یہ مشاعرے اور خود انجمنِ پنجاب کا خاتمہ کیوں کر ہوا۔ اتنا جانتے ہیں کہ یہ مشاعرے انجمنِ پنجاب کے ٹوٹ چکنے کے بعد بھی جاری رہے کیوں کہ انجمن پنجاب ۱۸۸۳ء سے بہت پہلے ختم ہو چکی تھی، انجمن اس مشاعرے کی نظموں کو رسالے کی شکل میں شائع بھی کرتی تھی پیشِ نظر اس کے چار نمبر ہیں ہم ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

۱- فروری ۱۸۸۰ء۔ فروری ۸۰ء کے اس مشاعرے میں سب سے اوّل مولانا آزاد کی نظم ہے "نوطرزِ مرصع مولوی محمد حسین آزاد" بہ عنوان "اولوالعزمی کے لیے کوئی سدِ راہ نہیں"

اس ایک نظم کے بعد باقی تمام غزلیات جو طرحی ہیں اس سے ثابت ہو کہ انجمن پنجاب کا ہر مشاعرہ غیر طرحی نہیں ہوتا تھا اور اغلب یہی ہو کہ ہر مشاعرے میں طرح دی جاتی تھی کیوں کہ باقی تین نمبر جو اس رسالے کے ہمارے پاس ہیں ہر ایک میں طرحی غزلیات درج ہیں ۔

اس رسالے میں طرحی غزلیات اُردو کی بھی ہیں اور فارسی کی بھی ہیں ۔

اُردو طرح :۔ کھا بیٹھے ، جا بیٹھے ، دعوا بیٹھے ۔

جون ۱۸۸۰ء کے رسالے میں غلام قادر صاحب نے لانگ فیلو کی ایک نظم کا ترجمہ شائع کیا۔ محمد نثار علی شہرت : مثنوی حالت نمای علوم ہند ۔ محرم علی شاداں : مثنوی کوّے کی کارگزاریاں ، قاضی فضل حسین : مثنوی ۔ شاہ دین ہمایوں ۔ مثنوی ۔

طرح اُردو :۔ ستاتی نہیں عبث ، ہنساتی نہیں عبث ۔ اس میں تارا چند تارا ، سنت رام حسرت ، محمد دین سلیم ، رام رائے سہا ، محمد یاسین عاشق ، عطاء اللہ عطا ، فیض الحسن فیض ، الٰہی بخش منیر ، گنڈا رام ناداں ، الف دین نفیس کی غزلیں ہیں ۔

طرح فارسی (۱) :۔ نامِ تو بود ، کامِ تو بود :۔ شعرا ۔ حبیب اللہ کشمیری ، فقیر ولی محمد (غزل دوم بہ تبدیلِ قافیہ) محمد دین ہمایوں ، عطاء اللہ عطا ، غلامی شاہ غلامی ، فیض الحسن فیض ، مقصود حسین محزوں ۔

طرح فارسی (۲) :۔ گل زار را تا تار را :۔ فقیر ولی محمد (غزل دوم بہ تبدیلِ قافیہ) فتح محمد راحت ، الف دین نفیس ۔

جنوری ۱۸۸۱ء ۔ منشی نثار علی شہرت :۔ تازیانۂ غفلت ۔ مسدس ،
ظہور الدین ظہور :۔ مخمس بر مصرعۂ طرح تازیانۂ غفلت } مضمون دیا گیا ہو

طرح اُردو اوّل :۔ جاتی ہو صبح ، آتی ہو صبح :۔ نہال چند ہوئز ، عطاء اللہ عطا

طرح اُردو دوم :۔ شیطاں خالی ، رضواں خالی :۔ گنڈا رام ناداں ، شاہ دین ہمایوں ۔

طرح فارسی :۔ خو دارد ، سبز دارد :۔ عطاء اللہ عطا ، حبیب اللہ حبیب کشمیری ، قاضی فضل حسین قاضی ، محبوب سبحانی محبوب

فروری ۱۸۷۵ء : مثنوی ... الزمان صاحب در بیانِ موت۔

مثنوی صبح صادق از حبیب کشمیری

... ظہور الدین ظہور ساقی نامہ گرامی فارسی۔

طرح اردو ... ارماں نکلے : عطا، قہر

غیر طرحی اردو ... حبیب اللہ حبیب

طرحی ... محمد الدین شمیم محبوب سبحانی محبوب۔ عالی۔ حبیب۔ عطاء اللہ عطا۔

قہر قاضی فضل حسین قاضی

... شاعرے بنائے گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اور مروجہ طریق نے طرح دینے پر مجبور کیا ... ایک رسالہ مشاعرہ نکالتی تھی جس میں منعقدہ مشاعرے کا کل شائع ہوتا تھا ... ہیں ان میں طرحی غزلیں زیادہ ہیں۔

۱۸۷۵ء ... کے چلانے کی کوشش کی لیکن یہ ظاہر ہے کہ انجمن پنجاب میں عام قسم کے ... سے ہو ... محترمی آغا باقر صاحب کی رائے میں انجمن پنجاب کے مشاعرے اور ۱۸۷۴ء ... مختلف ہیں کرنل ہال رائڈ کے ان مناظموں کو انجمن پنجاب سے کچھ تعلق نہیں لیکن ... اور کلام جس رسالے میں چھپتا تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں یعنی رسالہ انجمن مشاعرہ ... حسب الحکم ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر، رجسٹرار یونی ورسٹی کالج و پریزیڈنٹ انجمن ... ہے کہ کرنل ہال رائڈ اور ڈاکٹر لائٹنر کے درمیان رنجش تھی، ممکن ہے یہ ... پنجاب کے رواجی مشاعروں ہی کو مناظموں کی صورت میں بدل دیا گیا اور انجمن پنجاب ... کرنل ہال رائڈ کے مناظمے ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ انجمن پنجاب ۱۸۶۵ء میں وضع ... اور ... میں ... نے مشاعرے شروع کیے جو طرحی تھے ان کے حالات ہمیں انجمن پنجاب کے ان رسالوں ... ہیں جو انجمن کی رو ... کے حامل ہیں۔

بظاہر ان مشاعروں اور ۱۸۷۴ء ... بعد کے مشاعروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا وہی فارسی اور

اُردو کی طرحیں ہمیں یہاں بھی نظر آتی ہیں[۱] سوائے اس کے کہ گنتی کی چند نظمیں جو ۱۸۷۴ء کے بعد کے مشاعروں میں ملتی ہیں ان میں نہیں ہیں، اکثر شعرا بھی وہی ہیں۔

ان مشاعروں کا سب سے پہلا ذکر ہمیں مارچ ۱۸۶۶ء میں ملتا ہے۔ ۲۷ مارچ کے جلسے کی روداد میں یہ الفاظ ہیں :-

"حسب تحریک سکریٹری تجویز منظور ہوئی کہ جلسہ لکچر و مشاعرے میں جس قدر غزلیں اور لکچر پڑھے جاتے ہیں بہ نظرِ ترغیب و تحریک ہفتہ وار چھاپی جاویں اور شاعروں اور لکچر دینے والوں کو مفت دی جاویں اس کا خرچ بھی قلیل ہوگا صاحب پریزیڈنٹ نے بہ اتفاق اس رائے کو منظور کرلیا اور فرمایا کہ خرچ اس کا لکچر فنڈ سے دیا جائے۔"[۲]

نومبر ۱۸۶۶ء میں یہ مشاعرہ کچھ عرصے کے لیے بند ہوگیا تھا چناں چہ ۵ نومبر ۱۸۶۶ء کے جلسے میں "صاحب پریزیڈنٹ نے فرمایا کہ بہ دستورِ سابق مشاعرہ ہوا کرے اور غزلیات چیدہ چیدہ ہر مشاعرے کی چھپ جایا کریں اور قیمت ان کی دو آنے مقرر کی جاوے اور مشاعرے میں حاضرین کو تقسیم کی جاوے اور مشاعرہ دوسرے میں تقسیم کیے جاویں اور اشعار اگر سوائے مضامینِ عشقیہ کے اور مضامینِ مفیدہ میں بھی تصنیف ہوا کریں تو مناسب ہے چناں چہ اس تجویز سے مرزا خاور صاحب کو اطلاع دی گئی۔"[۳]

جہاں ۱۸۶۷ء کے بعد کے جلسے ماہ وار تھے یہ مشاعرے ہفتہ وار ہوتے تھے :- روداد ۱۴ اکتوبر رسالہ ۱۸۶۸ء صفحہ ۲۲ "صاحب پریزیڈنٹ بہادر نے فرمایا کہ مجلسِ مشاعرہ کی بھی بہ دستور سابق ہفتہ وار منعقد ہونی چاہیے تاکہ ہر ہفتہ میں روز افزوں رہے شائقانِ اس مجلس کی خدمت میں تحریں اس کی کرنی چاہیے۔"

جلسہ لکچر و مشاعرہ ایک ہی ہوتا تھا[۴] لکچر ہر قسم کے ہوتے تھے جن میں سائنس کے لکچر بھی کثرت سے ہوتے تھے۔ اس لیے مشاعرہ ختم ہو جانے کے بعد لکچر شروع ہوتے تھے[۵] تاکہ صرف وہی لوگ بیٹھے رہیں جو خاص فروعِ علم میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ اکثر علم و ادب کی اصلاح پر بھی لکچر دیے جاتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے نئی شاعری کی حمایت اور قدیم شاعری کے خلاف احتجاج ۱۸۶۷ء

---

[۱] دیکھو رسالہ انجمن پنجاب جنوری، فروری، اکتوبر، دسمبر ۱۸۶۸ء اور دسمبر ۱۸۶۹ء۔ [۲] رسالہ مارچ ۱۸۶۶ء۔ [۳] رسالہ انجمن نومبر ۱۸۶۶ء۔ [۴] رسالہ اپریل ۱۸۶۶ء صفحہ ۵، صفحہ ۲۲۔ [۵] رسالہ اپریل صفحہ ۲۲۔

ہی سے شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انھوں نے مجلسِ مشاعرہ میں ایک لکچر دیا جس کا عنوان یہ تھا "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات"[۵۱] اس کے بعد ۲۴ فروری سنہ ۶۸ کو ایک اور لکچر دیا[۵۲] غرض رفتہ رفتہ ان کا ارادہ پختہ ہوتا گیا اور بالآخر انھوں نے ۱۸۷۴ء میں اس مناظمے کی بنا ڈالی (منشوراتِ کیفی۔ ص۲۰۵) " یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تجدیدِ شاعری کی اِن کوششوں کا آزاد کے اہلِ وطن نے کس انداز سے استقبال کیا اور اُردو پریس نے کیا تبصرہ کیا، اس بارے میں تفصیل کے لیے تو ایک دفتر درکار ہی پھر بھی سرسری واقفیت کے لیے صرف ایک اخبار سے استفادہ کیا جائے گا۔ میرٹھ کے ہفتہ وار اُردو اخبار 'اخبارِ عالم' کی ۲ اکتوبر ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں مفصّل افتتاحیہ اس موضوع پر درج ہی جس کے بعض حصّے اس بارے میں کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ شاعری کے ابتدائی عہدوں کے تذکرے کے بعد صاحبِ اخبار اس زمانے کی شاعری کی قابلِ رحم حالت کا خاکہ اُتارتے ہوئے رقم طراز ہیں :- "..... اس واسطے اُردو شاعری ... کی حالت نہایت خراب ہوتی جاتی تھی مگر آفریں ہی مولوی محمد حسین صاحب آزاد تخلّص پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کی رائے صائب پر کہ انھوں نے اُردو شاعری کی بے قدری کو نظر کر کے ایک انجمن قائم کی جس کے ممبر واقعی حالات کے مطابق ... کے ساتھ پورا پورا نظم میں موزوں کرتے ہیں اگرچہ بعض شاعروں نے اس تجویز پر طعن آمیز مضمون اخباروں میں چھپوائے ہیں جیسا ابتدائی قاعدہ ہر ایک عمدہ سے عمدہ تجویز کا ہوتا ہی کہ اوّل لوگ اس پر ہنسا کرتے ہیں پیچھے اس کے فائدے دیکھ کر خود بھی اُدھر ہی متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو حضرت آزاد نے آزادانہ اور بے باکانہ شاعری کو دوسرے قالب میں ڈھال دیا ہی جس سے پُرانا مردہ زندہ ہوگیا..... "

لاہور کی اس جدت آفرینی کی صلائے عام نے کہاں کہاں گونج پیدا کی اس کا بھی کچھ اندازہ 'لارنس گزٹ' کے اسی افتتاحیے سے ہوسکتا ہی :- "..... افسوس کہ میرٹھ میں صرف دو ہی جلسے نظم سوسائٹی میں ہونے پائے تھے کہ وبائی بیماری تپ لرزہ نے لوگوں کو پراگندہ کر دیا ورنہ وہ اس انجمن کی شاخ ہوجاتی"۔ یہ پایا جاتا ہی کہ مناظمے کا جہاں تک تعلق ہی میرٹھ کی نظم سوسائٹی نے نظم وضبط کے ساتھ انجمنِ

---

۵۱ مجموعہ نظم آزاد ص۱ ۵۲ رسالہ انجمن فروری ۱۸۷۶ء ص۲۹

پنجاب کے ضابطے کی تقلید کی۔ یہ یوں ہوا کہ لاہور کی انجمن کے موضوع لے کر انھوں نے اپنے ہاں مناظمہ قائم کیا۔ دلّی میں دہلی سوسائٹی نے بھی انجمنِ پنجاب کی تقلید میں مناظمے کیے۔ پنجاب میں انجمن کی بے شمار شاخیں قائم ہوئیں جن میں کانگڑہ اور قصور میں نئی قسم کی شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں نے اُردو شاعری کو اگرچہ پُرانی بدعتوں سے چھڑا کر شاعری کی نئی شاہ راہوں پر لگایا لیکن آئندہ آنے والے مشاعروں کو بالکل بے مزہ کر دیا آج کل بھی مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں۔ علمی درس گاہوں میں اور ریڈیو پر مشاعرے کیے جاتے ہیں لیکن ان میں ان مشاعروں کا مزہ ہمیں نظر نہیں آتا جن کا حال ابھی ہم نے دیکھا ہے آج کل مشاعروں میں دو باتیں نمایاں خصوصیات ہیں :-

(۱) گا کر پڑھنا۔ اس کی مثالیں ہمیں پُرانے مشاعروں میں بھی ملتی ہیں لیکن وہاں یہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔

(۲) مشاعروں میں بلینک ورس پڑھنا۔ اس کی ابتدا اوائلِ بیسویں صدی سے ہوئی شمس العلما مولوی محمد یوسف عظیم آبادی اسی زمانے میں زمانے کے انقلابات پر ایک غزلِ مسلسل میں لکھتے ہیں :- ؎

پڑھتے ہیں سب بجائے غزل اب بلینک ورس
اب ہیں مشاعروں میں غزل خواں نئے نئے

مشاعروں کی گرم جوشی کا کُل دارو مدار منافست اور مقابلے پر ہوتا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے اگر طرح دی جائے یا شعرا کو کوئی موضوع بتا دیا جائے، ان کو مکمل آزادی دینے سے مسابقت کا عنصر مشاعروں سے خارج اور مشاعروں کا وہ مقصد خبط ہوتا ہے جس سے شاعری ترقی پاتی ہے۔

(※)

توتا

(ترجمہ مع اضافہ از جناب آغا سروش صاحب لکھنوی)

[یہ ٹیگور کی نظم Parrot کا ترجمہ ہے سروش صاحب لکھنوی لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن نے کیا ہے اور "اُردو" میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے۔ اس میں کہانی کے پیرائے میں موجودہ تعلیم کا خاکا اُڑایا ہے۔ مدیر]

ایک پرندہ تھا جاہل اور ناداں
ہے یہ دل‌چسپ اس کے غم کا بیاں
کام تھا اس کو صرف گانے سے
ڈالی ڈالی پہ چہچہانے سے
علم سے تھا نہ اک ذرا سا لگاؤ
تھا طبیعت کا وحشیانہ بہاؤ
اس طرف سے ادھر کو مڑ جانا
اُس طرف سے ادھر کو اُڑ آنا
تھی نہ تہذیب پانو کی زنجیر
بندِ شایستگی کا تھا نہ اسیر

ایک دن اس کو شاہ نے دیکھا
بولا کس کام کا پرند ایسا
نہیں اچھے برے کی جس کو تمیز
کاش ڈالا اسے ملے جو تمیز
یہ جو اُڑتا رہا یونہی آزاد
باغِ شاہی کے پھل ہوے برباد
بولا پھر اے وزیر تو ہے حکیم
اس کو باقاعدہ ملے تعلیم

دو بھتیجے تھے شہ کے نیک‌نہاد
بن گئے وہ پرند کے استاد
دونوں نے مل کے اک کمیٹی کی
تاکہ تعلیم پر ہو بحث بڑی
ایک جلسے میں سب ہوے حاضر
فنِ تعلیم کے جو تھے ماہر
باندھے طومار خوب بحثوں کے
کہ پرندے کا رازِ جہل کھلے
اور پھر اس نتیجے پر پہنچے
کہ ہیں یہ عیب آشیانے کے
خس کے تنکوں کا گھر ہے بہت تنگ
علم اور جہل میں نہ ہو کیوں جنگ
یہ ہے محدود علم بے پایاں
کوزے میں بحر کی سمائی کہاں

الغرض سب نے مِل کے طے یہ کیا
پہلے پنجرا بنے اِک اچھا سا

فرد تھا اپنے فن میں اک سُنار
اس نے زرّیں قفس کیا تیّار
ایسی کاری گری و صنّاعی
چشمِ خورشید نے نہ دیکھی تھی
دُور دُور اُڑ کے جب یہ پہنچی خبر
لوگ دوڑے کہ دیکھیں ایک نظر
وہ قفس تھا کہ جنّتِ شدّاد
قید ہونے پہ جان دیں آزاد
ایک بولا کہ سب یہ نقش و نگار
ہیں پرندے کے عِلم کے آثار
دُوسرا بولا کچھ نہ ہو تو بھی
کیا حصولِ قفس نہیں کافی
اِس پرندے کو یہ قفس جو مِلا
ہو تو جاہل مگر نصیب کُھلا

اِس طرف وہ سُنار نیک انجام
نام کے ساتھ لے گیا انعام

اب پروفیسروں کی باری آئی
سب نے [illegible] کردی پڑھائی
ایک ان میں سے بولا فرزانہ
چاہیے مجھ کو [illegible] خانہ

پھر بھتیجوں نے بھیج کر پیغام
کیے خطاطِ [illegible] جمع تمام
خوش نویسوں نے اپنے فن دکھلائے
[illegible] لگائے
دیکھ کر ان کو [illegible] واہ
[illegible] کی نہیں اب تعداد

[illegible] کام
گاڑیوں لاد لے گئے انعام
[illegible] مسرور
[illegible] دُور

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تیلیوں کو قفس کی چمکایا
عیب ڈھانپا جہاں جہاں پایا
ہوا یہ شور اس بکھیڑے کا
ملک بھر جوش میں پکار اٹھا
ایک دن ہوگا یہ پرند فہیم
نور پہ ہے ترقیٔ تعلیم

خادموں کی پھر اک جماعت کو
متعیّن کیا حفاظت کو
اور ان پر مزید نگراں تھے
من چلے ، خوش لباس ، البیلے
ان کو تنخواہیں ملتی تھیں معقول
کہ رہے ان کا دل کبھی نہ ملول
ہر مہینے کی پہلی جب آئی
جیب پہلے انھی نے گرمائی

یوں تو ہر چیز ہے جہاں میں کم
جس سے دستِ طلب نہیں بے غم
زیادتی ہو اگر تو اک شے کی
نکتہ چینی کہو کہ بے بینی
ہوگئی ایک نکتہ چیں نہ خبر
نکلے اس کی زباں میں بال و پر

بولا کیا انتظام ہے واللہ
اب پرندہ غریب ہوگا تباہ

بادشاہ کو ہوا جو علم اس کا
ان بھتیجوں کو پاس بلوایا
اور پوچھا کہ ماجرا کیا ہے
کوئی کہتا تھا یہ تماشا ہے
کی بھتیجوں نے عرض شہ کے حضور
نکتہ چیں کی نظر کا سب ہے قصور
خوش نویس و پروفسر کہ سُنار
ہے ہر اک اپنے کام میں ہشیار
خادموں کی پھر اک جماعت ہے
رات دن جو پئے حفاظت ہے
نگراں خادموں کے چند ہزار
سر ہے ان میں کوئی کوئی سردار
ان کو بلوا کے پوچھیں شاہنشاہ
ہوں حقیقت سے حال کی آگاہ
بیٹھے بیٹھے جو نام دھرتے ہیں
اسی باعث تو بھوکوں مرتے ہیں

سن کے احوال سب شہِ ذی جاہ
مطمئن ہوگیا جو خاطر خواہ

کام سے خوش ہوا بھتیجوں کے
خلعتِ بے بہا صلے میں دیے

بیٹھے بیٹھے خیال شہ کو ہوا
کہ نہ جانے پرندہ ہی کیسا
لاؤ میں بھی تو جاکے دیکھوں کبھی
کتنی تعلیم نے ترقّی کی
ایک دن پھر وزیر اور ندیم
ساتھ شہ کے چلے بہ صد تعظیم
درس گہ کی طرف بڑھا ہاتھی
حسبِ رتبہ تھے جا بہ جا ساتھی
تھی سواری کی سارے شہر میں دھوم
ہوا خلقت کا راستوں پہ ہجوم
الغرض کرکے شہر کا دورہ
صدر دروازے پر جلوس آیا
ہوا شہ کو اُترنے کا جو خیال
بڑھ گئے لوگ بہرِ استقبال
چوب نقارے پر لگائی گئی
وردی اعزاز میں بجائی گئی
گھنٹے ناقوس جھانجے کی جھنکار
شادیانوں کا شور نَے کی پکار
اِس قیامت کی نغمہ ریزی تھی
جوش میں بجلیوں کی تیزی تھی۔

باجے بجنا جو ہو چکے موقوف
بڑھے اُستاد صاحبانِ وقوف
گون پہنے ہوئے لیاقت کی
بولتی مورتیں صداقت کی
سب نے ہاتھوں پہ لے کے پاک کتاب
بہرِ تقدیس پڑھ دیا اک باب

زرگر و خوش نویس اور معمار
خادم اور ہوشیار رنگراں کار
بعد اس کے ادب سے آگے بڑھے
اونچی آواز میں ترانے پڑھے

کی بھتیجوں نے عرض ظلِّ اللہ
چشمِ انصاف سے ذرا ہو نگاہ

شہ نے فرمایا کچھ ٹھکانا ہی
کیا زبردست شور برپا ہی

دونوں بولے یہی نہیں خالی
شور میں راز ہیں بہت عالی

قابل و لائق و عقیل و فہیم
مَیں بھی دیکھوں طریقۂ تعلیم

شاہ خوش خوش وہاں سے جب پلٹا
طے کیا اس نے صدر دروازا
چاہتا تھا کہ بیٹھے ہاتھی پر
نکتہ چیں کا وہیں کہیں تھا گُزر
آگے بڑھ کر ادب سے عرض کیا
ہو اجازت تو کچھ کہے بندا
شہ نے فرمایا ہاں کہو ہو کیا
بولا وہ کیا پرند بھی دیکھا

شہ تھا مشتاق اور یہ مشتاق
دے ہی ڈالے نمونے کے اسباق
عظمتِ کار وہ ۔ وہ عرضِ ہُنر
خود پرندہ بھی جس سے تھا ششدر
انتظامات کی وہ کثرت تھی
جس پہ چشمِ خرد کو حیرت تھی
اتنا سامان تھا پڑھائی کا
دانہ پانی قفس میں تھا عنقا

چونک کر شہ نے اپنے جی میں کہا
ہا۔ پرندہ تو یاد ہی نہ رہا
خاص جس کے لیے مَیں آیا تھا
یہ نہ کہتا تو بھول ہی جاتا

پہلے باریک کی قلم کی نوک
کارِ تدریس میں نہ ہوتا روک
پھر کتابوں سے لے کے خشک ورق
نئے انداز سے ٹھونسائے سبق
حلق میں جو نوالہ پھنس جاتا
وہ بھی نوکِ قلم سے دھنس جاتا
اب پرندہ کہاں، کہاں گانا
بند فریاد کا بھی تھا رستا

سامنے تھے پروفسر حاضر
فنِ تعلیم کے بڑے ماہر
یہ ہوُا ان سے شاہ کا ارشاد
آپ سب ہیں پرند کے اُستاد

اس قدر خوف ناک نظّارہ
شاہ نے اپنی آنکھ سے دیکھا

خوش ہُوا کام سے بھتیجوں کے
چلتے چلتے انھیں صلے بھی دیے
صدرِ عمّال کو ہوا فرمان
نکتہ چیں کے اینٹھے جائیں کان

مختصر یہ کہ جتنے دِن گزرے
اتنے دِن پھر گئے پرندے کے
تھا پروفسروں کا اس کا یقین
ہوگیا وہ مہذّب اور متین
جان جتنی گھُلی ریاضت میں
اتنے پر لگ گئے لیاقت میں
بے سبب کب یہ نیم جانی تھی
یہ تو امید کی نشانی تھی

اس طرف وہ پرند کیا معلوم
کیوں قفس میں رہا کیا مغموم
صبح دم سمجھتے ہی پہلی کرن
جس کی رہتی تھی شام ہی سے لگن
تیلیوں پر قفس کی سر دھنتا
تال پر ہر نفس کی سر دھنتا
پھڑپھڑانے میں ٹوٹ جاتے پر
باز آتا نہ شرحِ غم سے مگر
تھا جو معی محال کا مختار
کاٹتا چونچ سے طلائی تار
نگراں کہتے سر بسر گستاخ
کس قدر ہے یہ مشتِ پر گستاخ

پاس ہی رہتا تھا وہاں لوہار
اس کو لائے بُلا کے خدمت گار
ساتھ لایا ہتھوڑا اور نہائی
بھٹی صحنِ قفس کے پاس لگائی
کی طلائی قفس کی بربادی
جڑ دیے اس پہ جال فولادی

پھر بھی ہمّت سے ور اگر کاٹے
مبتلائے بَلا کے پر کاٹے

سر ہلا کے وزیر شہزادے
باتیں سنجیدگی سے یوں کرتے

سلطنت کے پرند بے ایمان
یہی اِتنا نہیں کہ ہیں نادان
علم کی شان کا نہیں احساس
ان کو احسان کا نہیں احساس

کام کچھ اس قدر نہ تھا دُشوار
لے کے اُجرت چلا گیا لوہار
ہر محافظ نے ہوشیاری پر
پائے انعام جھولیاں بھر کر

ہوگیا انتظام پھر معقول
فنِ تعلیم کا جو ہے معمول
پوری سچائی اور دیانت سے
پہلے سے کچھ زیادہ محنت سے
اِن پروفسروں نے کام کیا
ساری دُنیا میں اپنا نام کیا

موت آئی پرند کو جس دن
کوئی یہ بھی نہ سمجھا کب کس دن
قفسِ تن کا توڑ کر ہر بند
اُڑ گیا وہ قفس رہا سربند
قید و بندِ قفس سے چھوٹ گیا
جو گھروندا بنا تھا ٹوٹ گیا

نکتہ چیں نے جہاں کو گرمایا
ہر طرف اس خبر کو پھیلایا

بادشہ نے کہا بھتیجوں سے
حکم پاکر جو سامنے آئے
مجھ کو سمجھاؤ سُن رہا ہوں کیا
مرگیا یا پرند ہے زندہ

کی بھتیجوں نے عرض شاہنشاہ
نکتہ چیں نے اُڑائی ہے افواہ
بلکہ اس کے خلاف ہے یہ دلیل
کارِ تعلیم کی ہوئی تکمیل

پوچھا اُڑتا ہے باغ میں بے کار
عرض دونوں نے کی نہیں سرکار
بولا اب بھی پھدکتا ہے ہر بار
دونوں بولے نہیں نہیں سرکار
بھوک سے نہیں ہے اب بے زار

بولے بالکل نہیں - نہیں سرکار
گایا کرتا ہی کیا میاں کے ملار
بولے امکان ہی نہیں سرکار

شہ نے فرمایا لاؤ میرے پاس
دیکھوں کتنے ہیں اس میں ہوش وحواس

شان و شوکت سے آئی اس کی لاش
ہوئی مردے میں زندگی کی تلاش

مشت پر کا دبایا ہر پہلو
نہ ملا زیست کا مگر پہلو
زندگی میں پڑھے تھے جتنے سبق
پیٹ میں سرسرائے اُتنے ورق

بچ کے آزاد سے نسیم چلی
منھ بنا کر ہنسی ہر ایک کلی
باغِ عالم میں مُسکرائی بہار
دِل کو برما گئی پُرانی بہار

مردم شماری سنہ ۱۹۴۱ء رپورٹ مردم شماری سنہ ۱۹۴۱ء پر سیرحاصل تبصرہ جس میں ہندُستان کی آبادی، تعلیم، روزگار، فرقوں اور زبانوں وغیرہ کے متعلّق مفید اعداد و شمار اور جدولیں دی گئی ہیں - ہر قومی کارکن اور معلوماتِ عامہ سے دِل چسپی رکھنے والے کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہی- قیمت مجلّد ۳؍ غیر مجلّد ۲؍

مشاہیر یونان و روما مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی نے پلوٹارک کی مشہور عالم کتاب "السیر" سے اُردو میں ترجمہ کیا ہی - اس کتاب میں یونان و روما کی مشہور ہستیوں کا حال نہایت ہی دِل چسپ انداز میں مورّخانہ تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہی - ترجمے کی سلاست و لطافت قابلِ داد ہی - قیمت جلد اوّل مجلّد ۸؍ غیر مجلّد ۸؍، جلد دوم مجلّد ۸؍ غیر مجلّد ۸؍-

مینیجر انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

خیام مؤلفہ سید سلیمان ندوی پر ایک عروضی نظر

(جناب سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی وکیل ،جے پور)

حکیم عمر خیام پر مشرق و مغرب کے فضلا نے بہت کچھ لکھا ہو اور اب تک بھی قلم کی گردش آسودۂ منزل نہیں علامۃ العصر مولانا سید سلیمان ندوی نے جن کی مستجمع کمالات ہستی بہ لحاظِ تبحرِ علمی و وسعتِ تحقیق ایک امتیازِ خاص رکھتی ہو "خیام" نامی ایک کتاب دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع فرمائی ہو جس میں خیام کے سوانح حیات و تصنیفات پر محققانہ تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیاتِ خیام پر مفصل مباحث ہیں اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کی رباعیات کے ایک قلمی نسخے کی نقل شامل ہو خیام پر یہ بہت ہی مکمل و جامع اُردو میں پہلی محققانہ کتاب ہو۔

اس مضمون میں صرف رباعی اور رباعی کے اوزان کا جہاں تک تعلق ہو مجھے عروضی نقطۂ نگاہ سے تبصرہ مقصود ہو۔

(۱) خیام ص۲۲۵۔ رباعی کی تاریخ، وجہِ تسمیہ اور عربی زبان میں رباعی کا رواج بیان کرنے کے بعد عمارۂ مروزی کی مندرجہ ذیل رباعی لباب الالباب عوفی جلد دوم ص۲۵ سے نقل کی ہو ؎

آں مے بہ دست آں بتِ سیمینِ من نگر گوئی کہ آفتاب بہ پیوست با قمر
واں ساغرے کہ سایہ بیفگند مے برو برگِ گل سپید است گوئی بہ لالہ بر

مقصود یہ ہو کہ اس عہد تک فارسی رباعیات کے تیسرے مصرع کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہ تھا۔

لیکن اس منظوم سے رباعی کے تیسرے مصرع کے ہم قافیہ ہونے یا نہ ہونے پر استدلال نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس منظوم کا وزن رباعی کے اوزانِ مقررہ سے مختلف ہو۔ یہ منظوم بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف بر وزنِ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ہو اور رباعی کے لیے بحرِ ہزج مخصوص ہو جس

کے چوبیسؔ اوزان بارہؔ اخرب اور بارہؔ اخرم ہیں ۔

اس رباعی کے متعلق علامہ نے "معارف" اکتوبر ۴۲ء صفحہ ۲۶۷ میں ارشاد فرمایا ہو کہ

"عمارہ مروزی کا یہ قطعہ یا رباعی جو چاہے کہیے میں نے "لباب الالباب" عوفی جلد دوم صفحہ ۲۵ طبع برون سے نقل کی ہو اس میں عوفی جیسے ماہر ادب نے اس کو رباعی ہی کہ کر نقل کیا ہو اس کی تصحیح و تحشی کا کام اس عہد کے نامور ایرانی فاضل علامہ عبدالوہاب قزوینی نے کیا ہو انھوں نے بھی یونھیں رہنے دیا ہو اور اس نظم کے چاروں مصرع بھی اسی طرح ہیں جس طرح میں نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں ۔ اتنا لکھنے سے صحتِ نقل کا بار تو میرے سر سے اُتر گیا ۔ عوفی کا اس کو رباعی کہنا اور قزوینی وغیرہ مصححین کا اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا یہ معنی رکھتا ہو کہ مروزی کے عہد تک اوزانِ رباعی کی یہ تخصیص نہیں ہوئی تھی جو بعد میں ہوئی ۔ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ لوگ ہر چہار مصرعوں کی نظم کو رباعی کہ دیتے تھے ۔ چناں چہ عوفی نے ایک اور چار مصراعی نظم کو جس کے پہلے مصرع میں قافیہ بھی نہیں ہو رباعی کہا ہو ۔"

مروزی کا سالِ وفات ۳۶۰ھ ہو اور رباعی کی ایجاد یعقوب صفار المتوفی ۳۶۵ھ کے زمانے میں ہوچکی تھی اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مروزی کے عہد میں اوزانِ رباعی کی تخصیص نہ ہوئی تھی اور اگر دوسری روایت کو جو رودکی المتوفی ۳۲۹ھ اور زمانۂ حکومت سامانیہ سے متعلق ہو صحیح مانا جائے تو بھی مروزی کے سالِ وفات ۳۶۰ھ سے پہلے رباعی ایجاد ہوچکی تھی عوفی کی مہارتِ ادب اور قزوینی کی نکتہ سنجی پر ہم کوئی اعتراض کرنا نہیں چاہتے ۔ جب کہ علامہ ان کو ایک ماہرِ ادب اور فاضل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن ہم یہ ضرور عرض کریں گے کیا محترم علامہ کے پیشِ نظر عوفی کے دست و قلم کا لکھا ہوا کوئی نسخہ ہو اور اگر نہیں ہو اور یقیناً نہیں ہو تو ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ ناقلانِ ناعاقل کی تحریف و تصرف ہو اور یہ قابلِ استدلال نہیں ۔ بے مایہ ناقلوں اور کم سواد کاتبوں نے اساتذۂ مسلم کی تصانیف میں تحریف و تصرف کرکے ایسی غلطیاں پیدا کردی ہیں کہ اساتذہ کی طرف اِن کا انتساب بھی سوے ادب سے کم نہیں ۔

مولانا جامی علیہ الرحمۃ کے متعلق کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اوزانِ رباعی سے ناواقف ہوں گے اور بحرِ ہزج کے سوا کسی اور بحر میں رباعی کہنا جائز رکھیں گے لیکن بہارستانِ جامی صفحہ ۸ مطبوعہ نول کشور میں مندرجۂ ذیل قطعہ رباعی کے نام سے درج ہو ؎

آں کہ نی نام بہ دست است مرا زو نہ نشاں — دست بہ گرفتہ مرا در عقب خویش کشاں

اوست دست من و پا تیز بہ ہر جا کہ رود — پاے کوباں زپیش می روم و دست فشاں

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات۔ رمل مثمن مخبون مقصور

شیخ سعدی پیغمبرِ سخن ہیں ان کا فضل و کمال شریعتِ سخن میں محتاجِ تعارف نہیں۔ ’گلستاں‘ مطبوعہ مجوب المطابع میرٹھ باب اوّل میں مندرجۂ ذیل قطعہ رباعی کے نام سے درج ہے ؎

تا مردِ سخن نہ گفتہ باشد — عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست — شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مفعول مفاعلن فعولن ۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف

’گلستاں‘ باب دوم میں قطعۂ زیریں رباعی کے نام سے تحریر ہے ؎

تو نیکو روش باش تا بد سگال — بہ نقص تو گفتن نیابد مجال

چو آہنگ بربط بود مستقیم — کے از دستِ مطرب خورد گوشمال

فعولن فعولن فعولن فعول ۔ متقارب مثمن مقصور۔

کیا صحیح الرائے مرتبہ شناس مصنف اس قسم کے مطبوعات کی بنا پر سعدؔی و جامؔی کی شخصیت کو مجروح کرسکتا ہے یا ناقابلِ وثوق شواہد کو دستاویزِ تحقیق بنا سکتا ہے۔

اُردو زبان میں جو مرتبہ انیؔس و دبیؔر کا بہ اعتبار کمالِ فن ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر جلد مرثیہ ہائے انیؔس مطبوعہ نول کشور پریس میں مندرجۂ ذیل قطعات رباعیات کے سلسلے میں طبع ہوے ہیں، صـ۱۹۲ ؎

غافل تجھے کیوں خواہشِ دنیاے دنی ہے — پیوندِ زمیں ہر کوئی درویش و غنی ہے

جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ — سوتے ہیں تہِ خاک گلے میں کفنی ہے

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن ۔ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف

ایضاً صـ۳۹ — مومنو! یہ مقامِ زاری ہے — اور اب وقتِ اشکباری ہے

فاطمہ آچکی ہیں مجلس میں — اب کہو کس کی انتظاری ہے — خفیف

فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔ خفیف مسدس مخبون محذوف۔

جلد مرثیہ ہائے مرزا دبیر مطبوعہ نول کشور پریس میں حسب ذیل قطعات رباعیات کے نام سے لکھے ہوئے ہیں۔

صفحہ ۲۲۳ ہے عزیزو! آنسو بہاؤ محرم آ پہنچا فلک پہ نالۂ خیرالنسا بھی جا پہنچا

برائے بخشش امت شہید ہونے کو حسین متصل دشت کربلا پہنچا

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ۔ مجتث مثمن مخبون محذوف۔

ایضاً صفحہ ۲۴۸ جس گھڑی مسلم بےکس کا خیال آتا ہے صاحب درد کو افسوس کمال آتا ہے

سر تو نیزے پہ چڑھا لاش پھری کوچوں میں ایلچی پر کہیں ایسا بھی زوال آتا ہے

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ۔ رمل مثمن مخبون محذوف مسکن۔

دیوان ذوق دہلوی مرتبہ پروفیسر آزاد مطبوعہ لاہور میں بھی یہ قطعہ پروفیسر آزاد کی ترتیب میں رباعی کے نام سے درج ہوگیا ہے صفحہ ۲۸۹ ہے۔

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعوا ہے کمال غور سے دیکھا تو ای ذوق ہے اُن کا یہ حال

جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر نقل کرتا ہو مسلمانوں کی کافر نقال

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ۔ رمل مثمن مخبون مقصور۔

ان تمام ترتیبی مسامحت سے شعرائے کامل الفن پر یہ ایراد وارد کرنا کہ وہ عروض سے ناواقف تھے حد درجے کی ناحق شناسی ہے۔ بحث رباعی سے متعلق اس موقع پر علامہ ندوی کو ایسی رباعی پیش کرنی چاہیے تھی جو بلا اختلاف رباعی کہی جاسکے ۔ اب یہ فرمانا کہ قطعہ یا رباعی جو چاہے کہیے اصل موضوع کلام کے خلاف ہے۔ بے شبہ متقدمین بیش تر چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے لیکن لازمی نہ تھا۔ متاخرین کم تر تیسرے مصرع میں قافیہ لاتے ہیں۔ صاحبان ذوق صحیح جانتے ہیں کہ تیسرے مصرع میں قافیہ لانے سے رباعی کے چوتھے مصرع کی قوت تاثیر کم ہوجاتی ہے۔ وجدان سلیم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے زمانۂ حال میں بالارادہ تیسرا مصرع بے قافیہ کہا جاتا ہے۔

(نوٹ) 'معارف' اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پروفیسر تاثیر ایم اے اپنے نامۂ کیمبرج موسومہ علامہ ندوی میں عمر خیام پر ریویو کرتے ہوئے اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" مجھے یہ چار مصرعے رباعی کے نہیں معلوم ہوتے اور چوتھا مصرع غلط نقل ہوا ہے، است کی جگہ ہے چاہیے یوں مصرع (برگ گل سفید بہ گوئی بہ لالہ بر) نہ کہ ۔ (برگ گل سفید ست گوئی بہ لالہ بر) ۔ اور مستفعلن مفاعلن ہو۔ ۶ - بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے ۔ "

علامہ نے اسی نمبر میں اس کا جواب یہ دیا ہے :-

" آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کا وزن بحر ہزج کے عام اوزان رباعی میں سے نہیں ہے مگر اس کی جو تقطیع آپ نے کی ہے وہ صحیح نہیں ہے ۔ بحر رمل مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میرے علم میں نہیں آیا ہے اور نہ اس وزن کو اہلِ عروض نے اس بحر کے منشعبات میں شمار کیا ہے۔"

علامہ کو معلوم نہیں کہ پروفیسرانِ لاہور تاثیر وغیرہ نے قدیم عروض کی تمام قیود و قواعد کو حرفِ غلط کی طرح مٹاکر ایک نیا لندنی کیمبرجی عروض ایجاد کیا ہے اس نظم کا وزن مستفعلن مفاعلن اسی حدیث العہدِ عروض کے مطابق قائم کیا گیا ہے ۔ پروفیسر تاثیر کی اس جسارت پر حیرت ہے کہ جو شخص کسی نظم کا صحیح وزن دریافت نہ کرسکے اور حقیقی تقطیع نہ بتا سکے وہ کیمبرج یونی ورسٹی میں رہ کر یہ دعوا کرے کہ

رباعی کے اوزان کے متعلق مجھے خود مروجہ مسلّمات سے اختلاف ہے

یہ ہے زمانۂ حال کا رجحانِ عامہ کہ جو شخص جس فن کے مبادیات سے بھی واقف نہیں وہ اُس فن کے مسلّمات سے اتفاق نہیں رکھتا ۔

علامۂ محترم سے بھی مصرعِ ۔ برگِ گل سفید است گوئی بہ لالہ بر ۔ کی تقطیع کرنے میں ایک سہو ہوگیا ہے۔ آپ نے اس طرح تقطیع کی ہے برگ گ مفعول ل سپیدس فاعلاتن ت گوئی ب مفاعیل لالہ بر فاعلن ۔ فاعلاتن مفاعیل دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے فاعلات کے ساتھ مفاعیل اور فاعلاتن کے ساتھ مفعول آئے گا ۔ بحر مضارع دو رکن مفاعیلن اور فاع لاتن سے مرکب ہے مفاعیلن اخرب ہوکر مفعول ہوگیا ہے اور فاع لاتن مفروق مکفوف ہوکر فاعلات ہوگیا ہے اور تیسرا مفاعیل بھی مفاعیلن سے مکفوف ہوکر بنا ہے اور چوتھا رکن فاعلاتن سے محذوف فاعلن ہوگیا ہے اس طرح مفعول فاعلات مفعول فاعلن مضارع اخرب مکفوف ہے ۔ ارکان اوسط میں فاع لاتن سالم نہیں ہے بلکہ تسکینِ اوسط کے ذریعے سے فاعلات کی (ت) مفاعیل کے میم کے ساتھ مل کر فاعلاتم ہوگیا ہے

جس کو فاعلاتن سے بدل دیا گیا ہو اور مفاعیل کا میم فاعلات میں شامل ہوکر فاعیل رہ گیا ہو جس کو مفعول سے بدل دیا ہو اس طرح مفعول فاعلاتن مفعول فاعلن وزن قائم ہوا ہو۔ صحیح تقطیع یوں ہوگی۔ برگے گ مفعول لے سپیدس فاعلاتن گوئی ب مفعول لال برفاعلن۔ است کی رت، ساکنِ دوم ہونے کی وجہ سے گر جائے گی تقطیع میں محسوب نہ ہوگی علامہ نے رِت، تقطیع میں محسوب کرکے مفعول کو مفاعیل بنا لیا ہو یہ خیال نہ کیا کہ فاع لاتن اور مفاعیل کے باہم جمع ہونے سے مصرعِ ناموزوں ہوجاتا ہو اور وزن میں ایک حرف زیادہ ہوجاتا ہو۔

خیام صفحہ ۲۲۹ و ۲۳۰ لباب الالباب عوفی میں حنظلہ بادغیسی کی حسبِ ذیل دو بیتیں ملتی ہیں جو رباعی کے وزن پر ہیں ؎

یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند   از بہرِ چشم تا نہ رسد مرورا گزند

اورا سپند و آتشِ ناید ہمی بہ کار   با روے ہم چو آتش یا خال چو سپند

یہ دو بیتیں علامہ کا نتیجۂ تفحص ہیں۔ لباب الالباب عوفی میں رباعی کے نام سے درج نہیں ہیں ورنہ یہ نہیں کہا جاتا کہ دو بیتیں ملتی ہیں جو رباعی کے وزن پر ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہو کہ خود علامہ نے اِن دو بیتوں کا وزن رباعی کا وزن قرار دیا ہو حالاں کہ یہ بیتیں بحرِ ہزج اوزانِ رباعی میں سے کسی وزن پر بھی نہیں ہیں

(۲) اور ان کا وزن مضارع مثمن اخرب مکفوف ہو مفعول فاعلاتُ مفاعیل فاعلات۔ ان بیتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رباعی کی تاریخ رودکی بلکہ ابودلف اور ابن الکعب سے پہلے شروع ہوتی ہو اور سامانی بلکہ صفاریہ کے بجائے طاہری دربار کو اس کی اولیت کا فخر حاصل ہو اس لیے کہ یہ بیتیں رباعی کے وزن میں نہیں ہیں مزید علیہ بجاے چوسپند چوں سپند ہونا چاہیے نظم فارسی میں چو جو چوں کا مخفف ہو بر وزن خو، بُو بطور سبب خفیف استعمال نہیں ہوتا یعنی چو میں واو ملفوظہ نہیں ہو جس طرح اسی مصرع میں ہم چو آتش نظم ہوا ہو۔ یار ۔۔ مفعول ہیچ است فاعلات ش با خال مفاعیل چوں سپند فاعلات۔

(۳) 'خیام' صفحہ ۲۳۳ ؎

چشمم زغمت بہ ہر عقیقے کہ بہ سفت   بر چہر ہزار گل ز برازم بہ شگفت

رازے کہ دلم ز جاں ہمی داشت نہفت   اشکم بہ زبانِ حال با خلق بہ گفت

اس رباعی کا دوسرا مصرعِ ناموزوں ہو برازم میں باے موحدہ زائد از وزن ہو اور زاے منقوطہ کے ہوتے ہوے اس

کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہو۔ علامہ نے نقل مطابق اصل پر اکتفا کی نہ وزن کا لحاظ کیا نہ زبرازم کے پہلوے ذم کا۔ موجودہ شکل میں براز کے معنی غایط و فضلہ کے لیے جاسکتے ہیں اور یہ سخت ادبی مُساحمت ہو۔ صحیح مصرع اس طرح ہوسکتا ہو ؎ برچہر ہزار گل ز رازم بہ شگفت ۔ برچہر مفعول ہزار گل مفاعلن ز رازم بش مفاعیلن گفت فاع۔

(۴) خیام ص۲۳۶

"رباعی کے بحر کے بعض قطعات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہو کہ ہنوز رباعی فن کی زنجیروں میں جکڑی نہیں گئی تھی۔"

علامہ وزنِ رباعی میں کسی قطعے کا موزوں ہونا فن کی جکڑ بندی خیال فرماتے ہیں غالباً علامہ کے نزدیک رباعی کے وزن میں صرف رباعی ہی کہ سکتے ہیں اور کچھ نہیں کہنا چاہیے یہ خیال قطعی غلط ہو رباعی کے وزن میں ہمیشہ مختلف اصناف کی نظمیں کہی گئی ہیں اور کہی جاتی ہیں اور بہ روے فن اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہوسکتی۔ ابوطاہر خاتونی کے یہ اشعار رباعی کے وزن میں ہیں۔ ؎

استادگماں مبر کہ دل ریش نیم — از فعل تو نیک و زبداندیش نیم
درکیش تو آئین نکوکاری نیست — ایزد داند کہ من بدیں کیش نیم
تا کی برمن زنی ز بدفعلی لاف — گر تو گرگی بہ طبع من میش نیم
در نیکی و در بدی نیم ہم سر تو — بے خار نیم ولیک بانیش نیم
گفتی کہ چرا دوانی و باز پسی — زاں باز پسم کہ چوں تو درپیش نیم

گلستاں باب اول بیت ؎ آں را کہ بجاے تست ہر دم کرمے — عذرش بنہ ار کند بہ عمرے ستمے
مفعول مفاعلن مفاعیل فَعَل — مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

گلستاں باب دوم بیت ؎ ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستانست
مفعول مفاعلن مفاعیلن فع — مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

گلستاں باب دوم بیت ؎ شخصے ہمہ شب برسر بیمار گریست — چوں روز شد او بمرد و بیمار بزیست
مفعول مفاعیل مفاعیل فعول — مفعول مفاعلن مفاعیل فعول

ایضاً بیت ؎ عاجز باشد کہ دستِ قوت یابد — برخیزد و دستِ عاجزاں برتابد
مفعولن فاعلن مفاعیلن فع — مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

بہارستانِ جامی صفحہ نولکشوری بیت ؎ ہر لحظہ خورد ہزار سوگند دروغ زاں گونہ کہ اعرابی در بادیہ دوغ

مفعول مفاعلن مفاعیل فعول مفعولن مفاعیلن مفعول فعول

حقیقت یہ ہو کہ وزنِ رباعی میں ہر صنف نظم جائز ہو۔ رباعی وزنِ رباعی ہی میں کہی جاسکتی ہو دیگر بحور اوزان میں نہیں کہنا چاہیے معیار الاشعار محقق طوسی میں ہو کہ

"درغیر ترانہ (رباعی) چوں مقبوض آرند در ہمہ قصیدہ ہم چناں بود امادر ترانہ خلط مقبوض ومکفوف (مفاعلن ومفاعیل) بہ یک دیگر روا بود"

یعنی رباعی میں مفاعیل اور مفاعلن کا اجتماع جائز ہو لیکن جب وزنِ رباعی میں قصیدہ وغیرہ کہا جائے تو مفاعلن اور مفاعیل کا اجتماع جائز نہیں ہو یہ محقق کا ارشاد ہو لیکن یہ لازمی نہیں ہو پڑھیے سعدی ؎ شخصے ہمہ شب الخ اس میں مفاعلن اور مفاعیل کا اجتماع ہو۔ مقیاس الاشعار ص۲۲ مصنفہ مرزا اوج لکھنوی میں ہو۔ رباعی اِن اوزان سے مخصوص ہو لیکن یہ اوزانِ رباعی سے مخصوص نہیں بلکہ اِن اوزان میں قطعہ وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۵) خیام، ص۲۴۱ و ص۲۴۲

علامۂ محترم نے شیخ کے معاصر بابا طاہر ہمدانی کے مجموعۂ رباعیات (زبانِ دہقانی) میں سے حسبِ ذیل دو رباعیاں نقل فرمائی ہیں ؎

(۱) دلے دارم کہ بہبودش نہ می بو نصیحت مے کرم سودش نہ مے بو

بہ بادش مے دہم نش سپرہ باد بر آذر مے نہم دودش نہ مے بو

(۲) نسیمے کز بُنِ آں کاکل آید مرا خوش تر ز بوے سنبل آید

چو شوگیرم خیالت را در آغوش سحر از بسترم بوے گُل آید

یہ دونوں منظوم بھی رباعی کے وزن میں نہیں ہیں۔ ہزج مسدس محذوف یا مقصور۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل یا فعولن کے وزن پر ہیں۔ حیرت ہو کہ علامہ نے مسدس اور مثمن کے فرق کو بھی نظر انداز کردیا۔ یہ ایسی بات ہو پیش پا افتادہ کہ اس سے ہر لکھے پڑھے شخص کو واقف ہونا چاہیے۔

(۶) خیام ص۲۴۴ — علامہ نے باخرزی کی یہ رباعی عوفی سے نقل کی ہو ؎

"خصمم تو اگر باز ندارد ز تو جنگ صد گونہ براے تو برامیزم رنگ
بنشینم اگر کار بنامست و بہ ننگ برآتش چو کباب و برتیغ چو زنگ"

معنی و مفہوم سے قطع نظر کرکے اس رباعی کا چوتھا مصرع ناموزوں ہی اس کی تقطیع دو طرح ہوسکتی ہی (۱) برآتش مفعولن چ کباب فعلات برتیغ مفعول چ زنگ فعول (۲) برآتش مفعولن چ کبابو فعلاتن برتیغ مفعول چ زنگ فعول یہ دونوں وزن عروضی نہیں ہیں۔ علامہ نے صرف نقل مطابق اصل کو ہی اپنا فرض سمجھا۔ اور موزونیت و ناموزونیت کو فرائضِ ادبی نہیں سمجھا اگر علامہ غور و خوض کو کام فرماتے تو چوتھے مصرع کو صحیح طور پر اس طرح نقل کرسکتے تھے۔ ع

برآتش چون کباب و برتیغ چو زنگ

یعنی بجاے چو کباب چون کباب لکھنے سے مصرع موزوں ہوجاتا ہی چو ہمیشہ بہ سقوطِ واو ہی مستعمل ہوتا ہی جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہی اب وزن درست ہوکر اس طرح تقطیع ہوگی۔ برآتش مفعولن چؤ کبا فاعلن ب برتیغ مفاعیل چ زنگ فعول۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فعول۔ ہزجِ مثمن اخرم اشتر مکفوف ازل۔

اصل یہ ہی کہ مفعولن کے بعد ہمیشہ مفعولن، مفعول، فاعلن ہی آئے گا۔ کبھی مفاعیل مفاعلن مفاعیلن نہیں آئےگا۔ اور مفعول کے بعد ہمیشہ مفاعلن مفاعیل مفاعیلن آئے گا۔ مفعولن مفعول فاعلن نہیں آئےگا۔ اس کے خلاف ہوگا تو مصرع ناموزوں ہوجائے گا۔

(۷) "خیام"، صفحہ ۲۵۶ حاشیہ

"اورینٹل لائبریری پٹنہ ع ۲۳۳ پر رشید الدین وطواط (المتوفی ۵۷۳ھ) کی طرف منسوب عروض کا ایک منظوم فارسی رسالہ ہی جس کا نام اقسام البحور (اقسام البحور) لکھا ہی اس میں ایک ایک دو دو شعروں میں ہر بحر کو بیان کیا ہی اس میں بحرِ ہزج کی نسبت جو رباعی کا وزن ہی حسبِ ذیل دو شعر ہیں ؎

در بحرِ ہزج زحاف بسیار آید ایں وزن بہر بدیہہ بکار آید
بمفعول مفاعلن فعولن فعلن تقطیع کنی ہمہ پدیدار آید

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ رباعی کا اصل استعمال بدیہہ گوئی کے موقع پر تھا۔"

یہ امر تو ہمارے مطمحِ نظر سے خارج ہی کہ رباعی کا اصل استعمال بدیہہ گوئی کے موقع پر تھا یا نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ کہنا ہی کہ وہ رسالہ جس میں بحرِ ہزج کی نسبت جو رباعی کا وزن ہی نہ وہ رشید الدین وطواط کا ہوسکتا ہی نہ

رشید الدین وطواط رباعی کا وزن، مفعول مفاعلن فعولن فعلن قرار دے سکتا ہے۔

یہ دونوں شعر وزنِ رباعی میں جو کسی ناواقفِ فن مبتدی کے ہیں، ہرگز رشید الدین وطواط جیسے گراں پایہ مسلّم الثبوت ماہرِ فن اُستاد کی تصنیف نہیں ہو سکتے جس کی نسبت "آتش کدہ آذر" اخگرِ دوم میں ہے:۔

"مرد فاضلے و از علم بہرہ داشتہ و در فنونِ شعر کامل مہارت داشتہ رسالہ در قواعدِ شعر نوشتہ۔ بسیار سخن آفرین و حریف حرف بودہ۔"

دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے (ذکر افضل الفضلا رشید وطواط)

"وہو رشید الدین محمد بن عبد الجلیل الکاتب العمری کتب او بہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہٗ می رسد فاضل و ادیب ذو فنون بودہ و بزرگ واری و فضل ہم گناں معترفند در روزگار خود اُستاد فرقۂ شعرا و فصحا بودہ شعراے اطراف از دور و نزدیک قصدِ ملازمت او می کردند و بہ استفادہ شعر و دیگر علوم مشغول بودہ اند او را در شاعری جاہ و مراتب عظیم دست دادہ مردے تیز زبان و فصیح بودہ در سخن شعراے اطراف تخطیہ گرفتے بیش تر شعرا با او خوش نہ بودند۔ اکثر او را ہجوہاے رکیک گفتہ انداز غایتِ حسد۔ اما ساحت او ازیں افترایات مبراست در فضل او ہیچ سخن نیست۔ و او را در علمِ بیان و معانی تصانیفِ مرغوب است۔ کتاب حدایق السحر از تصنیفات اوست کہ در صنائع علم شعر ازاں مفید تر نہ ساختند۔"

بہارستانِ جامی میں ہے:۔

"در وقت خود اُستاد شعراے مقدم و پیشواے آں طبقہ بود کتاب حدایق السحر تصنیفِ اوست۔"

مرآۃ الخیال شیر خاں لودی میں ہے:۔

"فاضل و ادیب ذو فنون تیز زبان و فصیح بودہ او را در علمِ عروض و قوافی رسالہ الیست موسوم بہ حدایق السحر ہر کس کہ آں را مطالعہ نماید بر علم و فضل او گواہی تواند داد۔"

کیا ایسے جلیل المنزلت اُستاد سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ مفعول مفاعلن فعولن فعلن رباعی کا وزن قرار دے۔ فعولن اور فعلن دونوں بحرِ ہزج کے منشعبات میں سے نہیں ہیں۔ رباعی کے چوبیس وزن جن ارکانِ عشرہ سے مرکب ہوتے ہیں ان میں نہ فعولن ہے نہ فعلن۔ رباعی کے فروعِ عشرہ یہ ہیں:۔

مفاعیلن[1] سالم مفاعلن[2] مقبوض مفاعیل[3] مکفوف مفعولن[4] اخرم مفعول[5] اخرب مفاعلن[6] اشتر فعول[7] ازل فعل[8] مجبوب فاع[9] ازل مختق فع[10] مجبوب مختق۔ انھی ارکانِ عشرہ کی تاخیر و تقدیم سے چوبیس وزن رباعی کے بنتے ہیں۔

مفتی مولانا سعداللہ مصنفِ میزان الافکار شرحِ معیار الاشعار' اپنے رسالۂ رباعی میں لکھتے ہیں :-

" اما انچہ سیفی در عروض خود از بعض عروضیاں نقل کردہ کہ اوزانِ رباعی تا بدہ ہزار می رسد مقصود قائلش نہ ایں وزن ہاست کہ از اخلاط اوزان بست و چہار گانہ اوردہ شد۔ بل ازاں دیگر خارج از بست و چہار گانہ و اخلاط آں و لہذا گفتہ ازاں جملہ ایں ست۔ مفعول مفاعلن فعولن فعلن ۔ و ظاہر است کہ ایں وزن در اوزان مسطورہ داخل نیست اما چوں ایں قولش مخالف تصریحات اہلِ فن ست کہ اوزانِ بسیطہ' رباعی را منحصر در بست و چہار داشتہ اند اعتبار را نشاید و کیف لا کہ نزد شاں فعلن در عروض رباعی واقع نہ می شود بل فعلن و فعولن ہر دو از ارکان رباعی مطلقا نیستند ۔"

'مقیاس الاشعار' میں مرزا آوج لکھنوی نے تفصیل سے لکھ دیا ہے :-

" اہلِ فن نے رباعی کو چوبیس وزنوں میں منحصر رکھا ہے۔ لیکن بعض ناواقفوں نے اپنے عدمِ وقوف کی جہت سے چند اوزانِ رباعی اور بھی نکالے ہیں ان میں سے ایک وزن مفعول مفاعلن فعولن فعلن ہے۔ چناں چہ وہ اس مصرع کی (کیا کیا نہ فلک نے خاک چھانی میری) اسی وزن پر تقطیع کرتے ہیں حالاں کہ ان کی یہ صریح غلطی ہے اس مصرع کا وزن (مفعول مفاعلن مفاعیلن فع) ہے انھوں نے بہ وجہ ناواقفی ایک سبب کم کرکے مفاعیلن کو فعولن بنایا اور اس سبب کو فع سے ملا کر فعلن کرلیا اور یہ نہ خیال کیا کہ رباعی میں فعولن اور فعلن کہیں نہیں آیا۔ بلکہ فعولن فعلن پر کیا حصر ہے کوئی رکن سوا دس ارکان مذکورہ بالا کے نہیں آسکتا۔ الغرض کوئی رباعی ایسی نہیں جو چوبیس اوزانِ مذکورہ بالا سے خارج ہو اور اگر ہو تو اس کو رباعی نہ کہنا چاہیے۔ کیوں کہ رباعی ان اوزان سے مخصوص ہے لیکن یہ اوزان رباعی سے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ ان اوزان میں قطعہ وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔" صلہ۲۲

فنِ عروض و قافیہ پر جو کتابیں متاخرینِ عروض نے لکھی ہیں ان میں وطواط کی' حدایق السحر' کا اکثر حوالہ ہے' حدایق السحر' ایک قدیم و مستند ماخذِ عروض ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی مرحوم نے اپنے مبسوط رسالہ قافیہ کافی در علمِ قوافی میں لکھا ہے :-

"مسمطات را صاحب مجمع الصنائع و رشیدالدین وطواط صاحب حدایق السحر و صفی الدین حلی و عزیزالدین موصلی و جمع غفیر از فحول علما در صنائع بدیعی آوردہ اند"

مولانا غیاث الدین صاحب غیاث اللغات نے اپنے رسالۂ معراج العروض' میں لکھا ہے :-

" لہذا از منہاج العروض کہ مستخرج است از رسالہ ضیاءالدین خزرجی و حدایق السحر رشید وطواط و معیار الاشعار خواجہ

نصیر الدین طوسی در رسالہ سلمان ساوجی و ہم حدایق البلاغت و عروض سیفی و حدائق العجم محمد بن القیس و رسالہ شمس الدین فقیر و تشریح الحروف وغیرہ مقدمات ضروری انتخاب نمودہ شد۔"

اس کے بعد بھی کیا کوئی دیدہ ور نکتہ شناس یقین کرسکتا ہو کہ فاضلِ اجل استاد رشید الدین وطواط اوزانِ رباعی میں فعولن فعلن لاسکتا ہو۔ ہماری راے ہو کہ یہ رسالہ کسی نا اہل ناواقف شخص کی تالیف ہو اور کسی کاتب نے اس پر رشید وطواط کا نام لکھ دیا ہو۔ اس نام کی کوئی کتاب رشید وطواط کی نہیں اگر ہوتی تو اس کی تصانیف کے سلسلے میں اس کا نام بھی کہیں آتا خود رباعی بھی مہمل ہو۔ مفعولن مفاعلن کی تقطیع کرنے سے تمام اوزان بحرِ ہزج کیوں کر نکل سکتے ہیں ہزج کے تقریباً ۸۰ وزن ہیں۔

ہم اس مضمون کو اسی جگہ ختم کرتے ہیں ہماری راے ہو کہ علامۂ محترم سید سلیمان صاحب ندوی نے کتاب اقسام البحور کو رشید وطواط کی تالیف قرار دینے میں اور خیام کی تصنیف میں جہاں تک علمِ عروض کا تعلق ہو حزم و احتیاط سے کام نہیں لیا۔ ایک فاضل ادیب سے ہم کو یہ توقع نہ تھی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علاوہ ازیں رباعی کا دوسرا مصرع ۶ (ایں وزن بہر بدیہہ درکار آید) ناموزوں بھی ہو تقطیع ای وزن مفعول بہر بدی مفتعلن ہ درکار امفاعیلن یدفع بہر بدی کو خواہ مفتعلن کے وزن پر لیجیے خواہ مستفعلن کے وزن پر مگر وہ وزن رباعی کا نہ ہوگا اور بہر کو بوزن بہ ہر بہ حرکت با وہا و سکون را بمعنی ہمہ پڑھا جائے تو وزنِ عروضی تو درست ہوگا لیکن مصرع مہمل ہوجائے گا اور اس سے یہ مفہوم ادا نہ ہوسکے گا کہ رباعی کا اصل استعمال بدیہہ گوئی کے موقع پر تھا۔

طربیۂ خداوندی

دانتے کی مشہورِ عالم کتاب "ڈیوائنا کامیڈیا" کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ اصل اطالوی زبان سے جس میں مصنف نے دوزخ و جنت کا خیالی نقشہ کھینچا ہو، اور ان کے مختلف طبقوں میں جس قسم کے لوگ ہیں ان کا ذکر کیا ہو۔ بہت ہی دلچسپ کتاب ہو۔ اور خاص بات یہ ہو کہ دانتے باوجودے کہ عیسائی تھا اس کا جنت و دوزخ کا تخیل اسلامی تخیل سے زیادہ قریب ہو اور اعراف کا بیان بھی جو عیسائی تخیل میں موجود نہیں ہو۔ حصہ اول (دوزخ) قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد سے،

منیجر انجمنِ ترقیٔ اردو (ہند) دہلی

ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں اُردو

داستان گو۔ داستان گوئی۔ اس کا مستقبل

(از جناب حیات اللہ صاحب انصاری)

آج کل، جب کہ سنیما اور ریڈیو نے رنگیں سین سینریوں، بھڑکیلے لباسوں اور جگمگاتے تاج و تخت والی تھیٹر کی کمپنیوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا ہو، اگر میں کہوں کہ داستان گوئی اور داستان گو کا وجود باقی ہو تو پڑھنے والوں کو یقین نہ آئے گا۔ داستان گوئی کو تو ناقدری کا شکار ہوئے دس بیس نہیں، کم و بیش پچاس برس کا زمانہ گزر چکا۔ اس فن کے آخری نام لیوا میر باقر علی دہلوی تھے۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح زمانے کی ناقدری کا مقابلہ کرلیا لیکن ان کے بعد پھر ان کا جانشین کوئی نہیں ہوا۔ لکھنؤ میں یہ فن ان سے پہلے مٹ چکا تھا۔ ایک آدھ غیر مستند داستان گو جو زندہ تھے وہ قبر سے پہلے گم نامی میں دفن ہوچکے تھے۔ ایک طرف تھیٹر اس فن کو ماند کر رہا تھا، تو دوسری طرف چھاپے خانے 'طلسمِ ہوش ربا'، 'بوستانِ خیال' اور ناولوں پر ناولیں چھاپتے چلے جاتے تھے۔ شوقین ان کو خود بھی پڑھتے تھے اور دوسروں سے پڑھوا کر سُنتے بھی تھے۔ پھر وہ اگلی صحبتیں بھی باقی نہ رہی تھیں کہ مسند پر رئیس اور اس کے دوست احباب نیم دراز ہیں مصاحبین جمع ہیں، پیچوان لگے ہوئے ہیں، جھاڑ اور فانوس جگمگا رہے ہیں اور داستان گو اپنی زبان سے سلطنتوں کے عروج و زوال، طلسمِ ہوش ربا کی معرکہ آرائیوں اور شیخ چلی کی حماقتوں کی تصویریں بناتا چلا جارہا ہو۔ کہیں کوئی فقرہ پسند آگیا تو رئیس نے دوشالہ نذر کردیا۔ جاگیرداری دَور کی رونقیں ختم ہوچکی تھیں رئیسوں کے خزانے خالی تھے، اور وہ فرصت کے رات و دن بھی نہ رہے تھے۔ بھلا داستان گوئی جیتی، تو کس آب و ہوا میں جیتی۔

لیکن نہیں۔ آج ۱۹۴۵ء میں بھی داستان گوئی زندہ ہو۔ اور سنیما اور ریڈیو کے پہلو بہ پہلو وہ بھی اپنا کارخانہ چلارہی

ہے. کن اسباب نے اس کا ساتھ دیا ہے، اور آیندہ اس کی زندگی کی کتنی امید ہے، اس پر بحث کرنے سے پہلے مناسب ہو کہ داستان گو سے پڑھنے والوں کا تعارف کرادیا جائے۔ کیوں کہ یہ اشتیاق کہ آخر وہ کیا جادو کرتا ہے جو بھری محفل کو گھنٹوں اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے اور کسی ملد بات کے سُننے کی مہلت نہیں دیتا ہے۔

۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کی رات ہے۔ فیض آباد کے ایک کالج کے ہال میں، سامنے اسٹیج پر، داستان گو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ پچاس سے کچھ اوپر سن، ساڑھے پانچ فٹ کے لگ بھگ قد، چھریرا بدن، سانولا رنگ، پچکے گال، چند دانت ٹوٹے ہوئے، چہرے پر زندگی کی سخت کش مکش کے بنائے ہوئے خطوط، نہ آنکھوں میں کوئی خاص رونق، اور نہ آواز میں کوئی خاص جھنکار۔ نیکر، آدھی آستین کی قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے۔ تینوں کے تینوں سیاہ رنگ کی۔ واسکٹ میں ہار کی طرح بہت سے رو پہلے تمغے لٹکتے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک ڈیڑھ فٹ کا ڈنڈا۔ یہ ہے داستان گو۔

اب سُنیئے اس کا ساز و سامان۔ اس کی کرسی کے برابر تین معمولی گویّے ڈھولک لیے بیٹھے ہیں۔ داستان گو نے خبر دے دی ہے کہ اس کی داستان کئی ٹکڑوں میں بیان ہوگی۔ ہر ٹکڑے کے بیچ میں پانچ چھ منٹ کا وقفہ ہوگا۔ اسی وقفے میں تماشائی گانا سُنیں گے۔

داستان گو کے تماشائی ڈھائی تین سو کے قریب ہیں۔ ان میں کالج کے پروفیسر اور اُردو ہندی اسکولوں کے مدرّسین ہیں جو اسی کالج میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہ مدرّسین بیس سال سے لے کر پچاس برس تک کے سن کے ہیں۔ سنیما اور نوٹنکی دیکھتے رہتے ہیں۔

داستان سے پہلے گانا شروع ہوتا ہے۔ دس منٹ تک گانا ہوتا ہے۔ پھر داستان گو سیٹی بجاتا ہے۔ گانا بند ہو جاتا ہے۔ تماشائیوں کی آنکھیں گانے والوں سے اس کی طرف گھوم جاتی ہیں۔ داستان گو کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور یوں شروع کرتا ہے:-

یہاں نہ پردا ہے اور نہ اسکرین۔ نہ تھیٹر ہے اور نہ سنیما۔ ایک سیدھا سادھا قصّہ ہے جو میں آپ سے بیان کروں گا۔ یہ ریاست کشمیر کا ایک سچّا واقعہ ہے .... داستان کے چار حصّے ہیں، پہلا کچھ زیادہ دل چسپ نہیں ہے۔ دوسرا اس سے زیادہ دل چسپ ہے اور ختم کے قریب تو قصّہ اتنا مزے دار ہے کہ اگر آپ لوگ تالیاں نہ بجائیں تو میرا ذمّہ۔

ریاست کشمیر کا ایک راجا تھا جس کا نام چندرسین تھا۔ اس کو خدا نے سب کچھ دیا تھا سوائے اولاد کے۔ یہاں پہنچ کر داستان رُک جاتی ہے اور ایک چھوٹی سی تقریر ہوتی ہے کہ یہ بھی مالک کی عجیب دین ہے کہ جس کے پاس پیسہ ہے اس کے

گھر اولاد نہیں ۔ اور جو بچارے پیسے پیسے کو محتاج ہیں ان کے گھر اولاد کا جو سلسلہ چلتا ہو تو گنے کا نام نہیں لیتا ۔ دُور کیوں جائیے اپنے پڑوس کے راجا . . . کو دیکھ لیجیے ۔ بچارے بے اولاد کے ہیں ۔

داستان گو نے کثرتِ اولاد کی تصویر ایسی کھینچی کہ تماشائی کھِل کھلاکر ہنس پڑے ۔ اس تقریر نے تکلف کا وہ حجاب جو داستان گو اور تماشائیوں کے بیچ میں دونوں کے ایک دُوسرے سے اجنبی ہونے کی وجہ سے حائل تھا توڑ دیا ۔ اس کے علاوہ روزمرہ کی زندگی اور پڑوس کے راجا کی مثالوں نے داستان کو واقعیت سے قریب کردیا ۔ اور تماشائیوں کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ داستان گو خیالی داستان نہیں ، بلکہ واقعہ بیان کررہا ہو ۔

داستان شروع ہوگئی ۔ عشق و محبت کی کشمکش شامل ہوئی ۔ راجا کے لے الک بیٹے نے عشق میں اندھے ہوکر اپنے مُنھ بولے باپ کے ساتھ غدّاری کی اس کو مع اس کی دونوں بیویوں کے قتل کرادیا ۔ لیکن اتّفاق ایسا ہوا کہ اس کے دونوں دودھ پیتے بچّوں کو لے کر دائیاں بھاگ گئیں ۔ ان بچّوں نے الگ الگ پرورش پائی ۔ ایک جنگل کے ایک سردار کا مُنھ بولا بیٹا تھا اور دُوسرا ڈاکوؤں کے سردار کے گھر پل کر ڈاکو بنا ۔ دونوں ایک دُوسرے کو نہیں جانتے تھے ۔ پھر اتّفاقات اور حُسنِ اتفاقات نے ایسے پلٹے کھائے کہ بڑا راج کمار اپنے پتا کے قاتل اور اس کے غدّار منھ بولے بیٹے کی فوج کا افسر بنا ۔ پھر اپنے بھائی کو جو لاعلمی کی حالت میں ڈاکو بنا ڈاکا ڈالتا پھرتا تھا ، گرفتار کر لایا ۔ دربار میں ڈاکو کا مقدمہ پیش ہوا ۔ غاصب راجا نے راج کمار کو ایک مصلحت سے تھوڑی دیر کے لیے تخت پر بٹھایا اور ڈاکو کے مقدمے کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا ۔ اسی دربار میں یہ بھید کُھلا کہ یہ دونوں لڑکے مقتول راجا کے بیٹے ہیں ۔ فوج اور رعایا میں راج کمار پہلے ہی سے بہت ہردل عزیز تھا ۔ یہ خبر سُن کر سب اسی کے ساتھ ہوگئے ۔ غدّاروں کو سزا ملی اور حق داروں کو تخت ۔

غدّار لے پالک کا عشق کا جنون ، راجا اور رانیوں کا قتل ۔ کھلائیوں کی وفاداری ۔ بڑے راج کمار کی بہادری حُسنِ اتفاقات کی کارستانیاں اور آخر میں داستان کا نقطۂ عروج یعنی دربار کا سین یہ سب چیزیں داستان کے کامیاب عناصر تھے ۔ اور ایسا ہی جیسا کہ داستان گو نے کہا تھا ۔ یعنی نقطۂ عروج پر ، جہاں ایک راج کمار نے دُوسرے کو پہچانا ہو ۔ تماشائیوں نے داستان گو کی فرمایش بے اختیار پوری کی یعنی تالیاں بجادیں ۔

تماشائیوں کے جذبات ڈھائی گھنٹے تک داستان کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ حرکت کرتے رہے تھے ۔ کہیں تو تماشائی کھِل کھلاکر ہنس پڑتے تھے اور کہیں شدّتِ اشتیاق سے بُت بن جاتے تھے ۔ کہیں سکون بخش مسرت سے مُسکرانے لگتے

تو کہیں آب دیدہ ہو جاتے۔ داستان کے بیچ میں کامک کے طور پر دس منٹ کا ایک چٹکلا بھی آیا تھا۔ چٹکلا بھی اچھا تھا اور جس موقع و محل پر آیا تھا وہاں نگینے کی طرح جم گیا تھا۔ جب داستان ختم ہوئی ہو تو تماشائی سیر تھے۔ نہ تو انھیں یہ حسرت رہ گئی تھی کہ داستان ابھی اور چلتی اور نہ یہ کوفت کہ مزا نہ آیا۔

اب ذرا داستان گوئی کی ٹکنیک پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ داستان گو نے وقائع نگار کے انداز میں داستان شروع کی تھی۔ یہ کہہ کر کہ یہ ایک سچا واقعہ ہو۔ اور پھر اس انداز کو برقرار رکھنے کے لیے اسی قسم کے فقرے استعمال کرتا جاتا تھا۔

"لکھا ہو کہ پانچ قطرے آنسوؤں کے کھلائی کے چہرے پر گرے ...."

"لکھا ہو کہ ایسا رَن پڑا کہ ......"

داستان، داستان تھی۔ یعنی اس میں افسانے اور ناول کی طرح ایسی جزئی اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں نہ تھیں جو قدم قدم پر یاد دلائی جاتیں یہ اس قصّے کی دُنیا بھی ہماری دُنیا ہو اور کردار بھی یہیں کے آدمی۔ جب داستان کے سُننے والے کے دِل سے یہ بات دُور نہ ہو جائے کہ کہنے والا محض ہوائی قلعے بنا رہا ہو، داستان میں زور نہیں آسکتا ہو۔ یہ بات داستان گو نے مذکورہ بالا فقروں کی مدد سے پیدا کی تھی' یا پھر کئی جگہ یہ بتا کر کہ یہ اورنگ زیب کی حکومت کا زمانہ تھا۔ اور ایسے ایسے تاریخی حالات تھے۔

داستان گو کا جو وقائع نگاری کا انداز تھا وہ خشک رپورٹر کا انداز نہ تھا۔ بلکہ ایسے وقائع نگار کا تھا جس نے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔ اشخاصِ واقعہ سے ملا ہو۔ ان کے خیالات و جذبات تک کو محسوس کیا ہو۔

داستان گو محض وقائع نگار یا راوی ہی نہیں تھا۔ وہ ایکٹر بھی تھا۔ حسین راج کماری کی مصیبتیں بیان کرتے کرتے، اک دم سے واسکٹ کی جیب سے ایک جگ مگاتی ہوئی چھری نکال لیتا اور راج کماری کا پارٹ ادا کرنے لگتا کہ کس طرح وہ خودکشی کے لیے آمادہ ہوگئی اور پھر اس نے اپنی ایک سہیلی سے کیسے باتیں کیں۔ میدانِ جنگ کا حال بیان کرتے کرتے وہ تلوار کھینچ لیتا (داستان گو کے ہاتھ میں جو ڈنڈا تھا وہ دراصل گپتی تھی۔ اسی کو نکال کر وہ میان سے تلوار نکال لینے کا اثر پیدا کرتا تھا) کہیں کہیں کسی کردار کا پارٹ ادا کرنے میں رونے بھی لگتا تھا۔ تو کبھی غصّے میں آجاتا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

داستان گو کی ان دو حیثیتوں کے علاوہ ایک تیسری حیثیت بھی تھی۔ وہ تھی ایک معمولی سوجھ بوجھ والے تماشائی کی۔

وقائع نگار اور ایکٹر کی بلندی سے وہ اک دم سے تماشائی بن کر اپنے کرداروں یا واقعات پر کوئی ایسا جملہ کس دیتا تھا جو داستان میں شہاب ثاقب کی طرح چمک جاتا تھا۔ یہ بات مثال کے بغیر واضح نہیں ہوسکتی ہے۔ داستان میں ایک جگہ راج کمار کو خطرہ ہے کہ دشمن شب کو مجھے قتل کرنے آئے گا۔ داستان گو راوی کی طرح اس خطرے کو بیان کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ راج کمار نے اپنے گھوڑے کو بلایا اور اس سے کہا

"اے میرے یارِ وفادار ...."

گھوڑے سے خطاب کرتے وقت داستان گو ایکٹر بن کر راج کمار کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ اور گھوڑے سے کہتا ہے کہ تو میرے خیمے کی حفاظت کر۔ اب گھوڑے نے کیا کیا۔ یہ پہلو داستان گو نہ وقائع نگار بن کر کہتا ہے اور نہ ایکٹر بلکہ ایک سادہ مزاج دہاتی تماشائی بن کر، جو ساری زندگی گھوڑے کو بیل کی طرح کا بے وقوف جانور سمجھتا رہا ہے۔ جب وہ راج کمار کو گھوڑے سے بات چیت کرتے دیکھ رہا تھا تو اسے ذرا امید نہیں تھی کہ گھوڑا اسے سمجھے گا۔ نہ کہ یہ کہ وہ اس پر عمل بھی کرے گا۔ لیکن جب وہ گھوڑے کو عمل کرتے دیکھتا ہے تو حیرت زدہ ہوجاتا ہے، اور خوش بھی ہوتا ہے کہ اس طرح راج کمار کی جان بچ گئی۔ داستان گو اس جگہ صرف ایک فقرہ دہاتی لہجے میں کہتا ہے اور اسی میں تماشائی کا کردار، مزاج اور خیال سب کچھ آجاتا ہے۔

"ارے۔ او گھوڑا تو خیمے کی ٹٹی بن گوا۔"

داستان سننے والے اس فقرے پر کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ اگر ایسی معمولی تماشائی ذہنیت سے اس واقعے کو نہ دیکھا جاتا تو گھوڑے کی سمجھ داری اور وفاداری میں اتنا اثر نہ پیدا ہوتا۔

لکھنؤ کے پرانے داستان گو قصّے کے ڈرامائی پن کی طرف جتنی توجہ دیتے تھے اتنی ہی بلکہ اکثر اس سے زیادہ باغوں محلوں اور درباروں کے بیان کی طرف توجہ دیتے تھے۔ زبان کو شگفتہ بنانے کے لیے کہیں کہیں اسے مقفّیٰ اور مسجّع بھی بناتے رہتے تھے۔ ضلع جگت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ داستان میں شعر و شاعری اور غزل خوانی بھی ہوتی رہتی تھی ان باتوں سے داستان گو کی قادرالکلامی تو ثابت ہوجاتی تھی مگر داستان کا اصل زور گھٹ جاتا تھا۔ لیکن لوگوں کو یہ کمی محسوس تک نہ ہوتی تھی۔ کیوں کہ تب نہ ناولیں تھیں نہ سینما اور تھیٹر اور نہ طلسم ہوش ربا کی چھپی ہوئی جلدیں۔ لوگوں کا ذوق بہت معمولی تھا۔ واقعے میں ذرا سی بھی تیزی ہو، سننے والے متاثر ہوجاتے تھے۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اگر پرانے داستان گو اب پھر زندہ ہوجائیں اور اسی ڈھنگ پر داستان کہیں تو لوگ سنتے سنتے سوجائیں۔ لیکن داستان گو مذکور

نے اپنی ٹکنیک کو زمانے کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس کے بیان میں کہیں بے جا طول نہیں تھا۔ اور نہ بے جا اظہارِ قادر الکلامی۔ اس کی داستان کا زور اصل کردار پر رہتا ہے۔

داستان گو مذکور نے زمانے کے مطابق نئی داستانیں بھی تیار کرلی ہیں۔ مثلاً بہرام کی بیٹی۔ اور موجودہ زمانے کے چٹکلے بھی اس کو آتے تھے۔

اب ذرا فنی حیثیت سے داستان گو کی داستان اور ٹکنیک پر نظر ڈال لیجیے :-

داستان کا قصہ جس طرز کا تھا اور جس رفتار سے چلا ہے وہ ایسی پامال چیزیں ہیں کہ اب سُننے والوں کے لیے ان میں کوئی خاص بات نہیں رہ گئی ہے۔ اب لوگوں کے مزاج میں زیادہ سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے شیخ چلی کے لطیفوں اور حکایات بیربل کی کوئی قدر نہیں رہی۔ لوگ ایسی باتیں سُننا چاہتے ہیں جو زندگی کے اصل حالات سے ملتی جلتی نہ ہوں تو کم از کم قریب تو ہوں وہ چاہتے ہیں کہ قصے کے کردار بھی انھی مسئلوں میں اُلجھیں جن میں خود اُلجھے ہوئے ہیں، اور پھر مسئلوں کا اس طرح مقابلہ کریں جیسے مقابلے کی ان کے دل میں تمنا ہے۔ لوگوں کے مزاجوں میں رومان کی بھوک ہے ضرور، مگر ایسی نہیں جو حقیقت کو بالکل فراموش کردے۔ مذکورہ داستان کے قصے میں محض رومان ہی رومان تھا اس لیے سُننے والے کہیں بھی پوری طرح سنجیدہ نہیں ہوئے۔ یعنی قصے کو اپنا بیتا ہوا واقعہ سمجھنے پر ان کا دِل آمادہ نہیں ہوا۔ اس وجہ سے جیسا چاہیے ویسا متاثر بھی نہیں ہوئے۔

داستان گو نے سنجیدہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جا بجا چھوٹی موٹی نصیحتیں اور تقریریں بھی شامل کردی تھیں اور اس کا فائدہ بھی ہوا تھا یعنی سنجیدہ لوگوں کی توجہ اُکھڑنے نہیں پائی۔ لیکن پھر بھی اصل داستان دماغ کی گہرائی میں نہیں اُتر سکی۔

داستان گو کو کردار نگاری میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے سب کردار ایک سے تھے، یعنی بے جان حرکات و سکنات کے پُتلے۔ فرق صرف یہ تھا کہ کسی سے اچھی حرکتیں سرزد ہوتی تھیں اور کسی سے بُری۔ اسی طرح داستان گو میں جزئیات نگاری بھی نہ تھی۔ وہ مردوں اور عورتوں کے حرکات و سکنات میں فرق نہیں پیدا کرسکا۔ رنج و خوشی، غصہ و جوش کسی جذبے کی تصویرکشی میں کسی ایسے جزیے کی طرف اشارہ نہ کرسکا جس سے ہم جذبے کو اپنے میں محسوس کرسکتے۔ اس نے جو تصویر بھی بنائی موٹے خطوں سے بنائی۔

ان عیوب کی وجہ یہ ہے کہ داستان گو زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اس کے قصے گوئی کی بنیاد صرف دو باتوں پر تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ قصے سے خود متاثر ہوجاتا تھا۔ جس سے ایسی فضا پیدا ہوجاتی تھی جو اس قصے کے لیے بہت موزوں ہوتی

تھی۔ اور دُوسری بات یہ کہ وہ سُننے والوں کا رُخ دیکھ لیتا تھا اور اسی کے موافق قصّے کو سنبھالتا چلتا تھا۔

داستان گو کی زبان بھی قابلِ تعریف نہ تھی۔ زبان میں روانی تھی لیکن منجھی ہوئی نہ تھی۔ اسے مطلب کے ادا کرنے پر عبور تھا لیکن شاعرانہ پن یک سر ناپید تھا۔

داستان گو کی یہ جدت قابلِ تعریف ہے کہ وہ اثرات پیدا کرنے کے لیے اپنے ساتھ چُھری اور گُپتی بھی لاتا تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اگر ایسا سامان زیادہ ہوتا تو دیکھنے والوں کو تکمیل کے بجائے کمی کا احساس ہونے لگتا۔ کیوں کہ پھر داستان ڈرامے کی سرحد میں داخل ہوجاتی۔ اور وہاں پہنچتے ہی سب سے بڑی کمی یہ نظر آتی کہ اس میں ایکٹرس نہیں ہے۔ اور پھر تو ہر طرف کمی ہی کمی نظر آتی۔ لیکن اس پر بھی ایسا ممکن ہے کہ داستان داستان ہی رہے اور اس میں اور اثر پیدا کرنے والی چیزیں بلا دی جائیں۔ مثلاً چمک دار ٹوپی تاج کے لیے۔ ایک پھول دار گملا باغ کے لیے۔ یہ ایسے اشارے ہیں جو داستان کو ڈرامے میں داخل نہیں کریں گے۔

داستان گو کہیں کہیں گاتا بھی تھا۔ لیکن یہ گانا بہت معمولی تھا۔ اگر اس کے بجائے ایسا ہوتا کہ اس کے ساتھ کے گویے اچھے ہوتے۔ اور جب گانے کی ضرورت ہوتی تب وہ گانے لگتے تو داستان کا لُطف بڑھ جاتا۔

داستان گو کا لباس بھی ترمیم طلب ہے۔ بظاہر اس نے نیکر اور آدھی آستین کی قمیص اسی لیے پہنی تھی تاکہ وہ "اپ ٹوڈیٹ" نظر آئے۔ وہ "اپ ٹوڈیٹ" تو نظر آیا لیکن اس کی شخصیت سے وہ لوچ رخصت ہوگیا جو داستان گو میں ہونا چاہیے اب بازی گر معلوم ہوتا تھا۔ اگر داستان گو شیروانی یا صرف کُرتا پہنے ہوتا تو اس کی شخصیت داستان کا جُزو بن جاتی۔

داستان ختم ہونے کے بعد مَیں سوچنے لگا کہ اگر داستان ان کمزوریوں سے خالی ہوتی، اگر اس کا ساز و سامان زرا بہتر ہوتا۔ ساتھ کے گانے والے بھی اچھے ہوتے تب داستان کیسا اثر کرتی۔ اس میں زرا شک نہیں کہ وہ اب سے سو گنا زیادہ اثر کرتی۔ محفل کے بعد داستان دماغ میں گونجتی رہتی پھر زندگی بھر موقع موقع پر یاد آتی۔ اکثر صحبتوں میں اس کے ٹکڑے بیان ہوتے۔ اور جو اثر داستان سے مرتّب ہوا تھا وہ خیالات پر اور خیالات سے پھر عمل پر اثر انداز ہوتا رہتا۔ مختصر یہ کہ داستان وہی کام کرتی جو کوئی عمدہ ناول، نظم یا ڈراما کر سکتا ہے۔
داستان گوئی دراصل ایک ایسا فن ہے جس کی مستقل حیثیت ہے۔ سینما نے رنگین پردوں والے تھیٹر کو ختم

کردیا، لیکن اصل تھیٹر اب زندہ ہورہا ہو اور زندہ ہوکر رہے گا۔ کیوں کہ تھیٹر کے آرٹ کے عناصر سنیما سے مختلف ہیں۔ اسی طرح سنیما اور تھیٹر کے ہوتے ہوئے ریڈیائی ڈرامے زندہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ داستان گوئی ختم ہوجائے اور آگے ترقّی نہ کرسکے۔

اگر آج کوئی جرمنی یا جاپان کی جنگ کا چشم دید حال بیان کرنے لگتا ہو تو ہم کتابیں اخبار اور فلمیں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ شخص اپنے ذاتی تاثرات بیان کرتا ہو جو ہمیشہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ یہی حیثیت داستان گو کی ہو۔ وہ ایک عمدہ ناول بیان کرتا ہو، یا کسی جنگ کے حالات بیان کرتا ہو، ان میں واقعیت بھی ہوتی ہو اور ساتھ ساتھ داستان گو کے ذاتی تاثرات بھی۔

اگر آج اچھے داستان گو کا وجود ہوتا تو وہ رپوٹروں کی رپوٹیں اور سیاحوں کے چشم دید حالات سُن کر اگر بیان کرتا تو ان لوگوں سے بہتر بیان کرتا کیوں کہ ان کی باتیں سُننے کے بعد وہ ان کی جذباتی اور تجرباتی گہرائی محسوس کرلیتا اور چوں کہ اس کے مزاج میں ادبیت ان لوگوں سے زیادہ ہو، اس لیے اس کا بیان بہتر ہوتا۔

داستان گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہو کہ داستان گو میں اور سُننے والوں میں ایک قریبی رشتہ قائم ہوجاتا ہو۔ اس رشتے میں نہ مشین کا واسطہ ہوتا ہو اور نہ رسمی تکلفات کا۔ یہ نعمت ریڈیو اور سنیما میں تو قطعی نہیں ہوتی تھیٹر میں ہوتی ہو، مگر وہاں رسمی تکلّفات کا ایک قدرتی حجاب حائل ہوتا ہو۔ گویا ہم میں اور اسٹیج پر چلنے پھرنے والوں کے درمیان میں تکلّفات کی وہ دوری ہوتی ہو گویا سمندر حائل ہیں۔ لیکن داستان گو تماشائیوں سے گھُل مِل کر بات چیت کرتا ہو۔ تماشائی اس سے بے تکلّف ہوجاتے ہیں۔ اس رشتے سے دونوں ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں داستان گو اپنی داستان کا رُخ تماشائیوں کے ذوق کو دیکھ کر گھُماتا رہتا ہو۔

داستان سُن کر مجھے وہ دِن دیکھنے کی آرزو پیدا ہوگئی ہو جب، جس طرح آج مشاعرے ہوتے ہیں اسی طرح داستان گوئی کی محفلیں منعقد ہوں۔ جہاں سنجیدہ، زندگی کے مسائل سے تعلق رکھنے والی داستانیں بیان ہوں اگر کوئی بحث آجائے تو کچھ اس پر بھی روشنی پڑجائے۔ جیسا کہ ناولوں میں ہوتا ہو۔ جب اس فن میں ایسے جمالیاتی عناصر موجود ہیں جو اسی حالت میں ناول، اسٹیج، اسکرین اور ریڈیو میں نہیں پائے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہو کہ یہ فن گم نامی میں پڑکر مرجائے۔

داستان گوئی اور اُردو

مذکورہ بالا داستان گو ضلع فیض آباد کا رہنے والا ہو۔ بیس سال سے یہ پیشہ کر رہا ہو۔ ہندستان میں برابر گھومتا رہتا ہو۔ دُور دراز مقاموں پر جاتا ہو۔ اس کی صحبت میں ہندو اور مسلمان سب شریک ہوتے ہیں۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہو کہ سب میری داستان سے لطف اندوز ہوں۔ خوش ہونے کی جگہ خوش ہوں۔ رنجیدہ ہونے کی جگہ رنجیدہ ہوں۔ اس لیے اس کو ایسی زبان بولنا پڑتی ہو جو ہر شخص سمجھ لے۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ اور وہ بولتا بھی ایسی ہی زبان ہو۔ یعنی آسان اُردو۔



جوامع الحکایات

محمد عوفی کی مشہور فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ از مسٹر اختر شیرانی۔ ان حکایات سے قرونِ وسطیٰ کی اسلامی حکومتوں اور دیگر مشرقی ملکوں کے تمدنی اور تاریخی حالات کا دلچسپ مواد ملتا ہو۔ اصل کتاب تقریباً ناپید تھی، اب اُردو میں اس کا ترجمہ انجمن نے شائع کرکے ایک اہم ادبی کوشش کو زندہ کیا ہو۔ قیمت جلد اوّل مجلّد ۳؎ غیر مجلّد عہ، حصّہ دوم مجلّد للعہ، غیر مجلّد سے،

الف لیلہ

مشہور عالم عربی داستان الف لیلہ و لیلہ کا ترجمہ دُنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہوچکا ہو مگر اُردو کا ترجمہ براہِ راست عربی سے کوئی موجود نہ تھا۔ مروجہ تراجم انگریزی تراجم کے توسط سے اُردو میں آئے تھے۔ انجمن نے اصل عربی سے ترجمہ کرا کے شائع کیا ہو۔ پروفیسر منصور احمد مرحوم نے ترجمے میں بڑی کاوش کی ہو مگر افسوس ہو کہ وہ اس کی صرف پہلی دو جلدوں کی اشاعت دیکھ سکے۔ اب اس کی چوتھی جلد شائع ہوئی ہو اور بقیہ دو جلدیں بھی عنقریب شائع ہوں گی۔ قیمت جلد اوّل مجلّد ۳؎ غیر مجلّد سے، جلد دوم مجلّد ۳؎ غیر مجلّد سے، جلد سوم مجلّد صہ، غیر مجلّد للعہ، جلد چہارم مجلّد صہ، غیر مجلّد للعہ۔

منیجر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی



تبصرے

ادبیات

عالمِ آشوب | جناب سیماب اکبرآبادی کی رباعیات کا تازہ مجموعہ جس میں "نفسیات جنگ عالم گیر اور واقعاتِ دورِ حاضرہ پر، تین سو سے زیادہ اشاراتی اور تاریخی رباعیاں" چھوٹی تقطیع کے ۴۲۸ صفحات پر، منقش گرد پوش میں مجلد شائع کی گئی ہیں۔ ہر صفحے میں سُرخ جدول اور بیل کے اندر ایک ایک رباعی بہت صاف و خوش خط چھپی ہے۔ کاغذ بھی عام نایابی کے باوجود اچھا لگایا گیا ہے۔ شروع میں سیماب صاحب کی عکسی تصویر زیبِ کتاب ہے اس تمام اہتمام کے باوصف قیمت سوا تین رُپے بہت ارزاں، بلکہ نفع خور ناشرین کے واسطے تنبیہ آمیز مثال کہی جاسکتی ہے۔

رباعیوں کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں:۔

(۱)　معمورِ غرض دین بھی ہے دُنیا بھی　　معمول ریا و مکر ہے، دھوکا بھی
انسان ہی خطرے میں نہیں ہے اس وقت　　خطرے میں ہے انسانیتِ کُبرا بھی

---

(۲)　دُنیا کا یہ دورِ انقلاباتی ہے　　ہر چیز فنا ہوئی چلی جاتی ہے
آتے ہیں جو مغرب سے ہَوا کے جھونکے　　جلتے ہوئے خوں کی چراند آتی ہے

ص ۳۶۷　ہاں جرمنی زور باندھ سکتا ہے ضرور　　ہر ذرہ جو مٹتا ہے چمکتا ہے ضرور
ہٹلر کا ہر اشتعال بامعنی ہے　　بجھتا ہے چراغ تو بھڑکتا ہے ضرور

اسی طرح برطانیہ اور اتحادیوں کی فتح اور جاپان کی بھی آخر میں شکست کی پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ آخری رباعی یہ ہے ؎

انسان بنا تھا عیش و عشرت کے لیے — اور اب محتاج ہو مسرت کے لیے
یہ چاند یہ سورج یہ زماں اور مکاں — سب اس کے لیے ہیں جنگ و غارت کے لیے

ہندستان کے اہم واقعات اور نئی تحریکات پر بھی اپنے خاص طرز میں سیماب صاحب نے راے زنی کی ہو اور مجموعی طور پر یہ رباعیاں خاصی تاریخی دل چسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ اگر ذیلی حواشی میں فوائد یا تصریحات کا بھی اضافہ کردیا جائے تو غالبًا اور مفید ہوگا۔

سیماب صاحب کی شاعری میں کوئی خاص جدت اور زور نہ سہی، ان کے اعتدال میں ضرور متانت و پختگی آگئی ہو۔ اور زبان کی خدمت وہ جیسے استقلال و انہماک سے انجام دیتے رہے ہیں، اس نے اب احسان کا مرتبہ اختیار کرلیا ہو۔ (س۔ ہ)

لہو ترنگ یہ اصطلاح حضرت اقبالؒ کی رنگین ایجادوں سے ہو: ؎

خونِ دل و جگر سے ہو سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہو غافل، نہ جل ترنگ!

دکن کے ایک نوجوان شاعر، سکندر علی صاحب وجد نے اسی کو اپنے ہزار شعر کے مجموعے کی سرخی بنایا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں ؎

کلام، تختۂ گُل ہاے رنگ رنگ بنا
ہزار شعر سے سازِ لہو ترنگ بنا

اسی نام کی مناسبت سے جلد اور گرد پوش کو ارغوانی رنگ دیا اور ایک جست کرتے ہوے، مست ہرن کی (سفید) تصویر بنوائی ہو جس میں خونِ گرم کی جست و خیز کا اشارہ ہو۔

مجموعے میں اقبال کی حکیمانہ شاعری کے اثرات جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ سب سے اچھی نظموں میں ایک وہ ہو جس میں شاعرِ اسلام کو عقیدت کا خراج ادا کیا گیا ہو (ص ۳۹)۔ خودی، خدامست وغیرہ بعض الفاظ جن کو اقبال نے اپنی ٹکسال میں ڈھالا اور نئی قدر و قیمت دے کر چلایا، وجد صاحب کے ہاں سکۂ رائج کی طرح استعمال ہوے ہیں۔ "بانگِ درا" کی تقلید میں ان کی کتاب کا آغاز بھی "دُعا" سے ہوتا ہو۔ اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں ؎

ادجِ قبول ای مرے بندہ نواز دے
میری نوا میں گرمیٔ آہن گداز دے
طرزِ کہن سے سرد ہوئی محفلِ ادب
سازِ سخن کو نغمۂ جدت طراز دے

اقبال کے ترانۂ وطن کی لَے میں ہی وجد صاحب نے ترانۂ دکن گایا ہے جس کی ٹیپ ہے : ؎

یہ ہے دکن ہمارا، پیارا وطن ہمارا

لیکن ان کی اقبال پسندی کی سب سے صالح دلیل اُن کی رجائیت، غیرت مندی اور جدّوجہد کی تعلیم ہے۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں : ؎

وقت کی آواز

ای مردِ خدا اُٹھ، ہے یہ ہنگامِ تگ و تاز　　　جنگاہ کی بُنیاد ہلا دے تری آواز
اس معرکۂ سخت میں تقلیدِ جنوں کر　　　بھٹکائے نہ تجھ کو خردِ تفرقہ پرداز
بےکار نہ جائے گی تری شعلہ نوائی　　　تدبیر سے ہوجائیں گے تقدیر کے در باز

. . . .　　　. . . . .

یہ کام نہیں لشکر و شمشیر و سناں کا　　　ہمت ہے جہاں گیر، جہاں سوز، جہاں ساز
مِٹ جائے گی وہ قوم جو بیدار نہ ہوگی
کٹ جائے گا، جس ہاتھ میں تلوار نہ ہوگی

نہ کر

بَلا سے جان چلی جائے عرضِ حال نہ کر　　　بہ جز خدا کے درِ غیر پر سوال نہ کر
تری حیات کا حسنِ عمل ہے پیمانہ　　　فقط شمارِ شب و روز و ماہ و سال نہ کر

. . . .　　　. . . . .

دلیلِ بے ہُنری ہے شکایتِ دُنیا　　　کسی سے شکوۂ ناقدریٔ کمال نہ کر

وجد صاحب کی شاعری میں جدید اشتراکی یا انقلابی خیالات کی جھلک بھی نظر آتی ہی۔ لیکن اس افراط و شدّت کے ساتھ نہیں، جس نے اہلِ ذوق کو "ترقی پسند" اور "ادبِ لطیف" کے ناموں تک سے بے مزا کردیا ہی۔ ذہانت و طبّاعی میں کم نہ ہونے کے باوصف، زبان اور خیال کے اعتدال میں وہ اکثر ہم چشموں سے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ ان کی آیندہ ترقی کے حق میں سب سے اچھی فال ہی۔ مجموعے میں کہیں کہیں نومشقی کی لغزشیں پائی جاتی ہیں، جیسے:

سمندر جیسے ہنستا ہی حقارت سے جبالوں پر (ص۵۹)

جبل کی جمع الجمع بہ قاعدۂ ہندی بنائی ہی۔

ایک ہی انجام ہی کم زور اور شہ زور کا
پیس کر دونو کو رکھ دیتا ہی کونا گور کا (ص۲۲)

اس شعر میں گور کے کونے سے پیسنے کا کام لیا ہی۔

اجنتا کی تعریف میں لکھتے ہیں:

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہی (ص۳۷)

شیریں مقالی کا رائج و پُرسکوں ہونا، جمع ضدّین نہ سہی بے لطف تصنّع ضرور ہی۔

لیکن ایسے خفیف اسقام خال خال اور نظرانداز کرنے کے قابل ہیں۔ لائق مصنّف نظرِثانی کے وقت آسانی سے انھیں دور کرسکتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ۴۰، ۵۰ غزلیں ہیں۔ یہ بھی حالی و اقبال کے جدید رنگ میں شاعر کے پاکیزہ مذاق کی گواہ ہیں۔ سرسری نظر میں چند اچھے شعر سامنے آئے، وہ ہدیۂ ناظرین ہیں:

حریمِ شوق میں کچھ دِل پہ انحصار نہیں — یہ وہ مقام ہی خود حُسن کو قرار نہیں
کِھلائے غنچۂ گُل، غنچہ ہائے دِل نہ کِھلے — نسیم واقفِ طرزِ خرامِ یار نہیں
کمالِ حُسن ہی اس کا شباب کیا کہنا — جسے خود اپنی اداؤں پہ اختیار نہیں

تھوڑی سی خودی سے گرلے کام یہ دیوانہ — خود شمع پھرے آکر گردِ پرِ پروانہ

کس بند کی حسرت نے مے جام سے چھلکا دی　　کیوں دستِ حنائی میں تڑپا خطِ پیمانہ
بیمار نے رازِ دل سب نزع میں کہہ ڈالا　　تھی موت کی ایک ہچکی کُل عمر کا افسانہ

کتاب ایسی خوش خط اور صاف چھپی ہے کہ حیدرآباد کے مطابع شمالی ہند کے نامی چھاپے خانوں کی مطبوعات سے اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ جنگ میں اچھا کاغذ اُڑ گیا، پھر بھی یہ اتنا دبیز اور چکنا ہے کہ اہلِ تصنیف کو رشک پیدا ہوگا۔ شاید اسی اہتمام کے عوض دس جُز کے مختصر مجموعے کی قیمت، قسمِ اوّل ۶ے، اور قسمِ دوم ۳ے، رکھی گئی ہے۔ کتاب خانہ انجمنِ ترقیٔ اردو، عابد روڈ، حیدرآباد دکن سے طلب کی جائے۔　　(س۔ ہ)

روسی ظرافت از مسلم ضیائی صاحب، اردو محل، معظم جاہی حیدرآباد دکن۔ صفحات ۱۰۵، قیمت عہ،

مسلم ضیائی صاحب نے اس مجموعے میں بعض مشہور روسی مزاحیہ نگاروں کے عمدہ نمونے ترجمہ کرکے درج کردیے ہیں جس سے روسی مزاح نگاری کے معیار اور اسلوب کا اندازہ ہوسکتا ہے اور اس سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ اَن مِل بے جوڑ باتوں کو مِلانے سے جس طرح اور ملکوں میں لوگ ہنستے ہیں اُسی طرح روس میں بھی، لیکن روس نے اس میں ایک قدم اور آگے بڑھا کر بالکل مجنونانہ اور مخبوط الحواسی کی گفتگو کو ذریعۂ تفریح بنایا، اور اس طرزِ تحریر کے بعض بہت ہی مقبول و معروف مصنّف پیدا کیے۔ ایسا اندازِ گفتگو جس میں جنون کا شائبہ پایا جاتا ہو ہنسنے کی جگہ ہم دردی کرنے اور اظہارِ تاسّف کرنے کا موقع بہم پہنچاتا ہے لیکن روس میں گوگول، نکولائی اس پنسکی، گوربونوف جیسے مصنّفین نے اسی اندازِ تحریر سے روس میں شہرت و مقبولیتِ عام حاصل کی جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ زار کے دورِ استبداد میں کسی شعبۂ حکومت پر سنجیدہ اعتراض دار و رسن کا مستحق بناتا تھا اس لیے جلے دِل کے پھپھولے جنون کا جامہ پہن کر پھوڑے جاتے تھے، اور متذکرہ مصنّفین کی تحریروں میں ایسے اشارات کافی نظر آتے ہیں۔ خصوصاً گوگول کی تحریروں میں جو مجنوں بن کر استبداد کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا تھا۔ روسی مزاح نگاری کے کئی نمونے اس کتاب میں اور پہلوؤں سے بھی دِل چسپ ہیں اور سچ دِرن کا "عقاب"، گوربونوف کا "تھانے میں" اور اسٹپ نیاک کا "پیسہ اور کسان" مزاح کے پردے میں اصلاح کی تحریک کے علَم بردار ہیں اور موجودہ قدر

سے نفرت دلانے والے ہیں۔ طباعت وغیرہ اچھی ہے۔ (ر۔ع۔ہ)

زرد چہرے از ابراہیم جلیس، اُردو محل، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن، صفحات ۱۹۵. قیمت عہ/ ابراہیم جلیس کے پندرہ مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ جس کا مقدمہ قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے، تین عنوانوں کے ماتحت تقسیم ہے یعنی دعوا، تضاد، اور ترکیب۔ ان افسانوں میں سفید پوش غریب طبقے کے جذبات، احساسات اور تفکرات تحلیل تجربہ اور ترکیب کے نفسیاتی اعتبار سے نمایاں کیا گیا ہے جو موجودہ معاشی حالات پر تیر ونشتر کے طنز بن کر حملہ کرتے ہیں، اور پڑھے لکھے طبقۂ اوسط کے لوگوں کی اقتصادی آشفتہ حالی کا مرثیہ دردناک اشارات میں سُناتے ہیں۔ ہر افسانے میں زندگی کے ایک نئے کردار کو پیش کیا گیا ہے اور چوں کہ کرداروں کی تعداد بے شمار ہے اس لیے ایسی افسانہ نویسی کا میدان بھی بہت ہی وسیع ہے، بہ شرطےکہ کسی شخص میں کردار کا خاکہ مناسب الفاظ میں پیش کرنے کا سلیقہ ہو۔ زیر نظر افسانوں میں اس سلیقے کا بڑی حد تک اظہار ہوتا ہے اور امید ہے کہ یہ شوق سے پڑھے جائیں گے۔ (ر۔ع۔ہ)

تاریخ و سیاسیات

دکن کی سیاسی تاریخ "مصنفہ" مولانا سید ابوالاعلا صاحب مودودی۔ شائع کردہ دارالاشاعت سیاسیہ۔ اُردو گلی۔ حیدرآباد دکن۔

اصل میں یہ کتاب نواب نظام الملک آصف جاہِ اول بانیٔ خاندانِ آصفیہ کے حالات میں لکھی گئی ہے۔ پہلے باب میں جو بہت مختصر ہے، ان کے خاندان کا تذکرہ ہے۔ دوسرے کا عنوان ہے "عالم گیر کی وفات کے بعد" جس میں سلطنتِ مغلیہ کے اِس دوَر کی تاریخ، محمد شاہ بادشاہ کے زمانے تک، دُہرائی گئی ہے۔ یہی کتاب کا سب سے طولانی حصہ ہے۔ آخری باب میں نواب نظام الملک کے دکن پر تسلط، اور دہلی کی وزارت کے حالات ہیں اور نادرشاہ کے دہلی پر حملے کے ساتھ یہ "دکن کی تاریخ" ختم ہوجاتی ہے۔ اگرچہ بہ طورِ ضمیمہ آصف جاہی مملکت کا ایک نقشہ اور اس کی جغرافی نیز مال گزاری وغیرہ کی کیفیت شامل کردی گئی ہے۔

اس چھوٹی تقطیع کی کل تین سو صفحات کی کتاب کی نسبت ناشر صاحب لکھتے ہیں کہ "اب تک

دکن کی سیاسی تاریخ پر کوئی ایسی وسیع کتاب لکھی نہیں گئی ہے جس میں حوادث و واقعات کا اس طرح استقصا کیا گیا ہو۔" یہ نہایت بے مزہ مبالغہ ہے جسے پڑھ کر پنجاب کے بعض دوافروشوں کے اشتہار یاد آتے ہیں۔ لائق ناشر سے ہماری درخواست ہے کہ علمی کتابوں کے باب میں اشتہار دیتے وقت بھی اپنی ذمے داری کا احساس فرمایا کریں۔ اوّل تو کتاب کا نام ہی سخت غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ "عرضِ ناشر" ناظرین کی مزید مایوسی کا موجب ہوگی۔ گزشتہ تاریخ کے لیے تصنیف کا لفظ لکھنا، خواہ جنابِ "مصنف" نے اسے پسند کیا ہو یا وہ حضرتِ ناشر کی تصنیف ہو، درست نہیں۔ کتاب اپنے محدود موضوع کی حد تک خاصی دلچسپ ہے اور اس کی تالیف میں متداول تاریخوں کے علاوہ چار پانچ مخطوطات سے بھی مدد لی گئی ہے جو حیدرآباد کے سرکاری کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ اس میں ابوالفیض کی مثنوی فتوحاتِ آصفی کے بعض اشعار کے سوا اور کوئی تاریخی تفصیل یا نئی بات ایسی نہیں نظر آئی جو عام درسی یا دکن کی مروجہ تاریخوں میں موجود نہ ہو۔ ضخامت تین سو صفحے۔ چھوٹی تقطیع۔ لکھائی چھپائی معمولی۔ مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت قسمِ اوّل ۳ قسم دوم ۲ تحریر ہے۔

(س - ہ)

سوشلزم ہی کیوں؟ راہل سانکرتیاین کی ہندی کتاب کا ترجمہ از طفیل احمد خاں صاحب بی اے، کتاب محل، زیرو روڈ، الہ آباد، صفحات ۱۰۴۔ قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب راہل سانکرتیاین کی ایک ہندی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دُنیا کے مصائب اور عوام کی اقتصادی زبوں حالی کا علاج اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف کمیونزم کے اصول سے ہوسکتا ہے۔ عنوانِ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دُنیا کے تمام اقتصادی نظاموں اور معاشی نظریات کا مقابلہ کرکے کمیونزم کے نظریے کی فوقیت ثابت کی گئی ہے لیکن دراصل مقابلہ صرف سرمایہ داری کے نظام سے کیا گیا ہے اور دیگر نظریات کا محض ضمناً ذکر آگیا ہے۔ مثال کے طور پر فاضل مصنف نے اگر دُنیا کی اقتصادی بدحالی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کے مسئلے پر ذرا زیادہ وسعتِ نظر سے غور کیا ہوتا تو انھیں معلوم ہوتا کہ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان ایک اسلامی اقتصادی نظام بھی ہے جو کمیونزم کی تمام خوبیوں کو رکھتے ہوئے بھی اُن نقائص سے پاک ہے جن کی وجہ سے کمیونزم کا نظریہ قبولِ عام نہیں حاصل کر پاتا۔ اور جس میں ذاتی

ملکیت کے اصول کو قائم رکھتے ہوئے اس ملکیت کا مصرف ایسا بتایا گیا ہو جو دولت کی مساوی نہیں بلکہ متناسب تقسیم ہوجاتی ہو۔ اور یہ نظام افلاطون کے نظریۂ سیاست کی طرح محض خیالی نہیں ہو بلکہ چالیس سال کے عمل میں اپنی معقولیت اور افادیت ثابت بھی کرچکا ہو۔ اس بنیادی نقص کے ماسوا کتاب میں کمیونزم کے نظریے کی تشریح دِل چسپ ہو اور اس مسئلے سے دِل چسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (ر۔ع۔ ہ)

زندہ رُوس کتاب خانہ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، ۱۶۰ صفحات قیمت درج نہیں۔

روس کے موجودہ جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ ہوجانے کی وجہ سے اتحادی ممالک اور اتحادی مقبوضات میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ لٹریچر کی اشاعت کا جو دروازہ کھُل گیا ہو، اُس کی وجہ سے روس کے متعلق بہ کثرت کتابیں، رسالے اور اخبارات میں مضامین شائع ہورہے ہیں چناں چہ اُردو میں بھی کافی ذخیرہ ایسے لٹریچر کا جمع ہورہا ہو، جس میں کافی حصّہ پروپگنڈے کا بھی ہو لیکن کتاب زیرِ نظر محض پروپگنڈا نہیں ہو بلکہ بعض مفید معلومات بھی اس میں ہیں۔ کتاب دراصل مختلف مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہو جن میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہو کہ باوجود جنگ کی ہول ناکیوں کے سوویٹ روس کی علمی، اور دیگر تمدّنی سرگرمیاں جاری ہیں اور خاص کر علمی تحقیق و تالیف و تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہو اور قدیم مسوّدات کی نظرِ ثانی اور اشاعت کا کام بھی ہورہا ہو۔ خاص کر مشرقی علوم و فنون کے متعلق روسی علما برابر اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ سیّد سجّاد ظہیر کا مضمون "دورانِ جنگ میں روسی ادب" جو اس کتاب کا پہلا باب ہو یہ ظاہر کرتا ہو کہ گو اس دَور کے جدید ادب پر جنگ کے اثرات و تاثرات غالب ہیں، تاہم آثارِ قدیمہ کی دیکھ بھال اور قدیم علمی نسخوں کی چھان بین اور اشاعت میں جنگ کی وجہ سے کوئی کمی نہیں ہوئی ہو۔ اسی طرح دیگر مضامین میں فنونِ لطیفہ اور خاص کر فنِ مصوّری و نقاشی میں ماہرینِ فن نے جو کارنامے کیے ہیں وہ دکھائے گئے ہیں۔ اور بعض مضامین اشتراکی مقاصد و نقطۂ نظر کی تشریح پر ہیں اور روسی ادب کے بعض عالیہ شاہکاروں کے اُردو ترجمے نظم و نثر میں دیے گئے ہیں۔ اس طرح کتاب کو دِل چسپ اور مفید بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہو۔ (ر۔ع۔ ہ)

اہلیا بائی از محمد الدین فوقؔ، بیرون شیراں والہ دروازہ لاہور، ۵۲ صفحات قیمت ۴؍

یہ کتاب جو اندور کی شہرہ آفاق مہارانی اہلیا بائی کے حالات پر مشتمل ہے اور جو لوگ اپنے بچوں کو ناموران ہند کے مختصر حالات پڑھانا چاہتے ہوں ان کے لیے مفید ہے۔ اہلیا بائی ہندستانی تاریخ کی اُن ممتاز خواتین میں شمار ہوتی ہے جن کے تدبّر اور نیک دِلی کا آج تک چرچا ہے۔ جس زمانے میں مغلیہ حکومت کا اقتدار زوال پذیر ہو رہا ہے اور مرہٹوں کی قوم احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے مجروح ہو چکی ہے اُس وقت اہلیہ بائی سندھیا خاندان کی راج کماری تھی اور ہولکر خاندان میں بیاہی گئی تھی' اپنے شوہر اور لڑکے کی وفات پر ہولکر راج کی گدّی پر زینت افروز ہوئی اور ۲۷ سال تک حکومت کرتی رہی۔ اس کے تعمیر کرائے ہوئے مندر ہندستان بھر کی مختلف تیرتھ گاہوں میں بکثرت ملتے ہیں جس سے اس کی مذہبیت کا پتا چلتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنی غیر ہندو رعایا کے ساتھ بھی داد و دہش اور حُسنِ سلوک میں کمی نہیں کرتی تھی چناں چہ عید کا دربار، شب برات کی نیاز اور محرّم کے تعزیے اور مجلسیں اس کے زمانے میں سرکاری اہتمام سے ہوتی تھیں اور ان مذہبی رسوم میں وہ ذاتی طور پر دِل چسپی لیتی تھی۔ بہرحال اس نامور مرہٹہ مہارانی کے حالاتِ زندگی پڑھنے کے قابل ہیں۔ (ر۔ع۔ ف)

اسلام کے چند معاشی نظریے

از مولوی محمد یوسف الدّین صاحب ایم اے (عثمانیہ) سلسلہ مطبوعات انجمن طیلسانین عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۶۰ صفحے قیمت ۸؍

مولوی محمد یوسف الدّین صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں عِلمی تحقیق کے ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہے جس کی حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے سخت ضرورت تھی۔ اسلام کا معاشی قانون اعلاترین مانا جاتا ہے مگر یہ قانون ہے کیا اور اس کی سند کلامِ الٰہی اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں کس حد تک مِلتی ہے؟ یہ اس کتاب کا اصل مبحث ہے اور اس میں فاضل مصنّف نے نہایت ہی محنت و کاوش سے وہ واضح اشارات جمع کیے ہیں جن سے ایک منظّم معاشی قانون کی اسلامی تعلیمات کی رَوشنی میں تدوین ہوسکتی ہے انسان کا محنت و مشقّت میں پیدا ہونا اور آرزوؤں کے ایک بے پناہ سیلاب کے ساتھ دُنیا میں آنا۔ پھر کائنات کی تمام مخلوقات کو اس کا تابع بنانا۔ محض زمین اور آسمان ہی نہیں بلکہ ان کے مابین جو کچھ ہے، خلا، فضا، برقی قوّت وغیرہ سب پر اسے تسلّط دینا فطرت کے اس منشا کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان ان قوّتوں سے کام لینے کے طریقے دریافت کرے اور ان کا مناسب استعمال کرے۔ اور پھر اصلی عامل قوّت

خلاق عالم کی ذاتِ واحد کو قرار دے کر ان قوتوں کے بے جا استعمال پر ایک روک لگا دی گئی ہو یہی اسلام کے معاشی نظام کی بنیادیں ہیں اور پھر ان پر مختلف زندگی کے شعبوں کے لیے معاشی قوانین کی بنیاد رکھی گئی ہو جس کے واضح اشارات بھی قرآنِ کریم اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں جنھیں اس قابلِ قدر کتاب میں جمع کردیا گیا ہو۔ چناں چہ اکتسابِ دولت کے مختلف طریقے زراعت، تجارت، مواصلات، حمل ونقل، صنعت وحرفت، کان کنی، شکار وغیرہ کی تحریکات صاف صاف قرآنِ پاک میں پائی جاتی ہیں اور محنت وتنظیم کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہو کہ ان آیات کی معنویت پر غور کرکے ان کے منشاے اصلی کو سمجھا جائے اور اُس پر عمل کیا جائے۔

اس وقت دُنیا میں کئی معاشی نظریات زیرِ تجربہ ہیں جس میں سویٹ روس کا اشتراکی نظام خاص اہمیت رکھتا ہو اور اس وقت دُنیا کی سیاسیات میں پیش پیش ہو۔ لیکن یہ نظریہ ابھی تجربے کی منزل میں ہو اور آخری نتائج معلوم نہیں ہیں۔ برعکس اس کے اسلام کا معاشی نظریہ تاریخ کے امتحانات اور آزمایشوں سے کام یابی کے ساتھ گزرچکا ہو اور اگر ہم خلافتِ راشدہ کے دوَر پر سرسری نظر ڈالیں جب کہ حکومت اور معاشرت کے نظام میں وہی روح جلوہ گر تھی جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی، تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ اسلامی معاشی نظریے نے واقعی وہ مقصد حاصل کیا جو کسی معاشی نظام کا اعلاترین نصب العین ہوسکتا ہو یعنی ایک جماعت کے افراد میں دولت کی ایسی منصفانہ تقسیم کہ کسی کو دوسرے کے سامنے دستِ حاجت دراز کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس نظام کی کام یابی کا اصل راز یہ تھا کہ اس میں دولت کے بہاؤ کا رُخ اُمرا سے غربا کی جانب رکھا گیا تھا برعکس اس کے ملوکی نظامِ معاشی میں دولت کے بہاؤ کا رُخ غربا سے امرا کی طرف ہو جس سے عام لوگوں کی معاشی حالت دِن بہ دِن ابتر ہوتی جاتی ہو اور گو متموّل لوگوں کا تموّل غیر معمولی تیزی سے بڑھ رہا ہو، غربا کی روٹی کا سوال اُسی جگہ رہتا ہو یا اُس سے بھی ابتر جتنا کہ پہلے تھا۔

مولوی یوسف الدین کی اس مختصر تصنیف سے امید ہو کہ لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوگا کہ وہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول سمجھیں اور ان کی بنیاد پر اس زمانے کے حالات کے مناسب ایک نظام مرتب کریں

یہ کام تمام سیاسی مقاصد سے زیادہ اہم ہے اور ہمیں امید ہے کہ مصنف کی اس کوشش سے اس کی تحریک ہوگی۔ (ر-ع-ہ)

مقالاتِ جمال الدین افغانی مترجمہ سید مبارز الدین رفعت صاحب ایم اے (عثمانیہ) دارالاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن۔ قیمت قسم اوّل ۸؍، قسم دوم ۱۲؍۔

سید جمال الدین افغانی انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلامی دُنیا کی ایک عظیم المرتبت ہستی تھے جن کے مقالات وخطبات نے سوتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور بھولی ہوئی مسلم اقوام کو راہِ فلاح کا نشان دیا۔ ان کی وحدتِ اسلامی کی تحریک کو پان اسلام ازم کہا جاتا ہے اور دُنیا کی غیر مسلم اقوام کو اس سے ڈرایا جاتا ہے۔ لیکن جمال الدین افغانی کوئی نئی بات نہیں کہ رہے تھے بلکہ مسلمانوں کو ایک بھولا ہوا سبق یاد دِلا رہے تھے اور اپنی پوری قوت انھیں ہوشیار کرنے اور ماضی و حال کا جائزہ لے کر مستقبل کا خاکہ بنانے پر آمادہ کرنے میں صرف کر رہے تھے۔ چناں چہ انھی کی مجاہدانہ کوششوں سے ملّتِ اسلامی کی نشاتِ ثانیہ کا آغاز ہوا، اور جہاں جہاں دُنیا میں مسلمان بستے تھے وہاں بیداری اور زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اس مجاہدِ اعظم کے حالات و اقوال سے اُردو داں پبلک کو روشناس کرانے کی ضرورت تھی چناں چہ قاضی عبدالغفار صاحب نے "آثارِ جمال الدین" لکھ کر اس کی ابتدا کی اور اب مولوی مبارز الدین رفعت صاحب نے ان کے مقالات کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔ ان مقالات میں مسلمانوں کے تمام دینی و دُنیوی معاملات پر نظر ڈالی گئی ہے، اور انھیں وحدتِ اسلامی کے عالم گیر پیام سے روشناس کرکے اُن جذبات و افکار کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلامی تعلیم کا اصل منشا ہیں۔ قاضی عبدالغفار صاحب کا ایک مقدمہ بھی زیبِ کتاب ہے اور آخر میں افغانی کا ایک منظوم فارسی خط بھی درج ہے جو انھوں نے شہنشاہِ ایران کو لکھا تھا اور جس میں ان کے وحدتِ اسلامی کے خیال کی مخالفت پر اظہارِ ناراضی کیا گیا ہے۔ اس منظوم مکتوب سے ان کی وطنیت ایران کی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نظم واقعی انھی کی ہے تو یہ امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایرانی نژاد ہونے کے باوجود 'افغانی' عرف کیوں اختیار کیا۔ بہرحال یہ خطبات بہت ہی پُرجوش اور سبق آموز ہیں اور خاص کر اُردو داں مسلمانوں کو اُن کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ (ر-ع-ہ)

"اصولِ تعلیم"

تعلیم کے نئے اصول | مصنفہ بشر صدیقی۔ صفحات ۱۷۲۔ سائز ۷" × ۴ ½"۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی معمولی غیر مجلد۔ قیمت و ملنے کا پتا نامعلوم۔

یہ کتاب چند مضامین کا مجموعہ ہو جو دیہاتی اور شہری اُردو اسکولوں کے مدرسین کے لیے، انھی کی ضرورتوں اور معیار کا خیال رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں بنیادی تعلیم کے (جو حرفت کی مدد سے دی جاتی ہو) مقاصد اور فوائد کی تشریح دل نشیں پیرایے میں کی گئی ہو۔ دوسرا حصہ "تاریخ کی تعلیم" پر ہو۔ یہ حصہ انگریزی کتابوں سے ماخوذ ہو۔ اگر مصنف اس کو مرتب کرتے وقت اپنے ان اصولوں کا خیال رکھتا جن کی اس نے بنیادی تعلیم کے سلسلے میں تائید کی ہو یعنی یہ کہ علم کو حرفت سے پیوست کیا جائے تو یہ حصہ زیادہ مضبوط ہو جاتا

کتاب کے تیسرے حصے میں مادری زبان کے طریقے پر بحث کی گئی ہو۔ حروفِ تہجی اور زبان کی ابتدائیات سکھانے پر کوئی بحث نہیں ہو۔ لیکن قواعد سکھانے، اور مادری زبان میں تاریخ سکھانے پر بحثیں ہیں۔ جن میں دو چار باتیں خاص طور پر مفید ہیں۔ اسی حصے میں ایک مضمون ہو "نظم کا سبق" اس میں ایک بہت ضروری بحث یعنی نظم کا جذبات سے متعلق ہونا تشنہ رہ گئی ہو۔ ایسی غلطی ایک جگہ اور ہو۔ ایک سیدھے سپاٹ مکالمے کو "ڈراما" کا نام دے دیا گیا ہو۔

کتاب کا تعارف احتشام علی صاحب پروفیسر گورمنٹ ٹریننگ کالج نے دو صفحے کا لکھا ہو۔ اس میں انھوں نے اپنے اڈنبرا کے استاد گروفرے ٹامس کی کتاب کا تعارف بھی کرا دیا ہو۔

مقدمہ عبدالغفور صاحب نے لکھا۔ یہ مقدمہ بجائے خود کتاب میں ایک بہت معقول اضافہ کرتا ہو اس مقدمے میں عبدالغفور صاحب لکھتے ہیں:۔

> "اگرچہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب مضامین کا گل دستہ ہو۔ مسلسل اور منظم خیاباں زار نہیں۔ لیکن مجھے اتنا کہنے میں دریغ نہیں کہ یہ کتاب ہمارے اساتذہ کے اس کثیر طبقے کی ضرورت کو ایک حد تک پورا کر رہی ہو جسے ہم اس پیشے کے عوام کہہ سکتے ہیں۔ یعنی دیسی مدرسوں کے استاد۔"

تبصرہ نگار کو اس رائے سے پورا اتفاق ہو۔

کتاب کی سجاوٹ اور ترتیب میں بعض دردناک خامیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً مصنف کا "شکریہ" عبدالغفور صاحب کے مقدمے کے سلسلے میں چھپ گیا ہے۔ (ح۔ا۔ا)

مذہب و اخلاق

تاریخ آئمۂ اثناعشر | مولفہ حافظ مولوی ولی الدین صاحب شفیق جون پوری۔ ۳۶ صفحات، قیمت ۳ر

یہ نہایت ہی مختصر کتاب خلفاے اربعہ اور آئمۂ اثناعشر کے مختصر حالات پر مشتمل ہے جس کی ابتدا حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے حالات سے کی گئی ہے، اور بچّوں کو پڑھانے میں کارآمد ہوگی۔ آئمۂ اثناعشر سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیعہ عقائد کے بموجب بارہ اماموں کے حالات سے متعلق ہوگی لیکن حالات اس میں سولہ بزرگانِ اسلام کے ہیں۔ اس لحاظ سے کتاب کا نام کچھ موزوں نہیں رہا۔ اور حالات بھی اس نہج کے دیے گئے ہیں جن سے زمانۂ حال کی ضروریات کی تشفّی نہیں ہوتی۔ بعض حالات ضعیف روایات پر بھی مبنی ہیں لہٰذا اور شروع سے آخر تک اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ ان حالات سے اصلی اسلامی اسپرٹ کو نمایاں کیا جائے۔ پھر طباعت وغیرہ کے لحاظ سے اس میں اتنی قدامت ہے کہ آج سے سو سال پیش تر کی لکھی ہوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ (ر۔ع۔ o)

رسولِ پاک کی صاحب زادیاں | مولفہ اعجاز الحق صاحب قدوسی، کتاب خانہ انجمنِ ترقّیِ اردو (ہند) عابد روڈ، حیدرآباد دکن۔ ۸۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ر ۶پائی۔

مسلمان بچیوں کے پڑھنے کے لیے مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں صاحب زادیوں کے حالاتِ زندگی صحیح روایات سے سلیس اردو زبان میں لکھے ہیں۔ اور اس لحاظ سے کہ ان اقربا سے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان کی پاک زندگی سے اثر لینے کا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا، ان کے حالاتِ زندگی بہت کچھ سبق آموز ہو سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان حالات پر اسلامی تاریخ کا لٹریچر بہت ہی تشنہ ہے اور جو لٹریچر ہے بھی وہ تاریخی سے زیادہ جذباتی حیثیت کا ہے۔ اس لیے قدوسی صاحب کو اس سے زیادہ مواد نہ مل سکا کہ وہ اسے ۸۰ صفحات کی مختصر ضخامت میں درج کر دیں۔ پھر بھی جو کچھ ہے وہ اس لحاظ سے اچھا ہے کہ اس میں غیر معتبر قصے کہانیوں سے حالات نہیں لیے گئے ہیں بلکہ صرف انھی چند حالات و واقعات پر اکتفا کی گئی ہے جو روایاتِ صحیحہ میں مل سکے۔ امید ہے کہ مسلمان بچیاں انھیں شوق سے پڑھیں گی۔ (ر۔ع۔ o)

متفرّقات

عثمانیین کے تراجم و تالیفات | خوش نما سرِورق اور چند تمہیدی مضامین کے ساتھ یہ ان کتابوں کی مختصر سی فہرست ہو جنھیں جامعۂ عثمانیہ کے لائق فرزندوں نے اب تک تصنیف یا ترجمہ کیا اور وہ انجمن طیلسانینِ عثمانیہ، کے کتب خانے میں جمع کی گئیں۔ ان میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں قسم کی کتابیں شامل ہیں لیکن بہ ظاہر وہ جو انجمن کے کتب خانے میں کسی وجہ سے داخل نہ ہو سکیں، اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔ مثلاً سودا پر شیخ چاند مرحوم کا فاضلانہ مقالہ جو ضخیم کتاب کی صورت میں انجمنِ ترقیِ اُردو نے شائع کیا ہو، فہرست میں نہیں پایا گیا۔ مرتبینِ فہرست اس کمی سے بے خبر نہیں ہیں اور ہمیں یقین ہو کہ آیندہ اشاعتوں میں وہ حتی الامکان اسے رفع کرنے میں کام یاب ہوں گے۔

فہرست، مصنّفین کے ابجد وار ناموں کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہو اور اس میں ان کی کُل تعداد ۲۶۹، اور ان کے قلم کی ۵۶۳ کتابیں یا مسوّدات کا نام درج ہو۔ ایک قلیل مدت میں جامعۂ عثمانیہ کے فاضلوں کا یہ کارنامہ کچھ کم قابلِ تحسین نہیں ہو۔ ہندستان کی کسی دُوسری جامعہ کے تعلیم یافتہ حضرات نے شاید پچاس برس میں بھی اپنی زبان کی ایسی علمی خدمت انجام نہ دی ہوگی۔ اور یہی امر بہ جاے خود جامعہ عثمانیہ کے اصولِ تعلیم کی فضیلت کا عمدہ ثبوت فراہم کرسکتا ہو۔ لکھنے والوں میں ہر مذہب و ملّت کے عثمانی طیلسانی موجود ہیں۔ مثلاً سدرشن راج، این پٹواری، کرشنا بائی وغیرہم نے خالص علمی مضامین پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ فہرست انجمنِ طیلسانین کے دفتر واقع باغِ عامّہ، حیدرآباد دکن، سے شائع ہوئی اور غالباً اسی پتے سے دست یاب ہوسکتی ہو۔

نئے رسالے

اُردو ضمیمہ (مدراس کرسچین کالج میگزین) | یہ مختصر ڈیڑھ جز کا رسالہ بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کی مثال ہو۔ کاغذ تو آج کل اچھی قسم کا ملتا نہیں۔ لتھو کی چھپائی بھی مدراس میں بہت معمولی ہوتی ہو۔ مگر چند مضمون جو اس اشاعت میں چھپے ہیں، قابلِ قدر ہیں۔ یہ زیادہ تر کرسچین کالج کے طلبہ کی تحریریں ہیں۔ مدراس جیسے دُور دست علاقے میں انشا پردازی کے ایسے نمونے دیکھ کر، زبانِ اُردو کے بہی خواہ مسرور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کاش کہ رسالے کا حجم کچھ زیادہ اور وہ سالانہ کی بہ جاے دو ماہہ یا سہ ماہہ ہوتا۔ قیمت درج نہیں۔ مذکورہ بالا کالج کے پتے سے مل سکے گا۔

اُردو

فہرستِ مضامین

جلد ۲۴ —————— سنہ ۱۹۴۴ء

ادب

تذکرہ و سوانح

تنقید

بہرۂ نظم

متفرقات

تبصرے

(اسامی کتب و رسائل جن پر تبصرہ کیا گیا)

ادب

تاریخ و سیر

سیاسیات ومعاشیات

متفرقات

نئے رسالے، سال نامے اور خاص نمبر

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ ع سے رسالۂ "سائنس" بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ رپے ششماہی دو رپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:—

معتمد مجلس ادارت رسالۂ "سائنس"

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:— رسالۂ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع) تک دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 25 April 1945 No. 2

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Delhi.